خیبر پختون خوا کے اُردو افسانے میں دیہی معاشرت کی عکاسی

مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی (اُردو)

مقالہ نگار:

اجمل خان

فیکلٹی آف لینگو یجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز، اسلام آباد

اکتوبر، ۲۰۲۰ء

مقالے کا دفاع اور منظوری کا فارم

زیرِ دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انھوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کار کردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگو یجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: خیبر پختون خوا کے اُردو افسانے میں دیہی معاشرت کی عکاسی.

پیش کار: اجمل خان رجسٹریشن نمبر:548-PhD/Urdu/S15

ڈاکٹر آف فلاسفی

شعبہ: اُردو زبان وادب

پروفیسر ڈاکٹر روبینہ شہناز ----------------------

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر ارشد محمود ----------------------

ڈین فیکلٹی آف لینگو یجز

میجر جنرل (ر) محمد جعفر ----------------------

ریکٹر

تاریخ ---------------

اقرارنامہ

میں، اجمل خان حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو نجز اسلام آباد کے پی ایچ۔ڈی سکالر کی حیثیت سے پروفیسر ڈاکٹر روبینہ شہناز کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کی حصول کے لئے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گا۔

اجمل خان

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو نجز، اسلام آباد

فہرست ابواب

TITLE: DEPICTION OF RURAL TRADITION IN URDU SHORT STORY OF KHYBER PAKHTUNKHWA.

ABSTRACT:

This study analyzes the causes of the different styles and productions of the given writers. It presents an evaluative study of the fictions of all those translators who depicted the reflections of the rusticity of Khyber Pakhtunkhwa in their translations. It employed a documentary analytical procedure and sorted out libraries and other modern sources for the collection of thematic data. It aims at exploring the rustic elements and their representations in the fiction genre of the selected writers in Khyber Pakhtunkhwa. It is significant because it covers the culture as a costume of any nation and society, which embraces all such as religion, beliefs, knowledge, moralities, traditions, art, customs, and conventions. It investigates about the rural culture and traditions of Khyber Pakhtunkhwa as an important subject of fiction the given writers. Eighty percent of our population resides far away from cities in the rural setups. Almost all the rural societies are agrobased, therefore, they are considered as the backbone of our economy. This is the reason that short story writers of this region have insightfully portrayed about natural beauty and rural environment. Other appealing aspects of nature like the flora and fauna, gushing rivers, spring, lakes byfaths, agricultural fields and pastures are celebrated to.The peasantry, their sorrows, love, affection, valor, ego, HUJRA culture, vengeance, romance and social problems have also been profusely highlighted in their writing. In short, every sphere of life is diligently depicted.Like other literary scholars, fiction writers of this region have chosen their themes and characters based on rural setups. With their distinctive approach and style, they have presented social issues to make aware and educate the readers. One of the aspects that is common between all of them is the presentation of rural setup .Almost every short story writer of this region is portrayed the beauty of nature in their stories-

اظہار تشکر

حمد و ثنا اس رب کریم کا اور درود و سلام اس کے محبوب پر جس نے اس ناچیز کو تحقیق کے خارزار میں قدم رکھنے کا حوصلہ اور کھٹن مراحل سے سرخروئی مرحمت فرمائی۔ مقام سجدہ ریزی ہے کہ راہ تحقیق کے دشوار مراحل طے کر کے مقالہ ہٰذا پایہ تکمیل کو پہنچا۔ تحقیقی ثقل کام کے بار گراں کو سہل بنانے کے لیے رب کائینات نے جن شخصیات کو میرے لیے بطور وسیلہ فراہم کیا ان سب کا شکریہ ادا کرنا مجھ پر واجب ہے۔ اس مقالے کی نگراں، شعبہ اردو کی سابق صدر پروفیسر ڈاکٹر روبینہ شہناز کا نہ صرف دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں بلکہ اس حقیقت کا اعتراف بھی کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر ان کی رہنمائی اور خاص شفقتیں شامل حال نہ ہوتیں تو یہ مقالہ موجودہ صورت میں پیش نہ ہو پاتا انھوں نے اپنی منصبی مصروفیات کے باوجود زیر نظر مقالے کی خامیاں دور کرنے وقتاً فوقتاً اصلاح کرنے کی زحمت گوارا فرمائی۔ ان کی قیمتی آرا اور مشوروں سے یہ مقالہ اپنی تکمیل کو پہنچا ان کی دلچسپی اور شفقت ہر وقت میرے لئے مشعل راہ رہی ہے۔

شعبہ اُردو نمل کے تمام اساتذہ بالخصوص ڈاکٹر نعیم مظہر، پروفیسر ڈاکٹر فوزیہ اسلم، ڈاکٹر شفیق انجم، ڈاکٹر صائمہ نذیر، ڈاکٹر رخشندہ مراد اور صدر نشین شعبہ اُردو ڈاکٹر عابد سیال کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں جنھوں نے قدمے سخنے میری راہنمائی کی۔

ہم جماعت ساتھیوں میں سید ذوالفقار حسین شاہ، شکور رافع، صائمہ نیاز، عفت فاطمہ، عائشہ خان جبکہ سینئیرز میں ڈاکٹر مشتاق عادل، ڈاکٹر عبدوالودود قریشی کا ممنون ہوں۔ اس مقالے میں بہت سخت مقامات آئے، جن میں سخت ترین یار جانی ڈاکٹر وحید اللہ کی رحلت کا تھا۔ مقالے کے بیشتر کام میں انھوں نے بھرپور معاونت کی لیکن دست اجل ایک روشن چراغ کو بجھانے میں کچھ زیادہ ہی عجلت پسند ثابت ہوا۔ ہنس مکھ اور سدا بہار شخصیت کے مالک، مشکل کی ہر گھڑی میں "میں ہوں نا" کے الفاظ دہرانے اور واقعتاً ثابت کرنے والے ڈاکٹر سید بادشاہ ملک کا شکریہ کبھی پہلے ادا کیا تھا نہ اب کروں گا کہ حساب دوستاں در دل۔ جناب ڈاکٹر امیر تراب، ڈاکٹر طاہر بوستان اور پروفیسر ڈاکٹر انور علی کا بے حد ممنون ہوں جنھوں نے نہ صرف علمی مباحث میں میری راہنمائی کی بلکہ مواد کے حصول میں بھی میرے دست بازو بنے۔

آخر میں کچھ ایسے افراد کا شکریہ جن کے حصے کا بہت سا وقت میں نے اپنے علمی مصروفیتوں میں گزارا۔ ظہور خان، امجد علی، پروفیسر محمد رفیق، چھوٹا سنان شاہ (ٹیپو) یہ وہ افراد ہیں جو میرے دل کے مکین ہیں۔ لیکن ان سارے کرم فرماؤں میں سب سے بڑا حوالہ عرصہ دراز سے بستر علالت پہ پڑی امّی جان کا ہے جن کی دعاؤں کے طفیل اس ناچیز کا قلم صفحہ قرطاس پر کوئی تحریر نقش کرنے کا اہل بنا ان کا شکریہ ادا کرنا میرے بس میں نہیں اور شاید میں ان کے شکریہ کا حق ادا

بھی نہیں کر سکتا۔ بڑے بھائی محمد فیاض کی برادرانہ شفقتیں ہیں جن کی بدولت مجھے یہ سعادت نصیب ہوئی کہ دو ایک لفظ لکھ سکوں۔ شکریہ بھائی جان۔ تمت بالخیر کہنے سے پہلے میں ایک بار پھر بارگاہِ الٰہی میں اپنے کم مائیگی اور تہی دامنی کا اعتراف کرتا ہوں۔ یہ سب تیرا کرم ہے آقا۔

اجمل خان

پی ایچ۔ڈی سکالر

نمل، اسلام آباد

باب اوّل:

موضوع تحقیق کا تعارف اور خیبر پختونخوا کی دیہی معاشرت

(الف) تمہید:

i۔ موضوع تحقیق کا تعارف:

افسانہ ادبیات عالم میں سب سے مقبول صنف حکایت ہے جو انگریزی ادبیات سے براہ راست اردو میں وارد ہوا ہے اور اردو ہی کے توسط سے ادبیات برصغیر پاک وہند کی دیگر زبانوں میں سرایت کر چکا ہے۔

خیبر پختونخوا (سرحد) میں اُردو افسانہ بھی اسی زمانے میں رواج پا چکا تھا جب پریم چند اُردو افسانے پر چھائے ہوئے تھے۔ اگرچہ اُردو افسانہ یہاں باہر سے آیا ہے لیکن اس کے تمام فکری خدوخال پختونوں کی مٹی کی خوشبو سے عبارت ہیں۔ نصیر الدین نصیرؔ کو خیبر پختونخوا کا پہلا افسانہ نگار کہا جاتا ہے جنھوں نے ۱۹۱۴ء میں سب سے پہلے اس صنف کو توجہ دی اور سب سے پہلے اُردو افسانہ لکھا۔ ان کے افسانوں جوالا مکھی، سہاگن، اور مولوی صاحب کی شلوار کا شمار اُن افسانوں میں ہوتا ہے جن سے خیبر پختونخوا میں اُردو افسانہ نگاری کی روایت کی شروعات ہوتی ہے۔

۱۹۱۴ء میں نصیرؔ کا لگایا گیا یہ پودا آج ایک تناور درخت کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ صوبہ کے طول و عرض میں ایسے نامور افسانہ نگار پیدا ہو چکے ہیں جو کہ اپنے مثال آپ ہیں۔

خیبر پختونخوا کے افسانہ نگاروں نے اپنی تخلیقات میں پختون خوا کے دامن میں پھیلی ہوئی دیہی معاشرت اور سماج کو بطور خاص موضوع بنایا ہے۔ یہاں ۸۰ فیصد آبادی، شہروں سے دور دیہات میں بستی ہے جو کہ یہاں اقتصادیات میں ریڑھ کی ہڈی کی مانند ہے کیونکہ ہمارا پورا دیہاتی معاشرہ زرعی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس خطہ کے افسانہ نویسوں نے اپنے افسانوں میں یہاں کا دیہاتی ماحول، کسان، حجرہ، فطری مناظر، پہاڑ، پودے، دریا، پگڈنڈیاں، کھیت کھلیان، سادہ لوح دیہاتی افراد، ان کے غم، محبت، بہادری، خودداری، خلوص، ایثار، مذہب، توہم پرستی، جرگہ سسٹم، انتقام، رومان اور مسائل غرض تمام پہلوئے حیات کو اپنی تخلیقی کاوشوں میں چابکدستی سے پیش کیا ہے۔

خیبر پختونخوا کی آبادی کا سب سے بڑا نسلی گروہ پشتونوں کا ہے۔ اس کے علاوہ صوبہ خیبر پختونخوا میں لاکھوں افغان مہاجرین بھی قیام پذیر ہیں جن میں اکثریت پشتونوں کی ہے۔ یہاں کے ادیبوں اور افسانہ نگاروں نے بکثرت اپنے تخلیقات میں ان ہی پشتونوں کا ذکر کیا ہے اور یہاں کے تہذیب و ثقافت کو انہی سے جوڑ کر پشتون تہذیب و ثقافت کا نام دیا

ہے ۔ دنیائے ادب کے دیگر لکھاریوں کی طرح یہاں کے افسانہ نگاروں نے بھی اپنے افسانوں کے لیے موضوعات اور کردار اسی معاشرے سے منتخب کئے اور پھر اپنے انداز اور اسالیب کو بروئے کار لا کر معاشرتی مسائل کو اُجاگر کر کے قاری کو باخبر اور اصلاح کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ان سب میں جو ایک خاص چیز مشترک دکھائی دیتی ہے وہ ہے دیہات کی عکاسی کم و بیش ہر افسانہ نگار نے یہاں کے دیہی مناظر کو عمدگی سے صفحہ قرطاس پر اُتارا ہے ۔ خیبر پختونخوا کے اُردو افسانے میں دیہات نگاری کا جائزہ لینا ایک اہم موضوع تھی۔اس طرح اس بنیادی موضوع پر تحقیق کرنے سے اُردو افسانے کے سرمائے میں اضافہ پر ایک سیر حاصل تحقیق کی گئی ہے اور بہتر سے بہتر نتائج کو تشت ازبام کیا گیا ہے۔

ii۔ بیانِ مسئلہ:

خیبر پختونخوا کے اُردو افسانے میں جہاں اور رویے ،خیالات ،موضوعات اور رجحانات پائے جاتے ہیں وہاں دیہات نگاری کا وجود بھی بکثرت موجود ہے۔ یہاں کے افسانہ نگاروں نے پشتون دیہی معاشرت کے تمام پہلووں کو بہترین انداز میں حقیقی روپ دے کر پیش کیا ہیں اور دیہاتیوں کی روزمرہ زندگی ،رسوم ورواج اور طرز معاشرت کو جامعیت کے ساتھ اُجاگر کیا ہے۔

iii۔ مقاصد تحقیق:

اس تحقیق میں درج ذیل مقاصد پیش نظر رہے ہیں۔

ا۔ پس منظری مطالعہ کی روشنی میں خیبر پختون خوا کے اُردو افسانہ نگاری میں دیہات نگاری کو خوب زیر نظر رکھا گیا ہے۔

۲۔ خیبر پختون خوا کے اُردو افسانے میں دیہات نگاری کے مختلف رجحانات کا ایک جامع مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

۳۔ خیبر پختون خوا کے خاص افسانہ نگاروں کے مجموعوں کا بنظر غائر جائزہ تحریر کیا گیا ہے۔

iv۔ تحقیقی سوالات:

ا۔ خیبر پختون خوا کی اردو افسانے میں دیہات نگاری کے فکری اور فنّی خدوخال کیا ہیں ؟

۲۔ خیبر پختون خوا کے اردو افسانے کے پہلے اوراہم افسانہ نگار کی تاریخی ترتیب قائم کر کے دیہات نگاری کے غالب رجحان کا تحقیقی اور تنقیدی تجزیہ کرنا ہے۔

۳۔ خیبر پختون خوا کے دیہات نگار افسانہ نویسوں کے ہاں دیہات نگاری کے مشترکہ رجحانات کون کونسی ہیں ؟۔

v۔ نظری دائرہ کار:

نظری دائرہ کار کے حوالے سے اُردو افسانہ بالخصوص خیبر پختون خوا کے اُردو افسانے کی ابتدا، ارتقاء اور قیام پاکستان کے بعد کے افسانہ نگاری سے متعلق مواد کا جائزہ مطلوب رہا ہے۔ تہذیب و معاشرت، پختون رسم ورواج، دیہاتی ماحول اوراس کے مسائل، خاندانی نظام، اعتقادات و نظریات کی پیش کش کا مطالعہ زیر نظر رہا ہے۔ خیبر پختون خوا کے اُردو افسانہ نگاروں کی دیہات نگاری کے وجوہات کا جائزہ اور ایک ہی تہذیب و ثقافت کے بارے میں لکھاریوں کے مختلف انداز و پیش کش کی وجوہات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ یہاں کے ادیبوں اور افسانہ نگاروں نے خاص کر اپنے افسانوں میں پشتونوں اور ان کی روایات کا ذکر کیا ہے ۔زیر نظر تحقیق میں حتی الوسع اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ زیادہ تر ان رجحانات، عناصر، رسومات، بودوباش اور اعمال کو زیر مطالعہ رکھا جائے جن کا کسی نہ کسی حوالے سے رشتہ صوبہ خیبر پختون خوااور ان کے باشندوں سے ہے۔

vi۔ تحقیقی طریق کار:

زیر نظر تحقیق کا مقصد اس خطے میں اُردوافسانہ نگاروں کے ہاں خیبر پختون خوا کی دیہی معاشرت کی عکّاسی کا جائزہ لینااور ایک واضح و شفاف رائے قائم کرنا تھااس لیے اس مقالے کے لیے ان افسانوں اور افسانوی مجموعوں کا انتخاب کیا گیا جن میں خیبر پختون خوا کی دیہی معاشرت و ثقافت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ خیبر پختون خوا کے اُردو افسانے میں دیہی معاشرت کی عکاسی کے ضمن میں زیادہ تر دستاویزی طریق تحقیق کوزیر نظر رکھا گیاالبتہ مواد کی فراہمی، موضوع کی تکمیل اور نتائج کو بروقت حاصل کرنے کے لیے مختلف مراحل سے گزرنا ہوتا ہے اس لیے تقاضائے وقت اور ضرورت کے تحت مختلف طریق ہائے تحقیق کو اختیار کیا گیا۔ کُتب رسائی کے تحت مختلف لائبریریوں سے رجوع کرنے کے علاوہ جدید ذرائع تحقیق کا استعمال بھی کیا گیا ہے جن میں انٹرنیٹ اور آن لائن مطلوبہ مواد سے استفادہ کرنا شامل ہے۔

vii۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق:

میرے علم کے مطابق، موضوع خیبر پختون خوا کے اُردو افسانے میں دیہی معاشرت کی عکاسی پر تادم تحریر ایم فل اور پی ایچ۔ ڈی کی سطح کے لحاظ سے کوئی تحقیقی و تنقیدی کام نہیں ہوا ہے۔ نااس موضوع پر کسی بھی یونیورسٹی کے اسکالر کو کام تفویض ہوا ہے۔ اس لئے کافی تگ و دو اور پوچھ گچھ کے بعد اس موضوع کا انتخاب کیا گیا اور اب اس حوالے سے بہترین تحقیقی کام کو پیش کرنے کی سعی کو ممکن بنایا گیا ہے۔

viii۔ تحدید:

مجوزہ موضوع کے تحت پاکستانی دور کے افسانوی مجموعوں کا مطالعہ مقصود رہا۔ بعد از قیام پاکستان تاحال ان تمام اہم اور معتبر افسانہ نگاروں کے افسانوی مجموعوں کا جائزہ بھی ضروری خیال کیا گیا جن میں دیہات نگاری کے حوالے سے خاصا مواد موجود تھا۔ مجوزہ تحقیقی کاوش میں ان تمام تراجم نگاروں کے افسانوں کا جائزہ لینا بھی ضروری جانا گیا جنھوں نے خیبر پختون خوا کے دیہات کو پشتو سے اُردو تراجم کی شکل میں پیش کیا تھا۔ علاوہ ازیں، سرزمین خیبر پختونخوا پر ایسے افسانہ نگار بھی وارد ہوئے ہیں۔ جنھوں نے معاش اور دیگر وجوہات کے بنا ہندوستان کے دیگر علاقوں سے ہجرتیں کی ہیں ان کے افسانوں میں دیگر موضوعات کے علاوہ دیہات کی پیش کش بھی پائی جاتی ہے۔ تحقیق کا تقاضا تھا کہ ان کی تخلیقات کو موضوع کے تناظر میں شامل بحث رکھا جائے۔

ix۔ پس منظری مطالعہ:

تحقیقی کام کے لیے پس منظری مطالعے کی اہمیت مسلمہ ہے۔ زیر نظر موضوع پر تحقیق کے لیے ان تمام تصنیفات کا مطالعہ کیا گیا جن میں متعلقہ موضوع پر مواد کا ملنا ممکن تھا۔ ساتھ ہی اُن رسائل و جرائد کی بھی ورق گردانی کی گئی جن کے سہارے تحقیقی کام آسان ہوا۔ مختلف جائزاتی مطالعے، متفرق تحقیقی خاکے اور مقالے بھی اس سلسلے میں کارآمد ثابت ہوئے۔ ایم فل اور پی ایچ۔ ڈی سطح کے تحقیقی کاموں سے بھی استفادہ کیا گیا، نیز ان لکھاریوں اور اہل علم شخصیات سے بھی رابطہ کیا گیا جو اس موضوع پر دسترس رکھتے تھے۔ پس منظری مطالعے کو مد نظر رکھتے ہوئے مختلف مباحثوں، سیمینارز، ویب سائٹس، انٹرنیٹ مواد، لُغات، اخبارات اور انسائیکلوپیڈیاز سے بھی بھرپور معاونت حاصل ہوئی۔

x۔ تحقیق کی اہمیّت:

اُردو افسانہ میں دیہات کے مناظر، دیہاتی عناصر، تہذیب و تمدن، کلچر و ثقافت، غرض پوری زندگی کو جن افسانہ نویسوں نے کمال مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے ان میں پریم چند، احمد ندیم قاسمی اور سرزمین ہٰذا کے طاہر آفریدی، سحر یوسفزئی، فہمیدہ اختر، زیتون بانو، احمد پراچہ، معصوم شاہ، فیروزہ بخاری، سیّدہ حنا، منوّر روف، محمد جمیل کاچوخیل، شمیم فضل خالق اور اشر آف حسین احمد وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔ ان سب نے ترقی پسند فکر کے تحت طبقاتی کشمکش اور مسائل حیات کی عکاسی کی ہے۔ خیبر پختون خوا کے افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں پختون خوا کے دامن میں پھیلی دیہی معاشرت کو بطور خاص موضوع بنایا۔ اس صوبے میں ۸۰ فیصد آبادی شہروں سے دور دیہات میں بستی ہے اور اقتصادیات میں ان کو

خاص اہمیت حاصل ہے۔ چونکہ یہاں کا معاشرہ زرعی ہے یہی وجہ ہے کہ اس خطہ کے افسانہ نویسوں نے اپنے افسانوں میں یہاں کا دیہاتی ماحول، کسان، حجرہ، فطری مناظر، پہاڑ، پودے، دریا، پگڈنڈیاں، کھیت کھلیان، سادہ لوح دیہاتی افراد، ان کے غم، محبت، بہادری، خودداری، خلوص، ایثار، مذہب، توہم پرستی، جرگہ، انتقام، رومان اور مسائل غرض تمام پہلوؤں کو شعوری کوشش سے سامنے لایا گیا ہے۔

خیبر پختون خوا پر ربِّ کعبہ نے بہت سی مہربانیاں نچھاور کی ہیں۔ جھومتی گاتی ندیاں، سر داور حسین چشمے سدابہار اشجار، لہلہاتے کھیت، رس بھرے پھل اور پیار بھرے ملائم جذبات سے معمور دل شامل ہیں۔ یہاں کی زندگی کی تمام مستیاں اور سرمستیاں جوبن پر ہوتی ہیں۔ کیونکہ یہاں کے لوگ فطرت سے قریب تر ہونے کی وجہ سے ہر قسم کی ذہنی و فکری آلودگیوں سے پاک ہیں۔ زندگی کے دوسرے میدانوں میں ملکی اور بین الاقوامی سطح پر کارہائے نمایاں سرانجام دینے والے یہاں کی باسیوں نے ادب کے میدان میں بھی گراں قدر سرمائے کا اضافہ کیا ہے۔ شعر و شاعری کے ساتھ ساتھ صنف افسانہ نویسی میں بھی کئے معتبر نام ہیں جنھوں نے اس میدان میں بے مثل کارنامے سرانجام دیے ہیں۔ دنیائے ادب کی دیگر لکھاریوں کی طرح یہاں کے افسانہ نگاروں نے بھی اپنے افسانوں کے لیے موضوعات اور کردار اسی معاشرے سے منتخب کئے اور پھر اپنے انداز اور اسالیب کو بروئے کار لا کر معاشرتی مسائل کو اُجاگر کر کے قاری کو باخبر اور اصلاح کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ لیکن ان سب میں جو ایک خاص چیز مشترک دکھائی دیتی ہے وہ ہے دیہات کا پس منظر، کم و بیش ہر افسانہ نگار نے یہاں کے حسین مناظر کو عمدگی سے صفحہ قرطاس پر اُتارا ہے۔ ان کے افسانوں میں دیہاتی افراد بے تکلّفی سے دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں اُپلے تھوپنے والی، کہیں درانتی اُٹھائے چارہ کاٹنے والی حسینائیں ہیں اور کہیں بھیڑ بکریاں چرانے والے نوجوان۔ ان قلم کاروں نے نہ صرف یہاں کے باسیوں کی مسائل کی عکاسی کی ہے بلکہ ان کے خوشی و غم اور رسم و رواج کو بھی بیان کیا ہے۔

زیر نظر عنوان کے تحت حتّی الوسع اس بات کی سعی کی گئی ہے کہ خیبر پختون خوا کے افسانہ نگاروں نے کس زاویہ نظر سے دیہاتی ماحول، اس کے مسائل اور طبقاتی کشمکش کو بیان کیا ہے۔ یہاں موجود خاندانی نظام، اعتقادات و نظریات اور دیہاتی زندگی میں موجود توّہمات اور تقدیر پرستی کی کس طرح عکاسی کی گئی ہیں۔ خیبر پختون خوا میں صنف افسانہ کے ابتداء سے اب تک دیہات کے حوالے سے ادیبوں کے تخلیقات میں کونسا تغیّر رونما ہوا ہے۔ اس کے علاوہ مذکورہ تحقیق کی اہمیت یوں بھی بڑھ جاتی ہیں کہ یہاں کے افسانہ نگاروں نے جن زاویہ ہائے نظر سے یہاں کے دیہاتی ماحول کے عناصر اور ان کی حرکیات کو پیش کیا ہے انہیں تحقیقی اور تنقیدی سطح پر اجاگر کیا جائیں۔

ب- خیبر پختونخوا میں اُردو افسانے کی روایت

خیبر پختون خوا میں افسانہ نویسی کی ابتدا پریم چند کے دور میں شروع ہو گئی تھی۔ نصیر الدین نصیر خیبر پختون خوا کے پہلے افسانہ نگار ہیں جنھوں نے ۱۹۱۴ء میں سب سے پہلے افسانہ لکھا۔ وہ ۱۹۳۰ء تک افسانے لکھتے رہے۔ ان کے افسانوں "جوالا مکھی"، "سہاگن" اور "مولوی صاحب کی شلوار" کا شمار ان افسانوں میں ہوتا ہے جن سے خیبر پختون خوا میں اردو افسانہ نگاری کی روایت کی شروعات ہوئی ہیں۔ یہ افسانے "عالمگیر"، "سرحد" اور دوسرے مقامی رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ فارغ بخاری ان کے اولیت کے متعلق لکھتے ہیں کہ

> "نصیر الدین نصیر (ہزارہ) خیبر پختونخوا کے پہلے ادیب ہیں۔ جنھوں نے مختصر افسانہ کی طرف توجہ کی۔ ان کی افسانہ نویسی کا آغاز ۱۹۱۴ء میں ہوا اور ۱۹۳۰ء تک مسلسل لکھتے رہے"(۱)

کچھ عرصہ بعد ایک اور افسانہ نگار عنایت علی شاہ کا افسانہ "ایک شاعر اور اس کا خواب" جبکہ دوسرا افسانہ "خوبصورت لفافہ" منظر عام پر آیا۔ اس میں پشتون معاشرے کی عکاسی بھرپور انداز میں کی گئی ہے۔

خیبر پختون خوا میں اردو افسانہ کی ابتدائی دور سے متعلق ایک اور افسانہ نویس سید مبارک شاہ عاجز ہیں۔ عاجز کے افسانے "رنگین کلی"، "احساس ندامت" اور "مجھے کسی کی تلاش ہے"۔ کلیم افغانی نے شاعری کے ساتھ ساتھ نثر میں افسانوی ادب کو بھی توجہ دی۔ افسانہ "اشک ندامت" ان کی اصلاح پسندی اور ترقی پسندی کا ایک بڑا حوالہ ہے۔ آخر میں وہ ادب کے اسلامی رجحان کے داعی بن گئے۔ افسانہ "حسن آزاد" ان کی اسی سوچ کی غماز ہے۔

رضا حسین ہمدانی نے اسلامی تاریخی واقعات کو افسانوی رنگ آمیزی سے دلکش بنایا۔ عربی الفاظ کا استعمال بھی بے دریغ کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں "جوگن"، "دھوپ چھاؤں" "کافر سر"(۱۹۴۸ء)، "غوبل"(۱۹۵۰ء) اور "جھنڈوں کا میلہ"(۱۹۵۰ء) قابل ذکر ہونے کے ساتھ ساتھ قابل فکر بھی ہیں۔

فارغ بخاری خیبر پختون خوا کے اردو ادب کا ایک بڑا نام ہے۔ ان کو خیبر پختونخوا کے پہلے صاحب مجموعہ افسانہ نگار ہونے کا شرف حاصل ہے ان کا افسانوی مجموعہ "عورت کا گناہ" کے نام سے شائع ہوا۔ اس مجموعے کا سب سے اچھا افسانہ "مکافات عمل" ہے۔

مظہر گیلانی کے افسانوں نے بھی خیبر پختون خوا میں اس صنف کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ان کے دو افسانوی مجموعے "رنگین مشاہدے" اور "بدنصیب سارہ" تقسیم سے پہلے شائع ہو چکے تھے۔ ملک راج آنند ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں سے تھے۔ افسانہ "فطرت کا دل" اور "مرغزار" لکھ کر انھوں نے ترقی پسند افسانے کا فارمولا وضع کیا۔ ان کا ایک افسانہ "کھویا ہوا بچہ" بہت مقبول رہا۔

فسادات کے موضوع پر مبنی افسانے لکھنے والوں میں محمد حسن اور مسرت جہاں کا نام قابل ذکر ہے۔خاطر غزنوی کے افسانے "انار کلی "،"کتے"،جھمکے"اور "چیخ "فسادات کے موضوع پر اچھے افسانے ہیں۔ڈاکٹر عبدالرحیم نے جو افسانے اپنے قارئین کے حضور پیش کیے ان کی اولین خوبی شستہ و برجستہ اسلوب ہے۔ان کا افسانوی مجموعہ "خون کا داغ" کے نام سے شائع ہوا۔عبدالقیوم شفق ہزاروی کا ایک بہترین افسانوی مجموعہ "بہار و خزاں" کے نام سے اردو اکیڈمی سندھ نے چھاپا۔کشمیر کے جنت نظیر وادی میں زندگی کے ہنگامے ان کے افسانوں کے لیے خام مواد کا کام دیتی رہی۔احمد پراچہ کا پہلا افسانہ "تین دوست" کے نام سے منظر عام پر آیا،ان کے دوسرے افسانوں میں "مجبوری کی عیدیں"،"ریت کی دیوار "،"حجرہ "اور "تصویر نارسائی کا زہر" قابل ذکر ہیں۔افسانہ حجرہ میں مقامی قبائل کی زندگی کا چربہ اتارا گیا ہے۔قبائلی زندگی اپنے پورے سیاق و سباق کے ساتھ اس افسانے میں نمایاں ہوتی ہے۔ان کا واحد افسانوی مجموعہ "سوتی جاگتی کلیاں" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

فہمیدہ اختر خیبر پختون خوا کی خواتین افسانہ نگاروں میں ایک معتبر حوالہ ہے۔ان کے دو افسانوی مجموعے شائع ہوئے جن کے نام "کشمالہ" اور "اپنے دیس میں" ہے۔افسانہ "دریائے باڑہ کی فاتح" میں انھوں نے خیبر پختون خوا کے عوام کی روایتی زندگی کی عکاسی کی ہے۔فرید عرش کے افسانوں میں غربت و امارت ہر دو کا بھرپور احاطہ موجود ہے۔افسانہ "گیدڑ سنگھی" ایک درزی کی تشنہ آرزوؤں کی کہانی ہے۔

سحر یوسفزئی نے یہاں کے باسیوں کی اقتصادی بدحالی،توہم پرستی،معاشرتی و معاشی مسائل اور مجبوریوں کا ذکر بڑے بلیغ انداز میں اپنے افسانوی مجموعے "آگ اور سائے" میں کیا ہے۔طاہر آفریدی اردو کے علاوہ پشتو افسانے کا بھی ایک بڑا تخلیق کار ہے۔اپنے طویل ادبی سفر میں اب تک ان کا صرف ایک افسانوی مجموعہ "دیدن" کے نام سے چھپا ہے۔دیدن کے افسانوں پر اگرچہ رومانیت کے گہرے دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں لیکن پٹھانوں کے اُٹھک بیٹھک کے ایسے حقیقی اور معرکتہ الآرا کہانیاں بہت کم افسانہ نگاروں نے تخلیق کی ہیں۔منور روف کا پہلا افسانوی مجموعہ "انمول رتن" جبکہ دوسرا مجموعہ "طرف تماشہ" کے نام سے منظر عام پر آیا۔"انمول رتن" کے افسانوں کا انداز بیانیہ ہے جبکہ "طرف تماشہ" کے افسانوں میں انتظار حسین کے افسانوں کی طرح قدیم اساطیری رنگ نمایاں ہے۔

رضیہ فصیح احمد بھارت کے شہر مراد آباد میں پیدا ہوئیں لیکن بعد میں انھوں نے زندگی کا زیادہ تر حصہ خیبر پختون خوا میں گزارا۔ان کے افسانوی مجموعوں میں "نقاب پوش"،"رام پیاری"،"سرگوشی"،"بالا خانہ" اور "آخری قطرہ" شامل ہیں۔جبکہ ان کا پہلا افسانہ "ناتمام تصویر" کے نام سے شائع ہوا۔

خیبر پختون خوا کے افسانے میں سیدہ حنا کا نام عزت واحترام سے لیا جاتا ہے۔اب تک ان کے دو افسانوی مجموعے "پتھر کی نسل" اور " جھوٹی کہانیاں "منظر عام پر آچکے ہیں۔اُم عمارہ ہندوستان کے صوبہ بہار کے شہر پٹنہ میں پیدا ہوئی۔ڈھاکہ سے ایم اے کرنے کے بعد انہوں نے مشرقی پاکستان سے ہجرت کی اور زندگی کے زیادہ تر شب وروز خیبر پختون خوا کے شہر ایبٹ آباد میں گزارے۔ان کے دو افسانوی مجموعے " آگہی کے ویرانے " اور " درد روشن ہے " کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔انور خواجہ کے افسانوی مجموعوں میں 'بوزنے بندر" اور " ناشناس" شامل ہیں۔ان کے افسانوں میں مصنف کی گہری نظر وسیع مطالعہ اور گوناگوں تجربات کا عکس ملتا ہے۔

خیبر پختون خوا کے اردو افسانے میں علامتی و تجریدی رجحان کے حامل افسانہ نگاروں میں ڈاکٹر اعجاز راہی ،حامد سروش،یوسف عزیز زاہد ،حیدر قریشی اور ناصر علی سید کے نام اہم ہیں۔اشر آف حسین احمد کا افسانوی مجموعہ " آکاس بیلیں " کے نام سے شائع ہوا۔ دیہاتی زندگی کی اداسیوں اور محرومیوں کے علاوہ انھوں نے اپنے افسانوں میں شہر کے باسیوں کی کرب ناک زندگی اور اندوہ ناک واقعات بھی شامل کیے ہیں۔ڈاکٹر پروین عظیم خیبر پختون خوا کے ان دوچار پردہ نشین افسانہ نگاروں میں شامل ہیں جنھیں ایک خاص مرتبہ حاصل رہا ہے۔۔ان کا افسانوی مجموعہ " گور کی کی ماں" کے نام سے منظر عام پر آیا ہے۔فیروزہ بخاری کے دو افسانوی مجموعے "سچ کا زہر " اور " بادلوں کے سائے "چھپ چکے ہیں ۔طوالت کی شدت نے ان کے افسانوں میں کہانی کی وحدت کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔جہانگیر سواتی کا افسانوی مجموعہ " اشراق " کئی حوالوں سے اہم ہے۔ان کے افسانوں میں معاشرتی اصلاح کا اخلاقی سبق دیا گیا ہے۔معصوم شاہ کا افسانوی مجموعہ "بند مٹھی" کے نام سے شائع ہوا۔

کلیم خارجی نے بھی خیبر پختون خوا میں اردو افسانہ نگاری کے میدان میں کئی اچھے اضافے کیے ہیں۔ان کا پہلا مجموعہ "طوائف کے خطوط " اور دوسرا "گھٹیا آدمی " کے نام سے شائع ہوا۔ان افسانوں میں ذات کے سچ کے علاوہ کائینات کی عالمگیر سچائیوں پر بھی دلیرانہ تبصرہ ملتا ہے۔ڈاکٹر عنایت اللہ فیضی دوسرے افسانہ نگاروں کے برعکس انسانوں کی بجائے اس قدرتی ماحول کی تباہی وبربادی کا رونا روتے ہیں جسے ہم خود اپنے ہی ہاتھوں تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ان کے قابل ذکر افسانوں میں " جھیل کنارے "اور " قصہ نصف صدی کا" شامل ہیں۔

خیبر پختون خوا میں جدید عہد کے افسانہ نگاروں میں عطیہ سید کے دو افسانوی مجموعے "شہر ہول "اور " شکایت جنوں" کے نام سے چھپ چکے ہیں۔ان کے علاوہ محمد جمیل کا چوخیل کا "نوحہ بے نام " اور "جلتا سر اسُلگتی روح " ، قیوم مروت کا" وہ میں بھی ہوں وہ تم بھی ہو"، گلشاد انصاری کا مختصر سا افسانوی مجموعہ " دختر چترال "، ثروت وہاب کا"خواب جب ٹوٹتے ہیں " اور فیاض عزیز کا افسانوی مجموعہ " سواد شہر " شامل ہیں۔ان کے علاوہ بہت سے ایسے افسانہ نویس جن کے افسانے ملک

کے مؤقر جرائد ورسائل میں چھپ کر منظر عام پر آچکے ہیں ان میں غزالہ نگار اور کزئی، خالد سہیل ملک، ریاض الرحمان ، جمیل یوسفزئی، تاج الدین تاجور، پروفیسر تنویر احمد، رجیعہ بخاری، محمد اویس قرنی، سید زبیر شاہ، ممتاز حسین، اسحاق وردگ، اور شاہد انور شیرازی وغیرہ شامل ہیں۔

دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح اردو بھی تراجم کے لحاظ سے بہت باثروت ثابت ہوئی ہے۔فی زمانہ اس میں عربی، فارسی، انگریزی، روسی، فرانسیسی اور جرمن زبان کے لاتعداد تراجم منظر عام پر آچکے ہیں۔

زیر نظر تحقیقی کاوش میں ان تمام تراجم نگاروں کے افسانوں کا جائزہ لینا بھی ضروری جانا گیا جنھوں نے خیبر پختون خوا کے دیہات نگاری کو پشتو سے اُردو تراجم کی شکل میں پیش کیا تھا۔ ان افسانہ نگاروں میں رضا حسین ہمدانی کا نام سر فہرست ہے۔ ان کا پشتو زبان کے مختلف افسانہ نویسوں کے افسانوں کا ترجمہ کردہ مجموعہ "پشتو افسانے" کے نام سے ۱۹۶۱ء میں نیا مکتبہ پشاور سے شائع ہوا۔ اس افسانوی مجموعے میں کل تیرہ (۱۳) افسانے شامل ہیں۔ خیبر پختونخوا کے خواتین افسانہ نگاروں میں سب سے معتبر نام زیتون بانو کا ہے۔ اپنے ادبی سفر کے آغاز میں زیتون بانو پشتو زبان کو ہی ذریعہ اظہار بناتی رہیں۔ مگر کامیاب پشتو تصانیف سے ملنے والے حوصلے کی بدولت اپنے دائرہ اثر کو وسیع کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے اپنے پشتو افسانوں کا اردو میں ترجمہ کرنے کا قدم اُٹھایا۔ ان کی کتاب "شیشم کا پتا" اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ بارہ افسانوں پر مشتمل یہ کتاب ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں شامل افسانے موصوفہ کے پشتو افسانوں کے تراجم ہیں۔ کتاب میں موجود پانچ افسانوں کا ترجمہ اس کے شوہر تاج سعید نے کیا تھا جن میں افسانہ "بختاور"، "دوشیزگی کی نشانی"، "کانچ کے ٹکڑے"، "ناتمام آرزو" اور "کرم خوردہ ستون" شامل ہیں۔ ساتھ تین افسانوں کا ترجمہ فقیر حسین ساحر نے کیا۔ ان میں "سردار"، "چلیچی" اور "تماشا تماشائی" شامل ہیں۔ دو افسانوں کا ترجمہ رحیم گل نے کیا جن کے نام "موم کے آنسو" اور "شیشم کا پتا" جب کہ ایک افسانے "زندہ دکھ" کا ترجمہ جناب خاطر غزنوی نے کیا۔ "ایک آنے کا بیٹا" اس مجموعے کا وہ افسانہ ہے جس کو سعد اللہ جان برق نے ترجمہ کرکے اردو کے قالب میں ڈھالا۔

زیتون بانو کے پشتو افسانوں کے اردو تراجم پر مبنی دوسری کتاب "وقت کی دھلیز پر" ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئی ۔ مترجمین میں فقیر حسین ساحر اور مشتاق شباب کے نام شامل ہیں۔ اس میں کل چودہ افسانے ہیں۔ جن میں نو افسانوں کا ترجمہ مشتاق شباب نے جبکہ باقی کو فقیر حسین ساحر نے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ "زندہ دکھ" بانو کے افسانوں کا ایسا ترجمہ شدہ مجموعہ ہے جس میں ان کے دو افسانوی مجموعوں "شیشم کا پتا" اور "وقت کی دہلیز پر" کو اکٹھا کر کے مقبول اکیڈمی لاہور نے ۱۹۹۸ء میں شائع کی۔ اس میں کل ملا کر چھبیس (۲۶) افسانے شامل ہیں۔ مترجمین میں تاج سعید، فقیر حسین ساحر، رحیم گل، خاطر غزنوی، سعد اللہ جان برق اور مشتاق شباب شامل ہیں۔

قیوم مروت نے بھی کئی پشتو افسانوں کے تراجم کیے۔ جو "صرف شرفا کے لیے" کے نام سے کتابی صورت میں ۱۹۹۷ء میں شائع ہوئے۔ یہ سینتیس (۳۷) پشتو افسانوں کا اردو ترجمہ ہے۔ اس میں خیبر پختون خوا کے علاوہ بلوچستان بلکہ افغانستان کے افسانوں کا ترجمہ پوری چابکدستی کے ساتھ کیا گیا ہے۔

عبدالکافی ادیب کے اردو تراجم پر مبنی افسانوی مجموعہ " بگڑے چہرے " ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا۔ ان میں کل چھبیس (۲۶) افسانے ہیں۔ جن میں چار افسانوں کے تراجم فقیر حسین ساحر نے جبکہ باقی تمام افسانوں کے تراجم عبدالکافی ادیب نے خود کیے ہیں۔

ج: خیبر پختون خوا کی دیہی معاشرت

i۔ تاریخی و تہذیبی پس منظر:

فطرت اپنے تمام بے ساختہ پن کے ساتھ دیہات میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ وہاں تصنع و بناوٹ کے نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ سادگی، ہمدردی اور خلوص جیسی خصوصیات دیہات کی زندگی کو شہر کی زندگی سے ممتاز کر دیتی ہیں۔ دیہات کے لوگ زمین سے گہری وابستگی رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کے زمینی رشتے بہت گہرے اور مضبوط ہوتے ہیں۔ ان کی نشست و برخاست، میل میلاپ، انداز گفتگو اور کردار میں زمین کی بھینی بھینی خوشبو اور زرخیزی صاف محسوس کی جاسکتی ہے۔ پاک وصاف اور تصنع سے مبرّا ماحول زندگی زیادہ پُرکشش بنادیتا ہے۔ وہاں کے اکثر لوگ معصوم ہوتے ہیں اور اُن کے جذبات اور پاک آرزوئیں فطرت کی گود میں سر اُٹھاتی ہیں۔ دیہات کی زندگی اس قدر پُرکشش ہونے کے باوجود اپنے اندر بہت سی خامیاں بھی رکھتی ہے۔ مفلسی و بے روزگاری، صحت و صفائی اور تعلیمی سہولتوں کا فقدان دیہاتیوں کے اجتماعی مزاج پر بہت بُرا اثر ڈالتا ہے۔ گاؤں کی روز مرّہ زندگی میں چھوٹی چھوٹی باتوں سے جھگڑے جنم لیتے ہیں اور بات یہاں تک پہنچتی ہے کہ بندوق پہلے چلتی ہے اور سوچا بعد میں جاتا ہے۔ گروہ بندی اور خاندانی دشمنی انسانی خون کو شائد پانی سے بھی آرزاں بنا دیتی ہے۔ گاؤں کی پُرسکون زندگی میں ایک طوفان آجاتا ہے، کھڑی فصلوں، راہ چلتے جانوروں، فصلوں کو پانی دینے اور حجروں میں اپنے آپ کو منوانے پر اکثر جھگڑے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ دونوں فریق بہت سے ہنستے کھیلتے چہروں کو افسردہ بنادیتے ہیں۔ دلہنوں کے سہاگ اُجاڑ دیتے ہیں اور بچّوں کے سروں سے سائباں ہٹادیتے ہیں۔ گاؤں کے ان جھگڑوں اور بکھیڑوں میں ایک اہم رول گاؤں کے سربراہ بھی ہوتا ہے۔ ایک طرف تو وہ گاؤں کے تمام فوائد پر مارگنج کی طرح اکیلا قابض ہوتا ہے اور دوسری طرف اُس کی ذات ان جھگڑوں میں بلواسطہ یا بلاواسطہ شامل ہوتی ہے۔

زیر نظر مقالہ چونکہ خیبر پختون خوا کے اُردو افسانے میں دیہات کی عکّاسی کے تجزیاتی مطالعہ پر مبنی ہے اس لیے یہاں مختصراً خیبر پختون خوا کے تہذیب و ثقافت ،اکثریتی زبان پشتو اور پشتون قوم کی تاریخ کا مختصر تحقیقی تجزیہ پیش کیاجاتاہے۔ افغانستان اور خیبر پختونخوا کے طول و عرض میں رہائش پذیر پشتونوں کے اصل نسل اور آبائی علاقے کے بارے میں یقینی شواہد ناکافی ہیں۔ محض قیاسات سے کام لے کر کئی نظریات قائم ہوئیں جن کو پڑھ کر قاری مزید پراگندگی اور اُلجھاؤ کا شکار ہو جاتا ہے۔اس حوالے سے ایک مشہور نظریہ یہ ہے کہ پشتون قبائل کا تعلق بنی اسرائیل سے ہےاس نظریے کی حمایت میں ملا نعمت اللہ ہروی، خان روشن خان اور خیال آفریدی نے شدومد کے ساتھ لکھاہے جبکہ عبدالحیٔ حبیبی، سعد اللہ جان برق اور بہادر شاہ ظفر کاکا خیل نے پشتون قوم کو آریائی قبائل کی ایک شاخ قرار دی ہے یادرہے کہ اس نظریے کو حکومتِ افغانستان کی سرپرستی بھی حاصل ہے۔اولف کیرو نے ان کو ایک مخلوط النسل قوم کہاہے۔ غنی خان نے پشتون قوم کو نسلی طور پر ظاہری خدوخال کی وجہ سے یونانی قرار دیا۔ان نظریات میں ایک دلچسپ نظریہ پریشان خٹک کاہے جس کا کہناہے کہ

> "پشتون قوم دراصل پشتون ہی ہے ان کا رشتہ بلاضرورت دوسری اقوام سے ملانا درست رویہ نہیں۔"(۲)

پٹھان کے اجدادوانساب سے متعلق دورائے ہیں ان میں بعض محققین کی رائے یہ ہے کہ پٹھان زبان پشتو یا پختو کے اعتبار سے جنھیں پشتون یا پختون کہاجاتاہے وہ قدیم آریا قوم کی اولاد میں سے ہیں۔ جبکہ زیادہ تر محققین کی رائے میں انکا سلسلہ نسب اسرائیلی بادشاہ طالوت تک پہنچتاہے اور اکثر پٹھان اپنے آپ کو اور اپنے اباو اجداد کو اسی عظیم شجرہ سے ماخوذ کر کے فخر محسوس کرتے ہیں ثانی الذکر رائے کے مطابق ان کا شجرہ نسب جو مرتب ہوتا ہے اس کا عرصہ حیات تقریباًچار سو سال پہلے سے اس مرتبہ شجرے کے مطابق پٹھان نسل کے بانی اسرائیلی طالوت کے سینتیسویں جانشین قیس ہیں جو ایک عابد مجاہد انسان تھے اور ساتھویں صدی کے دوران افغانستان میں غور کے آس پاس رہتے تھے وہ اسلامی تعلیم اور روایات سے بے حد متاثر ہوئے اور مشرف بہ اسلام ہوئے وہ اور ان کے بعض ساتھی عرب گئے آنخضور سے شرف ملاقات حاصل کیا ایک افسانوی اور سینہ بسینہ چلنے والی مگر بڑی جاندار اور تسلسل پزیر روایت کے مطابق قیس نے جب اپنے ساتھیوں کے ساتھ اپنی وجیہ القامت حیثیت کے ساتھ ملاقات کی تو آپ نے قیس کا نام عبدالرشید رکھا تو یہ بعد میں قیس عبدالرشید کے نام سے مشہور ہوئے آنخضرت کے ساتھ دوبارہ شرف صحبت حاصل کیا تو قریبی صحابہ رضوان اللہ نے ان کی حیثیت کے بارے میں جاننے کی کوشش کی تو آنخضرت نے فرمایا"بطان اسلام"یعنی یہ اسلام کی (کی کشتی) کے چپو ہیں، چنانچہ قیس عبدالرشید اور ان کے ساتھی بطان، کے نام سے مشہور ہوگئے اور پھر زمانہ گزرنے کے ساتھ یہ اپنے

علاقے میں بطان سے پٹھان ہو گئے۔ قیس عبد الرشید کے انتقال کے بعد ان کی اولاد غور سے قندھار منتقل ہو گئی، بعد میں ان کی اولاد نے مشرق کی طرف رخ کیا اور پشاور اور آس پاس آکر آباد ہوئے اور انہوں نے یہاں مختلف قبائل سے رشتے ناطے کئے پشاور میں گندہاری آباد تھے جو پشاور کے اصلی باشندے تھے انہوں نے گندھاریوں سے جو زبان لی وہ پشتو ہے۔

پٹھانوں کے تین بڑے نسلی ماخذ:

پٹھانوں کی تمام شاخیں قیس عبد الرشید کے کسی ایک بیٹے سے اپنا ماخذ منسوب کرتی ہیں۔ قیس عبد الرشید کے تین بیٹے تھے۔ سٹر بن، بیٹ، غور غشت۔ سٹر بن کی اولاد میں سے جو پٹھان شاخیں ہیں وہ اپنے آپ کو سٹر بنی کہتے ہیں۔ سٹر بنی ماخذ سے منسوب پٹھانوں میں، یوسفزئی، محمد زئی، مہمند، درانی، غوری، خیل، خاخانی خیل، شینواری، قبائل و اقوم شامل ہیں یہ سب سٹر بن کو اپنا مورث اعلی قرار دیتے ہیں۔ بیٹ، جسے بیطان بھی لکھا جاتا ہے اس کی نرینہ اولاد نہیں تھی اس کی ایک بیٹی تھی جو ایرانی شہزادے کے ساتھ بیاہی گئی تھی۔ اس کی اولاد میں غزلزئی پٹھان شامل ہیں ان میں سلیمان خیل اوراکا خیل کے بڑے بڑے خانہ بدوش قبائل شامل ہیں۔ غور غشت، پٹھانوں میں، آفریدی، خٹک، وزیر، محسود، دور طوری، جاجی، اور بنگش غور غشتی پٹھان ہی ہے۔

خیبر پختون خوا کا قدیم نام گندھارا تھا۔ ۱۵۲۰ء ملک احمد خان نے پختون خوا کے نام سے اس خطے میں ریاست قائم کی۔ شیخ ملی اس کے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ شیخ ملی نے پشتون معاشرے کو مدِ نظر رکھ کر ایک متوازن قانون وضع کیا۔ مردم شماری اور بہترین آبپاشی کا نظام وضع کر کے قبائل میں علاقوں کو بہترین انداز اور ترتیب سے تقسیم کیا۔ تاہم اس تقسیم میں حریف قبائل کے حصے کو ہڑپ کر کے انصاف کی دھجیاں اڑائی گئیں۔ یوں اس خطے میں اولین پشتون ریاست وجود میں آگئی۔ ۲۰ دسمبر ۱۹۰۱ء کو انگریزوں نے اس خطے کو دہلی کی شمال مغرب میں ہونے کی وجہ سے شمال مغربی سرحدی صوبہ کے نام سے الگ حیثیت دی۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان معرضِ وجود میں آنے سے یہ خطہ ایک صوبے کی حیثیت سے شامل ہوا۔ ۲۰۱۰ء میں پاکستان کی پارلیمنٹ میں پیش کی جانے والی اٹھارہویں ترمیم میں اس صوبے کا نام تبدیل کر کے خیبر پختون خوا رکھا گیا۔ اس صوبے کا حدودِ اربعہ درج زیل ہے:

> "یہ ۳۰اور ۳۸درجہ طول بلد شمالی اور ۶۸درجہ اور ۷۵ درجہ عرض بلد مشرق کے درمیان پھیلا ہوا ہے۔ اس کا کل رقبہ ۳۹۲۸۴ مربع میل ہے۔ اس وقت اس صوبے میں ۲۵ اضلاع ہیں جن کا کل رقبہ ۱۰۵۱۱ مربع میل جبکہ قبائلی علاقوں کا رقبہ ۲۸۷۷۳ مربع میل ہے" (۳)

خیبر پختون خوا کے شمال میں ہندو کش کے پہاڑی سلسلے، جنوب میں بلوچستان اور پنجاب کے کچھ علاقے، مشرق میں پنجاب کا ضلع اٹک اور دریائے سندھ اور مغرب میں افغانستان واقع ہے۔ ہزارہ کے علاوہ صوبہ پنجاب ڈویژن یعنی ملاکنڈ، مردان، پشاور، کوہاٹ، اور ڈیرہ اسماعیل خان ڈویژن پر مشتمل ہے۔ صوبے کے بیشتر علاقوں میں پشتو سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ہندکو، سرائیکی، کوہستانی، گوجری، کھوار، پوٹھواری، یہاں کی علاقائی زبانیں ہیں۔

خیبر پختون خوا ثقافتی لحاظ سے بھی بڑا ذرخیز اور منفرد خطہ ہے۔ خطے میں آباد اکثریتی قومی پشتون کے رسم ورواج کے بارے میں تفصیلی تجزیہ اگلے صفحات میں ہو گا۔ ان مباحث کی راشنی میں اگلے ابواب میں افسانوں کا فکری تجزیہ ممکن ہو سکے گا۔ علاقائی رسم ورواج کا بنیادی ماخذ ثقافت کو قرار دیا جاتا ہے۔ اس لیے پہلے ثقافت کا تجزیہ کرتے ہیں۔ لفظ ثقافت کی تعریف ابوالاعجاز حفیظ صدیقی نے یوں کی ہے:

"کلچر جرمن زبان کے لفظ کلٹر سے ماخوذ ہے جس میں جوتنے، بونے اور اُگانے کا استعارہ پایا جاتا ہے مگر جو کچھ جوتا جاتا ہے وہ زمین نہیں انفرادی اور اجتماعی ذہن ہے جو کچھ بویا جاتا ہے بیج نہیں تصورات ہیں اور جو کچھ اُگایا جاتا ہے وہ اناج کی فصل نہیں بلکہ یکسانی کردار کا وہ نمونہ ہے جس کی بدولت کسی گرہ میں وحدت کا شعور راسخ ہوتا ہے"۔(۴)

اردو میں کلچر لفظ کا نعم البدل ثقافت ہے۔ ثقافت دراصل روئے زمین پر بسنے والے مختلف اقوام کا ایک دوسرے سے جداگانہ طرزِ معاشرت اور رہن سہن کے منظم اصول ہیں۔ ان جداگانہ اور نسل در نسل منتقل شدہ اکتسابات کے مجموعے کو ثقافت کہا جاتا ہے۔ بدرالحکیم نے جزئیات کے ساتھ ثقافت کے اجزاء کو یوں بیان کیا ہے:

"عقائد، روایات، تجربات، اخلاقیات، عادات، نفسیات، ادبیات، مصوری، رقص، تصورات، رہن سہن کے طور طریقے، علوم و فنون، رسل ورسائل، اور اقتصادی ادارے ثقافت کے اجزاء ہیں۔۔۔۔۔ کلچر انسانی ذہن اور کردار کی تربیت میں اہم کردار ادا کرتا ہے"۔(۵)

پشتون قوم کی ثقافت دیگر ثقافتوں سے الگ اور منفرد تشخص کی حامل ہے۔ یہاں کی ثقافت پر قبائلی زندگی کے اثرات نمایاں ہیں۔ برصغیر کے دروازے پر رہنے کی وجہ سے مسلسل حملوں سے بچاو کے لیے قبائلی زندگی کو پشتونوں نے ترجیح دی۔ یوں آپس کے جھگڑوں کو حل کرنے کے لیے جرگہ وضع ہوا۔ جرگہ کو پشتون معاشرت میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ جرگہ دراصل امن کی علامت ہے۔

پشتو زبان کا بنیادی تعلق پہاڑی علاقوں سے رہا اس لیے اس پر سختی اور درشتی کے آثار نمایاں ہیں۔یہی آثار یہاں کے لوگوں کے رویوں میں بھی واضح نظر آتے ہیں۔پشتون قوم کا روائتی لباس ڈھیلی ڈھالی شلوار ، قمیص ،چادر ، عمامہ (شملہ / لونگئی) یا سفید ٹوپی،واسکٹ اور جوتے یا کوہاٹی چپل ہیں۔کھیلوں میں یہاں کے لوگ آنکھ مچولی، نشانہ بازی، بُزکشی، گلی ڈنڈا، چپلی مار وغیرہ پسند کرتے ہیں۔تاہم ثقافتی یلغار کے نتیجے میں نئی نسل زیادہ تر کرکٹ، فٹ بال، ہاکی، ولی بال اور ٹینس کی طرف راغب ہے۔

موسیقی اور رقص کی محفلیں بھی مخصوص موقوں پر سجتی ہیں،رباب، بانسری اور ڈھول کا استعمال آلاتِ موسیقی میں زیادہ ہوتا ہے۔اتنڑ یہاں کا مخصوص اور منفرد ڈانس ہے۔اسکے علاوہ خٹک ڈانس کو بھی زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔اس ثقافتی جزو کا تذکرہ قاری جاوید اقبال ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> "کرک کے علاقے میں خٹک ڈانس، کے نام سے رقص یہاں کے لوگوں میں مشہور ہے اس کی مقبولیت صوبہ سرحد کے تمام علاقوں میں ہے اور صوبہ سرحد کی ثقافتی اور روایتی پہچان خٹک ڈانس ہو گیا ہے۔ جبکہ یہ ڈانس اس علاقے کی پیداوار ہے، اکثر خوشیوں اور جشن کے مواقع پر یہ رقص ہوتا ہے ۔خٹک ڈانس اب تمام پٹھانوں کی مشترکہ ثقافتی علامت ہے"۔ (۶)

پشتونولی پشتونوں کی ثقافت ہے،اس میں معاشرتی زندگی سے متعلق تمام اُمور کے لیے قوانین موجود ہیں۔یہ قوانین اسلامی قوانین سے بہت قریب ہیں۔اگرچہ مغربی تہذیب کے اثرات نے ان اقدار کو کافی نقصان پہنچایا ہے تاہم یہ رسم و رواج پھر بھی کسی نہ کسی صورت میں قائم و دائم ہیں۔پشتونولی کی تعریف اور اجزاء کا تذکرہ ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک نے ان الفاظ میں کیا ہے:

> "پشتون تہذیب دنیا کی تہذیبوں میں ایک منفرد تہذیب ہے ،اس تہذیب کا اپنا ایک اخلاقی نظام ہے۔اخلاقیات کا اپنا اعلیٰ فلسفہ رکھتا ہے۔اس فلسفے میں ہر اخلاقی قدر کا اپنا ایک نظریاتی تصور ہے۔پشتو تہذیب کی ہم عصر تہذیبیں زیادہ تر فنا ہو چکی ہیں اور یہ قدیم تہذیب اب تک زندہ اور فعال ہے۔۔۔۔۔یہی پانچ اقدار دراصل پشتون ولی کی بنیاد سمجھا جاتا ہے جن پر پشتو کا تمام تہذیبی اور اخلاقی نظام اُستوار ہے۔یہ کچھ اس طرح ہے کہ "پ" پت کے لیے ہے۔"ش" ،شیگڑہ یعنی احسان کے لیے ،"ت" کا مطلب تورہ یعنی بہادری ہے،"و" برائے وفا اور "ن" کا مطلب ننگ ہے۔" (۷)

پشتون معاشرہ میں جرگہ (فریقین کا صلح کے شرائط پر اتفاقِ رائے کے لیے کسی جگہ اکٹھے ہونا)، ننواتی (متاثرہ فریق کو صلح پر آمادہ کرنے کے لیے دوسرے فریق کا اکابرینِ علاقہ کے ساتھ متاثرہ فریق کے ہاں جانا)، مہمان نوازی، وطن کی حفاظت، صلح کرنا، عورتوں کا احترام، پناہ دینا، اتفاق اتحاد، تاوان (متاثرہ فریق کے نقصان کا ازالہ کرنا)، تڑون (لڑکا اور لڑکی کا رشتہ جوڑنے کے رسوم) وغیرہ جیسے بہترین اقدار موجود ہیں۔ تاہم یہاں پیغور (حریف کو کمتر ثابت کرنے کے طور پر بدلہ لینے کے لیے کسی فریق کا دوسرے فریق کو طعنہ دینا)، غگ (لڑکی والوں کی طرف سے رشتہ نہ دینے کے ردِ عمل میں لڑکے والے جب لڑکی پر کسی اور سے شادی کرنے پر پابندی لگادے)، سورہ (جانی نقصان کے ازالے کے لیے کسی لڑکی کی شادی متاثرہ خاندان کے کسی فرد سے کرنا)، وٹہ سٹہ (کسی لڑکی کا رشتہ اس شرط پر مانگنا کہ اس لڑکی کا بھائی دُلہے کی بہن سے شادی پر آمادہ ہو جائے)، ولور (بیٹی کا رشتہ دیتے پر رقم کی وصولی) اور انتقام جیسے قبیح رسوم بھی موجود ہیں۔ محبت کی شادی کو شجرِ ممنوع کا درجہ حاصل ہے۔ پھر بھی شعور و آگہی اور علمی ترقی کی وجہ سے معاشرے میں یہ منفی رسومات رفتہ رفتہ ختم ہوتے جارہے ہیں یا پھر یہ رسوم خاص طور پر رسم غگ، سورہ، وٹہ سٹہ اور ولور محدود ہو کر ان علاقوں تک سمٹ گئے ہیں جو کہ افغانستان کے ساتھ ملحقہ ہیں کیونکہ آج بھی وہاں ان رسومات کو عام رواج کی حیثیت حاصل ہے۔

پختون ثقافت کو بلاشبہ عظیم تہذیب کہا جا سکتا ہے۔ اس کے قدامت و عظمت کو یہاں کے بعض دانشور اور صاحب الرائے لوگوں نے دعوے سے ثابت کر کے مثالیں پیش کی ہیں اور ان کے دعویٰ کے مطابق ترقی یافتہ اقوام خصوصاً انگریزوں نے اس خطے سے کئی چیزوں کو مستعار لیا ہے۔ مثلاً یہاں کے جرگہ کی تقلید میں بین الاقوامی سطح پر اقوام متحدہ کا قیام عمل میں آیا۔ اس خطے میں "لویہ جرگہ" (مختلف قبائل کے اکابرین کا آپس کی لڑائی روکنے کے لیے ایک جگہ جمع ہونا) کو قومی اسمبلی کی صورت میں اپنایا گیا۔ "مرکہ" جو علمی بحث و مباحثہ ہوتا ہے، کو دورِ جدید کے سیمینار کی صورت میں رائج کیا گیا۔ خطے میں موجود "پناہ دینے" کے رواج کو بین الاقوامی طور پر جنگ سے متاثرہ اقوام کو پناہ گزین بنانے کے حوالے سے اپنایا گیا۔ ننواتے میں پشیمانی اور اعترافِ جرم کو اقوامِ عالم نے Apology کی صورت میں اپنایا اور سب سے بڑھ کر علاقائی مزاحمت "داڑہ" کو پوری دنیا میں مظلوم و حریت پسند اقوام نے "گوریلا جنگ" کی صورت اپنایا ہے۔ پروفیسر بدرالحکیم حکیم زئی اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> "آج کی ترقی یافتہ دنیا نے عالمی سطح پر اپنے تنازعات اور معاملات حل کرنے کے لیے جرگہ ہی کی طرف رجوع کیا ہے۔ جس کا بنیادی تصور انگریز یہاں سے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ موجودہ اقوام متحدہ افغان جرگہ کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ اسی طرح ہمارے "لویہ جرگہ" نے آج کی قومی اسمبلی کی شکل اختیار کرلی ہے

-------------"تیگہ "جو صلح کی خاطر وقت نکالنے کے لیے عارضی طور پر جنگ بندی کا نام ہے آج اقوام متحدہ عارضی جنگ بندی یاceasefireکے نام سے یہی اصول اپناتی ہے۔"(۸)

مختصر بات یہ ہے کہ پشتونوں کے تصور کو آج تک جس چیز نے جلا بخشی ہے، جس چیز نے ان کے درمیان محبت اور بھائی چارے کو فروغ دیا ہے، جس نکتے نے ان کو باہمی اتفاق اور اتحاد عطا کیا ہے اور جس تصور نے ان مختلف نسلوں کے لوگوں کو ایک باپ دادا کی اولاد بنا دیا ہے اس کا نام ''پشتو یا پشتونولی'' ہے۔ خیبر پختون خوا کی تہذیب کے حوالے سے یہ کہا جاتا ہے کہ اس کی قدامت پانچ ہزار سال پرانی ہے۔ پشتون قوم اپنی تہذیب کی اس قدامت پر بڑا فخر کرتی ہے۔ قدامت کے اس رومان نے ایک طرف پشتونوں میں افتخار کے بہت سارے اسباب پیدا کیے ہیں تو دوسری طرف پشتونوں میں ماضی پرستی بھی پیدا کی ہے۔ اس لیے ہر پشتون اپنے باپ دادا کے کارناموں کو بیان کرتا رہتا ہے اور اس تصور سے جلا پانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ پشتون کلچر نے اپنی ابتدائی شناخت برقرار رکھی ہے حالانکہ برّصغیر پر حملہ آور ہونے والی اقوام درہ خیبر کے راستے وارد ہوئیں۔ اس سرزمین پر بڑی بڑی تہذیبیں ایک دوسرے سے سر ٹکراتیں رہی اس وجہ سے اس خطے میں مختلف نسلوں کا ملاپ غیر معمولی پیمانے پر ہوتا رہا۔ اس کا نتیجہ ایک ایسے کلچر کی صورت میں نکلا جس میں بڑا تنوع تھا اور جس میں اتنی توانائی تھی کہ غیر ملکی عناصر کو بھی اگرچہ قبول کر لیا لیکن ساتھ ہی اپنے منفرد مقامی عناصر کو بھی برقرار رکھا اور اپنے اصل کلچر کی بڑی سختی کے ساتھ مدافعت اور حفاظت کی۔

پشتونولی کی اصطلاح میں بھی بڑی ہمہ گیری اور ہمہ جہتی پائی جاتی ہے۔ یہ لفظ پشتونوں کی پوری طرزِ زندگی کا احاطہ کرتا ہے اور جب تک اس لفظ کے مفہوم کو نہیں سمجھا جاتا اس وقت تک کوئی پشتون قوم کے مزاج اور طرزِ فکر و احساس اور طرزِ زندگی کو نہیں سمجھ سکتا۔ اگرچہ یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی پشتون معاشرے میں کسی ایک شخص میں ان سب عناصر کا مجتمع ہونا ممکن نہیں۔ لیکن جس طرح اسلام مسلمانوں سے اسلام کے اصولوں کے عین مطابق زندگی گزارنے کا تقاضا کرتا ہے اسی طرح پشتونولی تمام پشتونوں سے ان عناصر کی موجودگی کا تقاضا ضرور کرتی ہے۔ جس شخص میں پشتونولی کے عناصر کی جتنی کمی ہوتی ہے اسے اتنا ہی پشتونولی سے دور سمجھا جاتا ہے اور اسے معاشرے میں مختلف قسم کے طعنوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگرچہ مختلف علاقوں کے پشتونوں کی عادات و اطوار اور رسوم و رواج میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ لیکن یہاں ان اقدار، عادات و اطوار اور رسم و رواج اور ایسے دوسرے تہذیبی و ثقافتی عناصر کو پیش کیا جائے گا جو تمام پشتونوں میں مشترک ہیں اور جو پشتونولی کے بنیادی عناصر سمجھے جاتے ہیں۔

د۔ خیبر پختون خوا کی دیہی معاشرت کے بنیادی رویےّ

i۔ تہذیبی رویےّ:

تہذیب کسی واحد عمل کا نام نہیں ۔یہ عبارت ہے معاشرے کی پوری سوچ اور عمل سے کہ جس میں ادب، فن، مذہب، سائنس اور سیاست سبھی سے مرتّب ہوئے ہیں۔ یہاں دو قسم کے روّیوں کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ایک روّیہ تواُن لوگوں کا ہے جو معاشرت کو صرف مادی حقیقتوں میں دیکھنے کے عادی ہیں اور بس یہی تک اپنے آپ کو محدود کیے ہوئے ہیں۔ان کے نزدیک خیبر پختون خوا کی تہذیب وہی ہے جو اس سر زمین کی تہذیب ہے جو قدیم روایات سے پھوٹی اور یہاں کی علاقائی روایات میں رچ بس گئی۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہ لیجئے کہ اس مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے صرف زمینی اور علاقائی رشتوں میں یقین رکھتے ہیں اور ان سے بلند نہیں ہو پاتے۔ دوسرے طرف وہ لوگ ہیں جو علاقائی تاریخ کو اس قدر اہمیّت نہیں دیتے کہ وہ تہذیبی ڈھانچے میں بنیادی حیثیّت اختیار کرلے۔ان کے نزدیک معاشرے کی تاریخ روحانی اقدار سے وجود میں آتی ہے اور جو کسی مخصوص علاقے تک محدود نہیں ہوتی بلکہ جغرافیائی اور نسلی حد بندیوں سے بلند ہوتی ہے۔ لہٰذااس معاشرے کی تہذیبی جڑیں اس آفاقی معاشرے میں ہیں جو اسلام کی اخلاقی اور روحانی اقدار سے وجود میں آیا۔اس مکتبہ فکر کے اصحاب کے یہاں زمینی رشتے صرف اُسی حد تک اہم اور قابل قبول ہیں جس حد تک وہ مذہبی وروحانی اقدار سے موافقت رکھتے ہیں،ان سے باہر جو شے بھی ہے اس کی ایک تاریخی حیثیّت تو ہو سکتی ہے مگر وہ اس معاشرے کے اجتماعی تجربے کا حصّہ نہیں۔ان متضاد رویّوں کے ٹکراو سے تہذیبی تشخّص کا مسئلہ مبہم ہو تا چلا گیا ہے۔ پس یہاں تہذیبی شخصیّت دراصل ان دونوں انتہاوں کے کہیں درمیان ہی میں اپنا وجود رکھتی ہے۔ خیبر پختون خوا کے اکثر اُردو افسانہ نگاروں نے اپنے تخلیقات میں اس بات کا تاثر دیا ہے کہ یہاں کے باسیوں کو اپنے علاقائی روایات سے جڑے رہنا اور اُن اقدار کی حتی الوسع پاس رکھنا چاہئے جو نسل در نسل اور صدیوں پرانے ہیں۔

''پگڑی'' طاہر آفریدی کا ایک ایسا افسانہ ہے کہ جس میں پشتون تہذیب و معاشرت کی ایک نمایاں خوبی غیرت و حیا کو موضوع بنایا گیا ہے۔افسانے کا پورا ماحول قبائلی ہے۔ جہاں پر لڑکے اور لڑکی کی محبت شجر ممنوعہ ہے۔ مگر آنچل کی بکل میں جب محبت سر اُٹھاتی ہے۔ تو گلنار اپنے محبوب افضل کے ساتھ مرنے جینے پر تیار ہو جاتی ہے۔اور جب وہ دونوں ایک دوسرے کی زندگی کے ساتھی بننا چاہتے ہیں۔ تو قبائلی معاشرہ گلنار کے والد کے روپ میں اس کی اجازت نہیں دیتا۔ یہاں اگرچہ وہ دوسروں کے مسائل جرگہ کے ذریعہ حل کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اپنی بیٹی کے معاملے میں صلاح و مشورے اور بیٹی کے خواہش دونوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ نتیجتاً گلنار اور افضل دونوں بغاوت پر کمربستہ ہو جاتے ہیں۔اور یہ فیصلہ

کرتے ہیں کہ بھاگ جائیں گے ۔ چنانچہ طے شدہ پروگرام کے مطابق جب وہ بھاگ رہے ہوتے ہیں تو اچانک گلنار رُک جاتی ہے اور آگے بڑھنے کا ارادہ ملتوی کر دیتی ہے۔ افضل اس پر حیران رہ جاتا ہے لیکن گلنار جواب دیتی ہے کہ

"مجھے چھوڑ دو میں ۔۔۔۔۔ میں تمہارے ساتھ نہیں چل سکتی ۔میں واپس جارہی ہوں۔گلنار نے روک کر کہا۔یہ آخر تمہیں کیا ہو گیا۔افضل نے اس سے پوچھا۔میرے باپ کی پگڑی میرے پیروں میں اُلجھ گئی ہے۔اور گلنار افضل کو چھوڑ کر گھر کی طرف دوڑنے لگی۔"(۹)

ایک طرف محبت ہے اور دوسری طرف اپنے والدین کی عزّت و ناموس،ہزاروں سالہ پرانے روایات اور تہذیبی اقدار ،جو بالآخر محبت پر غالب آجاتے ہیں۔ یہاں اس بات کی نشاندہی کی گئی ہے کہ پشتون دوشیزہ ہر صورت میں اپنے خاندان کی عزّت و ناموس کی امین ہوتی ہے ۔اور اس کے خاطر وہ جان بھی دے سکتی ہے پشتونوں کی دستار (پگڑی) کپڑے کا ایک ٹکڑہ ہی نہیں بلکہ یہ ہماری تہذیب و ثقافت کی علامت اور عزّت و وقار کی نشانی ہے ۔ غیرت پشتون ثقافت اور معاشرت کا لازمہ ہے ۔ خیبر پختونخوا کے اُردو افسانہ نگاروں نے اس کے مختلف پہلوں کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے ۔افسانہ "روایت" میں افسانہ نگار نے غیرت کے اُس پہلو کو پیش کیا ہے جو کہ عموماً ہمارے آنکھوں سے اُجھل رہتا ہے ۔افسانہ نگار نے پختون معاشرت اور اس میں روایت پزیر پشتونوں کے بے جا ضد اور جہالت پر مبنی رویوں کے ساتھ ساتھ اُن اقدار اور پشتونولی کی اصل روح پر مبنی مثبت روایات کو بھی تشت از بام کیا ہے جو کہ اس معاشرت کی اصل روح ہیں ۔اس افسانے میں کبیر خان اپنے پرانے بغض و عداوت کو پانی کا بہانہ بنا کر جلال خان کے جوانسال بیٹے کو قتل کر کے فرار ہو جاتا ہے ۔ لیکن اس کے بر عکس پختون روایات سے باخبر اور پشتونولی کے اصل روح سے واقف جلال خان اپنے کارندوں کو بھیج کر کبیر خان کے بیٹے کو سکول سے اپنے گھر لے آتا ہے بر خلاف توقع اسے بحفاظت کبیر خان تک پہنچا دیتا ہے۔ بھولے بسرے پشتون روایات کو افسانہ نگار نے کچھ یوں بیان کیا ہے۔

"یہ ہماری روایت نہیں ہے۔میں نے تو اس کو سکول سے اس لیے اٹھایا کہ کہیں کبیر خان کا کوئی اور دشمن وراثت کا کوئی اور دعویدار موقع سے فائدہ نہ اٹھائے اور کبیر خان کے بیٹے کو قتل نہ کر دے ۔میں اپنے جوان بیٹے کا غم اور لوگوں کے طعنے ساری عمر اٹھا کر جی سکتا ہوں مگر یہ طعنہ نہیں کہ جلال خان کتنا بے غیرت تھا کہ اس نے نابالغ سے انتقام لیا۔میں کبیر خان کو تو معاف کر سکتا ہوں۔ مگر اگر میرے ہاتھوں اس بچے کا ایک بال بھی ضائع ہوا تو میں اپنے آپ کو کبھی بھی معاف نہ کر پاؤں گا۔"(۱۰)

افسانہ نگار نے خیبر پختونخوا کے دیہی معاشرت کی بہترین عکاسی کرتے ہوئے مثبت اور منفی رویوں کو پیش کیا ہے۔ یہاں عام طور پر بدلہ لینے کے لیے مد مقابل کے خاندان کے کسی بھی فرد کو حتٰی کہ بچوں تک کو نشانہ بنایا جاتا ہے

لیکن حقیقی پشتونولی میں یہ فعل بزدلی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کبیر خان نے جلال خان کے جوانسال بیٹے کو قتل کر کے اپنی انا اور جھوٹی شان کی تسکین کی لیکن جلال خان نے حقیقی روایت پرست پشتون کا شیوہ اختیار کر کے اپنے دشمن کے بیٹے کو صحیح سلامت اس تک پہنچا دیا۔ سلیم راز پشتون تہذیب و ثقافت کو اُجاگر کرنے پر مصنّف کو داد دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"پختون معاشرے کی ایک خوبصورت روایت کو مصنف نے فنکارانہ حُسن کاری سے ایک مختصر کہانی کا روپ دے کر پختون کلچر کے ایک مثبت وصحت مند سماجی رویے کو ادبیات کا حصّہ بنا دیا ہے۔ قتل، انتقام اور دشمنی کے لامتناہی سلسلوں نے پختون معاشرے اور کلچر کو کمزور اور بدنام کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ قومی سطح پر اس قوم کو باہر کی کسی قوت یا غیر اقوام نے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ بلکہ اس کو اپنے اندر کی قبیلوی دشمنی اور جھوٹے خاندانی وقار نے کھوکھلا کر کے کمزور اور برباد کر دیا ہے۔ اور انہیں آج بھی اس قول پر ناز ہے کہ:

"سو سال بعد بھی اگر دشمن سے بدلہ لے لیا جائے تو اسے دیر سے تعبیر نہیں کیا جاتا بلکہ کہا جاتا ہے کہ جلدی کر دی گئی ہے۔۔۔۔"

یہ کہانی ایک ایسے طاقتور دشمنی کے آداب کے پاسدار پختون مشر کے کردار کی ایک جھلک ہے۔ جس کا جوان سال بیٹا قتل کر دیا گیا ہے۔ مگر اس نے انتقام کے جوش میں اندھا ہونے کی بجائے ہوش سے کام لے کر ایک انوکھا فیصلہ کیا۔ جو سب کے لیے باعث حیرت اور ایک بڑا سوالیہ نشان تھا۔ مگر اس سلجھے ہوئے انسان اور ہوشمند باپ نے اپنے کردار سے پختونوں اور پختونولی کی ایک ایسی روایت کا اعادہ کیا، جس کا مظاہرہ بہت کم دیکھنے اور سننے میں آتا ہے۔"(۱۱)

خیبر پختون خوا کے اکثر اردو افسانہ نگاروں کے تخلیقات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ہمیں اُن علاقائی روایات کے وجود کو بھی تسلیم کرنا ہوگا جو زمانے کی دست و برد کے باوجود ابھی تک اپنے آپ کو زندہ رکھے ہوئے ہیں اور اُن روحانی و اخلاقی اقدار کو بھی تسلیم کرنا ہوگا جو مادی صورت میں تو نظر نہیں آتے مگر اس معاشرے کے اجتماعی شعور کو ترتیب دیتی ہیں اور جن کے دم سے ان کے طرز فکر اور طرز عمل کی نشاندہی ہوتی ہے۔

ii۔ اخلاقی رویےّ:

ادب کا موضوع انسانی زندگی ہے۔ زندگی اپنے مختلف پہلوں کے ساتھ اصناف ادب میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ افسانہ زندگی کے کسی ایک پہلو کی عکاّسی کرتا ہے۔ جہاں تک افسانے کے موضوعات کا تعلق ہے تو سب افسانہ نگار روح عصر کے تابع نظر آتے ہیں وہ نہ صرف زندگی کے مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں بلکہ عصری زندگی سے وابسطہ حوادث، رویوّں اور

وقوعات کا تجزیہ بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ خیبر پختون خوا کا افسانہ اس معاشرے کا آیئنہ دار ہے۔اس میں معاشرے کے داخلی تضادات اُجاگر کئے گئے ہیں اور فرد کی کرداری منافقت واضح کی گئی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ معاشرتی ،علاقائی اور قومی رویّوں کو بھی اُجاگر کیا گیا ہے۔ ہر زمانے میں افسانہ نگاروں نے اپنے معاشرتی ناہمواریوں، ظلم وجبر کے داستانوں اور معاشرت کی حسن و قبیح کو اپنے اسلوب وانداز میں اجاگر کئے ہیں۔ اپنے عہد کے وہ صداقتیں،وہ حقیقتیں، بے چینیاں، معاشرتی رویّے اور معاشرے کا مجموعی اخلاق جن کی طرف ہمارا ذہن منتقل ہوتا رہتا ہے۔ان سب کو بیان کر کے قاری پر واضح کرنا ہر اچھے لکھاری کا فرض ہے۔ اب جس حد تک اس کا فنّی شعور پختہ ہوتا ہے تو زندگی اس حد تک اسی کی گرفت میں آتی ہے۔اس حد تک وہ معاشرے کے نبض کو ٹٹول کر اس معاشرت اور تہذیبی اقدار کا باریک بینی سے مشاہدہ کر کے اپنے تخلیقات میں قاری کے لیے پیش کرتا ہے۔ اس دوران ادیب معاشرتی رویّوں اور مجموعی اخلاقیات کو بہ نظر غائر دیکھ کر بیان کرتا ہے۔احتشام حسین کی رائے میں:

"ہر اچھا افسانہ نویس زندگی کے جن پہلوں کو سمجھ سکتا ہے ،جن پہلوں کا اسے تجربہ ہوتا ہے انہی کو اپنے افسانوں کا مرکزی موضوع بناتا ہے۔"(۱۴)

سب سے پہلے جو چیز ایک ادیب کو متاثر کرتی ہے وہ اُس عہد کے تہذیبی،اخلاقی اور فکری میلانات ہیں۔ خیبر پختون خوا کے اردو افسانہ نگاروں نے اپنے تہذیبی اور معاشرتی اقدار کو ذہن نشین رکھ کر اس کا معاشرے میں نہایت باریک بینی سے مشاہدہ کر کے تہذیبی،اخلاقی اور قومی رویّوں کو اپنے تخلیقات میں بیان کیا ہے۔ خیبر پختون خوا کے اُردو افسانوں میں افلاس، بھوک اور جنگ جیسے آفاقی موضوعات بھی موجود ہیں۔ غربت و مفلسی زندگی کی ہر بہار کھو دیتی ہے اور مرد کا اعتبار بھی۔ انسان کو اپنے خالق حقیقی سے دور کر دیتی ہے۔ اپنے رشتہ داروں اور قرابت داروں کی مدد کرنے کے قابل نہیں چھوڑتی۔ غموں،لامتناہی پریشانیوں اور ذہنی تفکرات کا ذریعہ بن جاتی ہے انسان کی جمالیاتی قدروں کے ساتھ اس کے اخلاقی اقدار کو بھی متزلزل کر دیتی ہے۔اور بلآخر یہی انفرادی پریشانیاں پوری معاشرتی پریشانی کی شکل اختیار کر کے مجموعی معاشرتی اخلاق پر اثر انداز ہوتی ہے۔ خیبر پختون خوا کے اردو افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں انہیں اخلاقی رویّوں کو اُجاگر کیا ہے۔روایت پرست پختون اگرچہ ضدی، سخت گیر، اورانا پرست ہوتے ہیں لیکن اتنے خدا ترس اوررحم دل بھی ہوتے ہیں۔ ظالم کے خلاف ڈٹ جانا اور مظلوم کی حمایت میں اپنے اپ کو خطرے میں ڈالنا پشتونوں کی پشتونولی کا حصہ ہے۔ پشتونولی کی پاسداری کرنے والا پشتون اپنے اپ کو پشتون کہلوانے پر فخر محسوس کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افسانہ "گل سانگہ "میں مرکزی کردار گل سانگہ سے پروفیسر شکیل پختونوں کے اوصاف کے بارے میں کچھ یوں بات کرتے ہوئے کہتے ہے:

"ہاں۔ گل۔ پختون وفاداری پر ایمان لاتے ہیں جو ایک عظیم اور مکمل صفت ہے۔ "ننگ و غیرت" قسم کے اوصاف ان کے مزاجوں میں ایک انتہا پسندی کا درجہ پیدا کرتے ہیں۔ جو بڑائی کی دلیل ہے۔ "پت" بھی ان کے اوصاف کا ایک جز ہے جو اس مطلب میں استعمال ہوتا ہے جیسے کسی کے سامنے شرمندہ نہ ہونا۔ منہ کالا نہ ہونا۔ جھک نہ جانا وغیرہ۔ یہ صفت بھی کردار کی مضبوطی کا پتہ دیتی ہے۔ "تورہ" یعنی تلوار کا مطلب صرف تلوار ہی نہیں بلکہ تلوار سے مراد ان کی دلیری اور بے باکی سے ہے۔ کسی نیک کام کو تکمیل تک پہنچانا بھی اسی صفت کے اندر آتا ہے۔ دشمن سے بدلہ لینا، اپنے وطن کی حفاظت کرنا، ان حفاظتی تدابیر میں بھی یہ "تلوار" کے لفظ کو استعمال کرتے ہیں اس کے علاوہ کسی کو اخلاقی شکست دینا بھی اسی "تورہ" سے موسوم کرتے ہیں۔"(۱۳)

پشتون معاشرے میں لوگوں کا مجموعی رجحان سچائی کی طرف ہے جھوٹ، دھوکہ دہی کو مکاری اور بزدلی سے تعبیر کرتے ہیں اور اس عمل کو قبیح گردانا جاتا ہے۔ پشتونولی کے دعویدار ہر شخص کو کھرا، سچا اور راست باز ہونا پڑتا ہے۔ قول و فعل میں تضاد، مکر و فریب اور منافق شخص کبھی بھی سچا اور کھرا پختون نہیں ہو سکتا۔ طاہر آفریدی نے اپنے افسانے "زبان بے زبان" میں مثال خان کو اس معاشرے کا وہ مثالی نمونہ پیش کیا ہے جو کہ بچپن سے سچ بولنے کا عادی اور جھوٹ سے سخت نفرت کرتا ہے۔ وہ کڑے سے کڑے وقت میں بھی زبان درازی، بے ادبی گستاخی اور سرکشی کا الزام قبول کر لیتا ہے مگر بے زبان ہونے کا مجرم بننے کو تیار نہیں ہوتا۔ اس کی راست بازی اور سچائی خان کو ایک آنکھ نہ بھاتی اور مثال خان کے بوڑھے باپ کو خان نے بارہا متنبہ کیا تھا کہ اپنے بیٹے کو سمجھاو۔ بچپن سے باپ کے دیے ہوئے سچائی کے سبق پر اپنے بابا کی پشیمانی اور مجبوری و لاچاری کو مثال خان نے محسوس کیا تھا افسانہ نگار نے کمال مہارت کے ساتھ ان حالات کو بیان کیا ہے۔:

"اسے محسوس ہوا کہ جیسے باپ کے جھریے دار چہرے پر پڑی ہوئی لکیروں کو زبان مل گئی ہو اور وہ کچھ بول رہی ہوں۔ "تم نے ایک مرتبہ جھوٹ بولا تھا۔ اور اپنے شفیق باپ کے بے رحم تھپڑ کی جلن اپنے رخساروں پر اب تک محسوس کر رہے ہو۔ مگر تمہارا ہر سچ تمہارے باپ کے دل پر ایک نیا زخم لگاتا ہے۔ یہاں جھوٹ بولنا ہی سب سے بڑی سچائی ہے مگر تم سچ بول کر اپنے بوڑھے باپ کی آخری عمر میں زہر بھر رہے ہو۔ جہاں جھوٹی زبانیں ہوں، جھوٹی باتیں ہوں اور جھوٹے چہرے ہوں وہاں زہر کے بھرے پیالے کا ذائقہ سچی زبان ہی کو چکھنا پڑتا ہے۔ لکیریں کہہ رہی تھی۔"(۱۴)

خان کے بیٹے کا غریب کسان کی بیٹی سے دست درازی اور جرگہ کے سامنے گواہی دینے کے پاداش میں مثال خان اور اس کے بوڑھے باپ کو نشان عبرت بنانے کی خان کی دھمکیوں پر وہ اور ڈٹ کر کھڑا ہو گیا اور کسی صورت گواہی سے

باز رہنے پر تیار نہ تھا لیکن باپ کی مجبوری ولاچاری اور بڑھاپے کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہوئے بالآخر جھوٹ بولنے کی بجائے اپنی زبان کاٹنے کا فیصلہ کیا جھوٹ کے اندھیرے کی ہمنوائی کرنے کی بجائے وہ اپنی زبان کاٹ کر ہمیشہ کے لیے سچائیوں کی مشعل روشن کر دیتا ہے۔

iii۔ قبائلی رویے:

قبائلیت معاشرتی ارتقا کا کوئی ایسا مرحلہ یا سماجی نظام نہیں ہے کی جس سے صرف پشتون قوم ہی کو واسطہ پڑا ہو بلکہ دنیا کے تمام اقوام، ترقی یافتہ اقوام ہوں یا ترقی پذیر، اپنے سماجی ارتقا کے سفر میں قبائلیت سے ہو کر آگے بڑھے ہیں۔ سماج کبھی ساکن و جامد نہیں ہوتا بلکہ مسلسل تبدیلی کے عمل سے گزر رہا ہوتا ہے۔ قبائلیت سماجی ارتقا کے سفر میں ایک ابتدائی پڑاو ہے جسے دنیا کے بیشتر اقوام سماجی ارتقا کے سفر میں صدیوں پہلے پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ پشتون قوم سمیت دنیا کے بعض دیگر پسماندہ اور خطہ ہا میں قبائلیت اور اس کی باقیات کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں۔ ماہرین کے خیال میں قبائلیت کا یہ دور انسانی ارتقا میں دس ہزار سال پہلے کی کہانی ہے۔ جہاں تک خیبر پختون خوا کے قبائلی علاقوں کا تعلق ہے اس کا جنم بھی برطانوی سامراج کے عہد میں ہوا۔ زمین کے اس ٹکڑے کو افغانستان سے کاٹ کر برطانوی ہندوستان میں مدغم کرنے کی بجائے اس کو نیم ریاستی انتظام کے تحت رکھا گیا اور اس کو یاغستان، علاقہ غیر اور قبائلی علاقوں جیسے غیر مہذب ناموں سے پکارا گیا۔

نو آبادیاتی دور کے مصنفین، بالخصوص الف کیرو نے "دی پٹھان" کے ذریعے ان پشتونوں کا ایک سامراجی بیانیہ تراشہ جس میں ان کو غیر مہذب، غیر انسانی، جنگجو، آزاد اور ڈاکو قرار دیا۔

> "زیادہ تر پہاڑوں میں بسر کرنے والے یہ اجڈ و جاہل لوگ انہی پتھروں کی طرح سخت اور کھر درے ہو گئے ہیں، ان کی معاشرت اور بود و باش عام انسانوں سے کہی زیادہ مختلف ہیں۔"(۱۵)

اس علاقے کو تزویراتی مقاصد کی خاطر کام میں لانے کے لیے نجی لشکروں کی سہولت کی خاطر یہاں کے لوگوں کو اقتصادی اور سیاسی لحاظ سے پسماندہ رکھنے کی کوشش کی گئی۔ پہلے زار روس کے خلاف اور بعد میں سویت یونین کیخلاف خیبر پختون خوا کے قبائلی علاقوں کا استعمال کیا گیا۔ برطانوی سامراج کے اقتدار کا سورج غروب ہونے کے بعد پاکستان نے اس کی یہی حیثیت بر قرار رکھی۔ پاکستان کے آیئن میں بدنام زمانہ فرنٹئر کرائمز ریگو لیشن (ایف سی آر) کو بر قرار رکھا گیا۔ ایف سی آر کے تحت قبائلی علاقہ جات کو پاکستان اور دوسرے مہذب دنیا کے عدالتی، سیاسی اور انتظامی ڈھانچے سے باہر رکھا گیا اور فاٹا میں رہنے والوں کو صرف بندوق برداری، منشیات فروشی اور اغوا کاری کے لیے آزاد چھوڑ دیا گیا۔ خیبر پختون خوا کے اردو افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں یہاں کے قبائلی نظام معاشرت اور قبائلی رویّوں کو خوبصورت انداز میں بیان کیا

ہے اور نہایت باریک بینی سے مشاہدہ کر کے اس معاشرتی رویّوں کے محاسن و معائب سے قاری کو آگاہ کیا ہے۔ خیبر پختون خوا کے قبائلی علاقوں میں پدر سری نظام کی جڑیں بہت مضبوط ہیں اور اس نظام کے تحت انتہائی غیر انسانی اور غیر اخلاقی رسوم رواج پذیر ہیں خصوصاً خواتین کے ساتھ روا رکھے گئے سلوک اخلاقی پستی کے حدوں کو پار کر دیتی ہیں کم عمری کی شادی، اسلامی اصولوں کے بر خلاف عورت ورثے میں جائداد کی حق دار نہیں اور انہی روایات کے بدولت عورت کے ذات کے ساتھ جڑے ہر قسم کی معاشرتی حصہ داری سے مستثنیٰ قرار پاتی ہے۔ عورت مرد کے اجازت کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتی۔ قبائلیوں کے سخت اور عورت کے معاملے میں بالخصوص کرخت و عورت بیزار سوچ کے پیچھے ان نیم مذہبی ملاؤں کا کردار بھی ہے جنھوں نے ان آیات قرآنی و آحادیث مبارکہ کا اپنی مرضی کے مطابق تشریحات کی اور ان سادہ لوح دیہاتیوں کی ذہنیت کو انتہا پسند اور عورت بیزار بنایا جبکہ ان نام نہاد مولویوں نے عورت کے اسلامی حقوق اور معاشرتی ترقی میں ان کے مثبت کردار والے اسلامی اصولوں کو ان لوگوں سے اُجھل رہنے دیا۔ یوں ابتداء اسلام سے عورتوں کو عطا کردہ حقوق یہاں کے جہالت اور مذہبی انتہا پسندی کے ہتھے چڑھ کر ان سے محروم رہیں۔ یہاں کا قبائلی معاشرہ ایسی روایتی جکڑ بندیوں کا شکار رہا کہ بعض بے جا قدغنیں نفسیاتی عوارض کو جنم دینی لگی طاہر افریدی نے اپنے افسانے "ریت بگولے" میں ایک ایسی ہی روایت کا ذکر کیا ہے کہ جس کے تحت مزمل اپنے والدین کے اکلوتے ہونے کے بنا کوئی ان کو اپنے بیٹی دینے کو تیار نہیں کہ کل کلاں اگر وہ نہ رہے تو ان کی بیٹی کا کیا ہو گا ان کا تو کوئی اور بھائی بھی نہیں جو ان کو رکھے گا۔

> "اگر مزمل خان کا دوسرا بھائی ہوتا تو گاؤں والے اپنی لڑکیوں کو ایک اشارے پر ڈولی میں بٹھا دیتے۔ مال و جائداد اس کی گاؤں میں سب سے زیادہ تھی۔ مگر یہی عیب کیا کم تھا کہ وہ اکیلا تھا اور گاؤں والے مال کے ساتھ یہ بھی دیکھتے ہیں۔ وہ ٹوپیوں کو ہی نہیں سروں کو بھی دیکھتے ہیں کہ جب سر ہوں گے تو ٹوپیاں بہت (۱۶)"

اس تمام بحث سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ پاکستان کے اندر قبائلیت اور قبائلی علاقے کے رہنے والے دو مختلف چیزیں ہیں۔ قبائلی علاقوں یا سابقہ فاٹا میں رہنے والے اتنے ہی مہذب اور اتنے ہی خوئے حکمرانی سے آشنا ہیں جتنے پاکستان کے دوسرے علاقوں میں رہنے والے لوگ۔ جبکہ قبائلیت ایک خاص دور کے سماجی ارتقا کا پڑاو ہے جو کبھی کا گزر چکا ہے۔ دہشت گردی کی پیچیدگی کو قبائلیت اور پھر فاٹا میں رہنے والے لوگوں کے مزاج کا شاخسانہ قرار دینے سے اس مسئلے میں مزید اُلجھاو پیدا ہو گا۔

iv۔ قومی رویےّ:

پاکستانی معاشرہ بالعموم اور اور خیبر پختون خوا باالخصوص اس وقت جن مسائل سے دوچار ہے،ان میں جہالت وکم علمی کی وجہ سے انتہا پسندی اور اسی کے بنا دہشت گردی قابل ذکر ہیں ۔اسلام کے نام لیوا اور متوالے ہونے کے باوجود ہم نے اسلامی اصولوں اور روا داری و بردباری کو پس پشت ڈال رکھا ہے بلکہ انتہا پسندی میں ہم بحیثیت قوم اس قدر غرق ہو چکے ہیں کہ تحمل مزاج و بردبا شخص ہمیں بے وقوف و بزدل دکھائی دیتا ہے۔عام آدمی تو درکنار اہل علم اور اچھے بھلے دانشور حضرات بھی ایسی لاحاصل مباحثوں میں اُلجھ چکے ہیں کہ جس نے یہاں کے باسیوں کا قومی تشخص بگاڑ کے رکھ دیا ہے۔ قومی ناؤ کو گرداب سے نکالنے کے لیے اس معاشرے کے مختلف طبقات باالخصوص اہل علم و فن کو اپنا کردار ادا کرنا ہو گا۔اس سلسلے میں اگر ہم خیبر پختون خوا کے افسانہ نگاروں کے تخلیقات پر نظر دوڑائے تو پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے کماحقّہ اپنا کردار ادا کیا ہیں۔ معاشری کو بگاڑ سے بچانے اور راہ مستقیم پر ڈالنے کے لیے نہ صرف معاشرے کا اصل چہرہ قاری کے سامنے طشت ازبام کیا ہے بلکہ حتی الوسع بگاڑ کا حل بھی پیش کیا ہے۔

پشتونولی کے زریں اصولوں اور روایات کو پس پشت ڈال کر اپنے تہذیب وثقافت کو بھول کر مادیت کا شکار ہونے والا یہ معاشرہ ٹوٹ پھوٹ اور بگاڑ کی طرف گامزن ہے۔مادیت پسندی ہی کی وجہ سے یہاں ایسے کردار جنم لے رہے ہیں جن کے لیے انسانیت اور پشتونولی کی کوئی وقعت نہیں۔ افسانہ "ترپ چال" میں ایسی ہی لعنتی اور بدنما کرداروں کی چہروں سے نقاب کشائی کی گئی ہیں ۔ان کے کردار و افعال جو کہ پشتون معاشرت پر بدنما داغ ہے کو قاری کے لیے وا کیا گیا ہیں۔اس افسانے کا "عزیز " جو کہ جعلی ڈگریاں اور اعزازات وانعامات دکھا کر معاشرے کے ایک معزز گھرانے میں شادی کرلیتا ہے اور کچھ عرصہ گزرنے کے بعد نہ صرف بیوی کا جہیز بلکہ سسرال میں موجود سامان کا صفایا کر کے غائب ہو جاتا ہے۔

> " صبح صبح گھر والے گاؤں سے واپس پہنچے تو گھر کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا پہلے تو انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا کہ اپنے ہی گھر میں داخل ہوئے ہیں یا کسی پرائے گھر میں گھس گئے ہیں۔ پھر دو چار چیزیں دیکھ کر یقین ہوا کہ اپنا ہی گھر ہے۔ لیکن عزیز میاں اور ان کے ملازم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟ گھر کھلا ہوا تھا لیکن کسی کمرے میں بھی انسان تھا نہ کوئی سامان۔ سیف بھی کھلا پڑا تھا اور تمام قیمتی سامان بھی غائب تھا۔ "(۱۷)

معاشرتی نبض کو ٹٹول کر افسانہ نگار نے اس کے بگاڑ اور دوغلے پن کو واضح کیا ہے کہ کس طرح اس معاشرے میں عزیز جیسے دھوکہ باز فریبی و دغہ باز موجود ہے تو دوسرے طرف عاشی کی والدین بلا جھجک دولت اور نمود کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بحیثیت قوم اخلاقی پستی کے ایسے حدوں کو چھو رہے ہیں کہ جہاں حلال و حرام، جائز و ناجائز کی تمیز بالکل ختم ہو

گئی ہے اسلام اور پشتونولی کے اعلیٰ اقدار کو پس پشت ڈال رکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام رویے اجتماعی طور پر جنم لیتے ہیں، لیکن انہیں ختم کرنے کے لیے ہمیں انفرادی رویّوں پر بنیادی اکائیوں میں کام کرنا ہو گا اور اسلام کے بنیادی تعلیمات کو عام اور قابل عمل بنانا ہو گا۔ تاکہ دین اور پشتونولی کی عطا کردہ روایات کا پاس رکھ کر اسلاف کے اُمنگوں اور رضائے الٰہی کے حصول کے لیے امن و آشتی پر مبنی معاشرے کی تشکیل کر سکیں۔

حوالہ جات

۱. فارغ بخاری، ادبیات سرحد، نیا مکتبہ، پشاور، ۱۹۵۵ء، ص:۴۹۴

۲. پریشان خٹک، پشتون کون؟، پشتو اکیڈمی، یونیورسٹی آف پشاور، ۲۰۰۵ء، ص:۷۶

۳. گورنمنٹ پریس، این، ڈبلیو، ایف، پی، ۱۹۸۱ء، ص:۱۶

۴. ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، ص: ۵۴

۵. حکیم زے، بدرالحکیم، پشتونولی، ضیاء سنز پرنٹرز، پشاور، ۲۰۰۴ء، ص: ۳

۶. قاری جاوید اقبال، ثقافت سرحد تاریخ کے آئینے میں، لوک ورثہ، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص:۳۵۹

۷. راج ولی شاہ خٹک، پروفیسر، ڈاکٹر، پشتونولی، پشتو اکیڈمی، پشاور یونیورسٹی، ۲۰۰۸ء، ص:۲

۸. حکیم زے، بدرالحکیم، پشتونولی، ضیاء سنز پرنٹرز، پشاور، ۲۰۰۴ء، ص: ۱۴

۹. طاہر آفریدی، دیدن، کراچی بختیار اکیڈمی، دسمبر ۱۹۸۲ء، ص:۱۰۴

۱۰. کاچو خیل، محمد جمیل، نوحۂ بے نام، پشتو ادبی ٹولنہ، الہ ڈھنڈ ڈھیری، ملاکنڈ، ۲۰۱۱ء، ص:۱۱۳

۱۱. سلیم راز، (مقدمہ) نوحۂ بے نام، از محمد جمیل کاچو خیل، پشتو ادبی ٹولنہ، الہ ڈھنڈ ڈھیری، ملاکنڈ، ۲۰۱۱ء، ص:۲۳،۲۲

۱۲. احتشام حسین، سید، پروفیسر، اردو افسانہ۔۔ایک گفتگو، (مضمون) اردو نثر کا فنی ارتقاء، از ڈاکٹر فرمان فتحپوری، ایجوکیشن پبلیشنگ ہاوس، دہلی، ۲۰۱۳ء، ص:۲۱

۱۳. فیروزہ بخاری، سچ کا زہر، پشاور، ادارہ علم و فن پاکستان، ۱۹۸۰ء، ص:۷۶

۱۴. طاہر آفریدی، دیدن، کراچی، بختیار اکیڈمی، دسمبر ۱۹۸۲ء، ص:۱۴۳

۱۵. عبدالقادر، مولانا، (مقدمہ) دی پٹھان، مترجمہ سید محبوب علی، پشتو اکیڈمی پشاور، ۱۹۶۷ء، ص، ۵۴

۱۶. طاہر آفریدی، دیدن، کراچی، بختیار اکیڈمی، دسمبر ۱۹۸۲ء، ص:۴۹

۱۷. منوّر روف، طرفہ تماشہ، طبع اوّل پشاور: عظیم پبلیشنگ ہاوس، جنوری ۱۹۸۷ء، ص:۸۱

باب دوم:

خیبر پختون خوا کے اُردو افسانے میں دیہی عناصر

خیبر پختون خوا کے اُردوافسانوں میں دیہی زندگی کو نمایاں کرنے کے لیے حقیقی انداز اپنایا گیا ہے۔ یہاں کے دیہی معاشرت کی اصلی روپ، لوگوں کی بود وباش، روایتی کھیل و تہوار، معاشرتی ناانصافیاں، جاگیر دارانہ واستحصالی نظام، مسائل و معاش غرض ہر پہلو زندگی کو تفصیل کے ساتھ قاری کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ خیبر پختون خوا کے اردوافسانہ نگاروں نے اپنے تخلیقات میں دیہی معاشرت کی ایک مکمل اور جامع تصویر پیش کی ہے اور معاشرے میں موجود محاسن و نقائص کو قاری پر آشکار کئے ہیں۔ دیہاتی مسائل و مصائب کا نہایت باریک بینی سے مشاہدہ کر کے بہترین اور نپی تلی انداز میں بیان کیا ہے۔

خیبر پختون خوا کے اُردوافسانوں میں دیہی معاشرت کو اپنے حقیقی روپ میں دکھایا گیا ہے۔ لکھاریوں نے گاؤں کے کسانوں، محنت کشوں، دہقانوں اور پیشہ ور کسب گروں کو اپنے کام میں دہت اور یہاں کے حسین مناظر کو بہترین انداز میں پیش کیا ہے۔ اسی طرح ان لوگوں کو اپنے مال مویشی میں مصروف یا کھیتی باڑی کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ پشتون دیہاتی علاقے زیادہ تر پہاڑی ہیں۔ یہاں اگرچہ میدانی علاقوں جیسی وسیع زمینیں نہیں لیکن پھر بھی یہ لوگ اپنے روایتی اوزار کے ساتھ اچھے فصلوں اور سہانے مستقبل کے خواب لیے دن رات محنت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اب اگرچہ جدید سہولیات، کھاد اور بیجوں کی فراہمی نے ان کی تھکاوٹ میں قدر کمی کر دی ہیں لیکن پھر بھی محنت ومشقت کے عادی یہ کسان اپنے زمینوں سے جتے رہتے ہیں۔ یہاں کے لکھاریوں نے ان کی زندگی، مسائل ومشکلات اور غمی خوشی کو کمال مہارت کے ساتھ اپنے افسانوں کی زینت بنایا ہے۔ دیہی معاشرت کے چند عناصر کا ذکر درج ذیل ہیں۔

(الف)۔ خلوص ومحبت / مہمان نوازی:

میلمستیا (مہمان نوازی) ہماری دیہاتوں اور پختونولی کی ایک خوب صورت قدر مہمان نوازی ہے اگر پختونوں کے حجرہ یا مسجد میں کوئی اجنبی مہمان بھی آجائے تو وہ سب کا سانجھا ہوتا ہے اس کا مطلب مہمان کی خاطر تواضع اور کھلانا پلانا نہیں بلکہ اس کی جان ومال کی تحفظ اور مہمان کے خاطر جان دینے اور لینے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ یعنی اگر کسی پختون سے کسی اجنبی نے پناہ طلب کی تو اس پر لازم ہے کہ وہ نہ صرف اس مہمان کو پناہ دیگا بلکہ اس کی حفاظت بھی کرے گا خوہ اس میں اس کی جان بھی چلی جائے پشتونوں کے ہاں مہمان نوازی (میلمستیا) کے تصور میں بڑی شدت پائی جاتی

ہے۔ مہمان کو مفت کھانا اور رہائش دینا اور اس کی خاطر مدارت کرنا یہاں کی دیہی معاشرت اور پختون ولی کا ایک درخشندہ باب ہے جسے غیر پختون بھی سراہتے ہیں۔

ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک مہمان نوازی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"پشتونوں کی مہمان نوازی کی اصل روایت میں کوئی بھی غرض پوشیدہ نہیں ہوتی ۔نہ کوئی تجارتی مقصد ہوا کرتا ہے۔۔۔۔کوئی بھی اجنبی مسافر کسی بھی وقت کسی بھی حجرے میں مہمان بن کر آسکتا ہے۔۔۔۔۔ مہمان نوازی کے مراکز حجرے ،مسجد اور ڈیرے ہوتے ہیں اور یہ مشترک ہوتے ہیں۔"(۱)

چونکہ پشتون ایک راسخ العقیدہ مسلمان قوم ہے مذہب سے والہانہ لگاؤ رکھتے ہیں لہٰذا فرمان نبی ﷺ کا پاس رکھتے ہوئے وہ گھر آئے مہمان کو سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔اور حتی الوسع ان کی خاطر مدارت کرتے ہیں۔ حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ:

"اَکرَمُ الضَّیفُ وَلَوکَانَ کَافِرَاً"(۲)

ترجمہ:"اگرچہ مہمان کافر ہی کیوں نہ ہو اس کی عزت و مہمان نوازی تم پر لازم ہے۔"

مہمان نوازی پشتونولی اور پر خلوص دیہاتیوں کی خاص وصف ہے۔ گھر آئے مہمان کو وہ اللہ کی رحمت اور ان کی مہمان نوازی قابل برکت سمجھی جاتی ہے۔ خیبر پختون خوا کے افسانہ نگاروں نے یہاں کے دیہاتیوں کی یہ خصوصیت اور اس سے متعلق واقعات کو اپنے افسانوں میں بہت خوب صورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مراد شنواری نے اپنے افسانے "نجب خان" میں دیہاتی پشتونوں کے اس امتیازی خصوصیت کو اجاگر کیا ہے:

" وہ اخونزادہ صاحب کے پاس ان کے والد کی زیارت کے بہانے آیا اخون صاحب نے اسے ایک نیک اور ایماندار مسلمان سمجھ کر مہمان ٹھرایا اوراس کی بڑی خاطر تواضع کی۔ کہتے ہیں جب یہ حضرت بڑے آخون صاحب کی خدمت میں پہنچا تو اس کے ہاتھ میں ایک ہزار دانے کی تسبیح تھی۔"(۳)

فرنگن عورت کی اغوانگی اور اس کی پشتون روایات کے مطابق خاطر تواضع کو بھی افسانہ نگار نے یہاں کے روایات کا حصہ بنا کر پیش کیا ہے۔ فرنگن عورت اگرچہ غیر مسلم ہے اور دشمنوں سے اغوا کر کے لائی جاتی ہے لیکن پھر بھی اپنے روایات کا پاس رکھتے ہوئے نجب خان گھر کے عورتوں کو اس کی بھرپور خاطر مدارت کرنے کی سختی سے تاکید کرتا ہے۔ پختون اپنے اقدار و روایات کا سختی سے پابند ہوتا ہے اور پختون ولی کی پیروی میں زرا بھر کوتاہی نہیں کرتا۔اس افسانے میں افسانہ نگار نے پختون روایت مہمان نوازی کے ایک اور پہلو کو اُجاگر کیا ہے جب نجب خان کے آدمیوں کا

گاؤں کے حجرے میں ملک کے ساتھ کسی بات پر تکرار ہو جاتا ہے تو ملک قابل قدرت ہونے کے باوجود صرف یہ جواب دینے پر اکتفا کرتا ہے:

"افسوس تم میرے حجرے میں بیٹھ کر ایسی باتیں کر رہے ہو، خیر کوئی بات نہیں۔ زہر کے یہ گھونٹ میں حلق سے اُتار ہی لوں گا۔"(۴)

دراصل پختون روایات میں گھر آئے مہمان اور حجرے کے دہلیز پار کرنے والوں کی ہر جائز و ناجائز برداشت کرنے کی روایت ہے اسی روایت کا پاس رکھتے ہوئے ملک اگرچہ اس پوزیشن میں تھا کہ نجب خان کے آدمیوں کو سبق سکھلاتا لیکن چونکہ وہ ان کے حجرے میں تھے اس لیے چھپ سادھ لیا اور نجب خان کے آدمیوں کے باتوں کو برداشت کرتا رہا۔

مراد شنواری کا افسانہ "نجب خان" قیام پاکستان سے قبل کے تاریخی واقعات کا آئینہ دار ہے۔ کرداروں کے نام فرضی ہیں لیکن حقیقی واقعات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ افسانہ نجب خان آفریدی کی تاریخی کہانی ہے۔ اس نے کوہاٹ کے کمشنر کی بیٹی ایلس کو اغوا کر لیا تھا۔ اسی واقعے کو مصنف نے اپنی کہانی کی بنیاد بنایا ہے۔ اس نوعیت کے واقعات خیبر پختون خوا میں انگریزی عہد میں اکثر رونما ہوتے رہتے تھے۔ مراد شنواری کا افسانہ "کفن" بھی اسی تاثر کا حامل ہے۔ مراد شنواری کے ان افسانوں کا ترجمہ مشہور افسانہ نگار و ترجمہ نگار رضا حسین ہمدانی نے اپنے ایک کتاب "پشتو افسانے" میں کیا ہے۔

جیمز ڈبلیو سپین اپنے کتاب "THE HISTORY OF PUSHTOON" میں پشتونوں کے اس وصف کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"بطور احترام انگریز ارباب اختیار قبائل کو ان کے روایتی قانون (پشتونولی) کے مطابق اپنے معاملات اور زندگی بسر کرنے کی آزادی دیتے۔ بسا اوقات میلمستیاں (مہمان نوازی) مشکلات کھڑی کر دیتی قبائلی علاقوں میں جرائم پیشہ افراد کی طلبی پر یہی روایت میلمستیاں آڑے آتی۔ مفروروں کے حوالگی سے انکار پر حکومت کی سخت کاروائی جبکہ قبائل دفاع میں ڈٹ جاتے اور سرحد میں ایک نیا تنازعہ کھڑا ہو جاتا۔"(۵)

پختونوں کے مہمان نوازی کا اندازہ اس اقتباس سے یوں ہو جاتا ہے کہ پختون اپنی جان تو دے سکتا ہے لیکن کوئی اس کے گھر آئے مہمان کو گزند نہیں پہنچا سکتا خواہ یہ مہمان اس کا اپنا دشمن ہی کیوں نہ ہو۔ مہمان کے لیے قربانی دینے کی ایک زندہ مثال افغان امریکہ جنگ ہے جس کی بنیاد اسامہ بن لادن (جو کہ افغان مہمان تھا) کی حوالگی تھا افغان طالبان نے اپنے جانوں اور حکومت تک کو قربان کر دیا لیکن اپنے مہمان کو دشمن کے حوالے نہیں کیا۔ دیہاتی پختونوں میں مہمان نوازی

کی ایک اور روایت بھی کافی قدیم و مقبول ہے، جسے مقامی پشتو زبان میں ”بدرگہ“ کہا جاتا ہے۔اس کا مطلب مہمان کی مہمان نوازی یعنی کھانا کھلانا وغیرہ کے بعد ان کو اس کی حدود تک بحفاظت پہنچا دینا۔ دراصل جب کوئی مہمان آتا ہے تو واپسی پر علاقے سے نکالنے اور علاقائی حدود میں ممکنہ حادثات سے بچنے کی خاطر پختون اس مہمان کے ساتھ وہاں تک جاتا ہے جب تک وہ اپنے علاقائی حدود میں داخل نہ ہو۔

فہمیدہ اختر کے افسانہ ”دریائے باڑہ کے فاتح“ میں پختون مہمان نوازی کے روایت کو بیان کیا گیا ہے اگرچہ عجب خان اپنے دشمن قبیلے زخاخیل کے دو عورتوں کو انتقامی طور پر اغوا کرکے گھر لاتا ہے لیکن گھر میں نہ صرف اس کی ماں بلکہ آس پاس کے سب لوگ ان کی پختون روایات کے مطابق خاطر تواضع کرتے ہیں۔ ہر کوئی اپنے گھر سے کچھ نہ کچھ لاکر مہمانوں کو کھلاتے ہیں اور حتی الوسع ان کی مدارت کرتے ہیں۔یعنی پوری بستی والے ان کی میزبانی میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔

پختون مہمان کو عطیہ خداوندی سمجھتے ہیں۔ یہ وصف پختون دیہاتیوں میں اس قدر زیادہ ہے کہ خوا امیر ہو یا کہ غریب مہمان کو اپنے لیے اعزاز تصوّر کرتا ہے اور حتیّٰ الوسع اس کی مدارت کرتا ہے۔ خیبر پختون خوا کے افسانہ نگاروں نے یہاں کے دیہات میں مہمان نوازی کی روایت کو بطور خاص اُجاگر کیا ہے۔ سحر یوسفزئی اپنے افسانوی مجموعے ”آگ اور سائے“ میں یہاں کے دیہاتیوں کے اس امتیازی خصوصیت کو جابجا بیان کیا ہے۔اپنے افسانے ”زیتون اور نرگس“ میں یہاں کے ایک غریب پہاڑی گجر کو مہمانوں کی روایتی مہمان نوازی کو کچھ اس طرح پیش کیا ہے:

> "”ہم بھی پٹھان ہیں، آج تو ہمارے گھر میں آپ مہمان ہے، مکئی کی روٹی ،دودھ ،دہی، مکھن بہت ،وہی کھالیں گے۔ اختریوں تو یہاں کے لوگوں کے غربت سے اچھی طرح واقف تھا اور پھر یہ گوجروں کا طبقہ تو بہت ہی غریب ہے۔۔۔۔۔۔زمین ان کے نہ ہونے کی برابر ہوتی ہے۔۔۔۔۔اس لیے اس نے کہا "آپ کے یہاں جو کچھ ہے وہ تو ہم کھائیں گے ہی۔ مگر اس سردرات میں بھنے ہوئے گوشت میں جو مزہ ہے کسی اور چیز میں نہیں" بڑے میاں یہ سن کر خاموش ہوگئے۔"(۲)

سحر یوسفزئی نے دل کش انداز میں پختونوں کے روایتی مہمان نوازی کو بیان کیا ہے کہ پختون اپنے بساط کے مطابق مہمان کی مہمانداری کا فرض نبھاتے ہیں اور مہمان سے بھی یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ خندہ پیشانی کے ساتھ ان کے پیش کردہ طعام کو قبول کریں۔اس افسانے میں اختر اور اسکے ساتھی کو ٹھنڈ اور بھوک ستاتی ہے تو وہ اس پہاڑی علاقے میں واقع ایک غریب گُجر کے یہاں جاتے ہیں۔وہ لوگ خندہ پیشانی کے ساتھ ان کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ اختر اور ان کا ساتھی چاہتے ہیں کہ ان کے شکار کردہ تیتر و چکور ان کے لیے بھون کر کھلائے لیکن بڑے میاں ان کے یہ بات سن کر عجیب معنی

خیز انداز میں کہتے ہیں کہ اگرچہ ہمارے یہاں شہری کھانے نہ سہی لیکن لسّی، دودھ، گھی اور مکھّن وغیرہ تو موجود ہیں آج آپ لوگ ہمارے مہمان ہیں ہماری یہ مہمانداری قبول کیجئے اور اپنے شکار گھر جا کر کھا لیجئے گا۔ یہاں ایک بات قابل غور ہے بڑے میاں کے یہ الفاظ کہ "ہم بھی پٹھان ہے"۔ یعنی پختونوں کی یہ صدیوں پرانی روایت ہے کہ ان کے یہاں جو مہمان بن کر جاتے ہے وہ اپنے توفیق کے مطابق ان کی حتّی الوسع مہمانداری کرتے ہیں اور مہمان کے لائے ہوئے چیزوں کو مہمان کو کھلانا برا اور معّیوب تصّور کرتے ہیں۔

سحر یوسفزئی کے افسانے خیبر پختون خوا کے قبائلی معاشرت کے ترجمان ہیں۔ انھوں نے پٹھانوں کی تہذیبی و تمدنی زندگی اور کلچر کو اپنے اندازبیاں کی رنگ آمیزی سے ایسے حقیقی رنگ میں پیش کیا ہے کہ زندگی اپنی تمام تر سچائیوں کے ساتھ ان افسانوں میں جلوہ گر نظر آتی ہے جس سے نہ صرف اس علاقے کے کلچر اور تہذیب و تمدن کے نقوش اُبھر کر سامنے آتے ہیں بلکہ برف پوش پہاڑوں کی چوٹیوں کے دامن میں رہنے والوں کی زندگی، رہن سہن، نفسیات، طبقاتی تفریق سے پیدا ہانے والی کشمکش سے بھی واقفیت پیدا ہوتی ہے۔

افسانہ "بدلہ' میں افسانہ نگار پیر محمد شارق نے پشتون ولی کے اہم روایات پناہ و مہمان نوازی کو پیش کیا ہے۔ اس افسانے میں گاؤں کے دو خانوں شیر دل خان اور ملک مامور کے درمیان جھگڑہ ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں ملک مامور کا بیٹا گولی کا نشانہ بنتا ہے یوں یہ خاندانی دشمنی سالوں چلتی ہے اور دونوں گروہ ایک دوسرے کو گزند پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

> "شیر دل خان کے بیٹوں نے ملک مامور کو گھر کے دروازے تک پہنچا دیا اور جب وہ واپس آنے لگے تو ملک مامور نے دونوں کو پکڑ کر کہا 'اب تم جا نہیں سکتے ۔ تم لوگوں نے مجھ سے بدلہ لے لیا ہے۔ ذرا ٹھہر جاؤ۔" ۔۔۔۔۔ملک مامور قاضی صاحب کو لے ایا اور دونوں لڑکوں کے سامنے قاضی صاحب سے کہا۔" قاضی صاحب ۔ میرے گھر میں دو جوان لڑکیاں بیٹھی ہیں ۔ مناسب بر نہ ملنے کی وجہ سے میں نے انہیں ابھی تک بیٹھا رکھا ہے ۔ آج دونوں کا نکاح ان دو لڑکوں سے پڑھا دو کیونکہ انہوں نے آج مجھ سے اپنے دو مردہ بھائیوں کا بدلہ لے لیا ہے۔"(۷)

افسانہ نگار نے نسبتاً غیر فطری انداز اپنا کر یا پھر شائد اصلاح معاشرہ کے لیے ملک مامور کو اپنے دونوں بیٹیوں کا ہاتھ شیر دل خان کے بیٹوں کو تھماتے دکھایا ہے لیکن یہ بھی ملحوظ رکھنا بنتا تھا کہ عورت ذات کی بھی کوئی عزت نفس ہوتی ہے یہ کوئی کھرلی سے باندھی جانور نہیں کہ جب چاہا کھول کر دوسروں کے حوالے کیا۔ پشتون روایات میں اگر ایک طرف دشمنی میں وہ حدوں کو پار کر جاتے ہیں تو دوسری طرف دوستی میں تن من دھن لٹانے اور جان نچھاور کرنے سے بھی نہیں

کتراتے۔ یہاں کے دیہی معاشرت اور پشتونولی کا یہ پسندیدہ سماجی رویہ ہے کہ مہمان کی عزت وآبرو، جان ومال اور جذبات واحساسات تک کا تحفظ کرنا اپنے اوپر لازم سمجھتے ہیں۔ خندہ پیشانی اور کھلے دل سے مہمان کی مہمانوازی وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

خیبر پختون خوا کے دیہات اور پختون ثقافت میں مہمان کی اہمیّت مسلّمہ ہے۔ مہمان کو عطیہ خداوندی اور قابل فخر جانا جاتا ہے۔ جس ملک کے حجرے میں مہمانوں کا آنا جانا زیادہ ہو اسے زیادہ قابل احترام اور معاشرے میں زیادہ باوقار حیثیّت حاصل ہوتی ہے۔ خیبر پختون خوا کے اردو افسانہ نگاروں نے اپنے کاوشوں میں پختون روایات اور روایت مہمان نوازی کے مختلف پہلوں کو اُجاگر کیا ہے اور مختلف انداز وزاویہ ہائے نگاہ سے اس روایت کو بیان کیا ہے۔ پختون رِوایات کے امین اور روایت شناس افسانہ نگار طاہر افریدی نے اسی پختون روایت مہمان نوازی کی ایک اچھوتے اور عجیب انداز مہمان داری کو اپنے افسانے ''برف پہاڑوں کا آدمی'' میں کچھ یوں بیان کیا ہے۔

"ہمارے دیہاتی رواج کے مطابق جب تک مہمان اپنا تعارف خود نہ کرائے اور اپنی آمد ورفت کے بارے میں خود ہی بات نہ کرے ہم نام اور آنے کا مقصد اور قیام کی مدت نہیں پوچھ سکتے اور یہ اجنبی خود یوں بے تعلق سا بیٹھا تھا جیسے اسے یاد نہ ہو کہ وہ کسی کا مہمان ہے۔"(۸)

طاہر نے اِس افسانے میں پختون مہمانوازی کے ایک منفرد انداز کی طرف قاری کی توجہ مبذول کرائی ہے کہ پختونوں کے ہاں یہ روایت ہے کہ وہ کبھی بھی مہمان سے اُن کی آنے کی وجہ، مدت قیام اور اُن کا تعارف نہیں پوچھتے مہمان جب چاہے، جتنا چاہے بغیر کسی روک ٹوک کے ہجرے میں ٹھر سکتا ہے۔ افسانہ ''برف پہاڑوں کا آدمی'' میں پختونوں کے دیہاتی زندگی کے اس دستور کا ذکر کیا گیا ہے۔ گل شیر کافی دنوں تک افسانہ نگار کے ہجرے میں رہتا ہے۔ میزبان مقدور بھر ان کی مہمان نوازی کرتا ہے اور تجسس کے باوجود مہمان کا تعارف اور وجہ آمد نہیں پوچھ سکتا۔ چاہنے کے باوجود پشتون روایات کو مد نظر رکھتے ہوئے وہ یہ جرات نہیں کرپاتا۔

پشتونوں کے روایتی مہمان نوازی کا ذکر طاہر آفریدی کے آفسانوں میں جابجاملتا ہے اور انہوں نے اس روایت کے منفرد زاویوں کو بیان کیا ہے مہمانوں کی خاطر خواہ مدارت نہ کرنے پر لعن طعن بھی کی جاتی ہے۔ اس کو طاہر آفریدی نے اپنے افسانے ''کھلا صندوق'' میں کچھ یوں پیش کیا ہے:

"اس دن نادر خان، امیر گل اور گاؤں کے دوسرے جوان بہت مصروف تھے کہ دوسرے گاؤں کا معاملہ تھا کہیں باراتیوں کو کوئی شکایت ہوتی تو وہ طعنے دینے لگیں گے کہ ملک مثل خان کے گاؤں والے سُست اور کاہل ہیں۔ اور مہمانوں کی اچھی طرح خدمت نہ کرسکے۔"(۹)

مہمان چاہے انفرادی ہو یا اجتماعی مطلب کسی ایک شخص کا ذاتی مہمان ہجرے میں آئے یا کسی غمی خوشی کے موقع پر دوسرے گاؤں والے مہمان بن کر آئے سب کے سانجھے ہوتے ہیں۔ ہر کوئی اس مہمان کی مہمان نوازی کرتا ہے۔ غمی خوشی کے موقع پر سب گاؤں والے اکٹھے مہمان کے مہمانداری میں جھتے ہوتے ہیں اور مہمان نوازی میں کوئی کسر باقی نہیں رہنے دیتے اگر اس تواضع میں کوئی کسر رہ گیا تو دوسرے گاؤں والے گاہے بہ گاہے طعنہ دیتے ہیں کہ تم لوگوں کو مہمان کی قدر نہیں۔ اس افسانے میں افسانہ نگار نے نادر خان کو ناکام عاشق کے طور پر پیش کیا ہے نادر کے معشوق قمرو کی آج دوسرے گاؤں کے سید عالم سے شادی ہے۔ نادر خان بہت دل گرفتہ اور غمزدہ ہے۔ سارے گاؤں والے خان کے ہجرے میں مہمانوں کے انتظامات میں لگے ہوئے ہیں۔ نادر خان اگرچہ بہت غمگین ہے۔ لیکن روایات کا پاس رکھتے ہوئے دوسرے لوگوں کے ساتھ مہمان کے مہمان داری میں لگا ہوا ہے تاکہ گاؤں کی بدنامی نہ ہو اور مہمان نوازی میں کمی بیشی پر طعنہ زنی سے بچے رہیں۔

طاہر افریدی کے افسانوں میں پشتون دیہاتی زندگی کا پورا منظر سامنے آتا ہے جو لوگ پشتون معاشرت سے گہری واقفیت رکھتے ہیں انھیں ان کی کہانیوں میں حقیقی زندگی رگ جاں کی طرح نظر آتی ہے۔ ان کہانیوں کے بین السطور وہ اس خوددار اور بہادر قوم کی داستان حیات لفظوں کی مصوری میں دیکھ لیتے ہیں۔ جہاں سر کٹ تو سکتے ہیں جھکتے نہیں ۔ غیرت مند بہادروں کے شملے نیچے نہیں ہوسکتے۔ جہاں محبت لگاوٹ اور مجبوری تو بن سکتی ہے لیکن غیرت وحمیت کو زیر نہیں کرسکتی۔ پگڑی عزت کی علامت سمجھی جاتی ہے جسے محبت جیسا لطیف جذبہ بھی نہیں نیچے کرسکتا بلکہ اس کے سربلندی کے لیے قربانی محبت ہی کو دینی پڑتی ہے۔

فیروزہ بخاری اپنے افسانہ ''گل سانگہ ''میں روایتی پشتون مہمان نوازی کا ذکر کرتی ہے کہ جب پروفیسر شکیل کا تبادلہ پاڑہ چنار ہو جاتا ہے، تو مقامی پرنسپل شفیق ان کے مستقل رہائش کا بندوبست ہونے تک ان کے کھانے پینے اور تمام ضروریات کا ذمّہ خود لیتے ہے اور پشتون ولی کے دستور کے تحت پروفیسر شکیل کا خیال رکھنا اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔

شمیم فضل خالق کا افسانہ ''گونگادر'' جہاں گاؤں کے پرفضا ماحول، کھیت کھلیان اور خلوص ومحبت کے تذکرے پر مبنی ہے وہاں گاؤں والوں کی مہمانوازی بہادری اور اخلاص ومحبت بھی بیان کی گئی ہے۔ افسانے میں ایک طرف شہر والوں کے بے وفائی، دھوکہ بازی، اور جعلسازی کا ذکر ہے تو دوسری طرف مجاہد اور اس کے خاندان والوں کے خلوص، محبت مہمانوازی بہترین انداز میں بیان کی گئی ہے۔ شہری لڑکا مجاہد سے گاؤں میں ٹھرنے کے لئے ہوٹل وغیرہ کی فراہمی کے بارے میں معلوم کرتا ہے تو جواباً مجاہد مسکرا کر جواب دیتا ہے:

''جی ہوٹل تو واقعی نہیں ہے لیکن گھر تو بے شمار ہیں۔۔۔۔۔۔سب سے پہلے ہمارا غریب خانہ حاضر ہے۔''(۱۰)

پختونوں کے دیہاتی علاقوں میں مہمان نوازی کی مستحکم روایت کی موجودگی میں ہوٹل نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس افسانے میں مہمان شہری مجاہد کی پیش کش قبول کر کے اس کے ساتھ اس کے گھر آجاتے ہیں۔افسانہ نگار نے طویل و تفصیل انداز میں شہری لڑکے کے بے وفائی اور دیہاتی مجاہد کے باوفائی، شہری والد کے لڑکی سے لاتعلقی اور دیہاتی والدین کے جی جان سے قبولیت ،مجاہد کی چچازاد منگیتر کے بجائے شہری بے آسرا لڑکی کی اپنائیت ،دیہاتیوں کی خلوص، مہمان نوازی اور شہری لڑکے کا لڑکی کو بے آسرا چھوڑ کر بھاگ جانے کی روداد،افسانہ نگار نے ترتیب کے ساتھ پیش کئے ہیں۔

سوات میں دہشت گردی اور فسادات کے تناظر میں لکھے گئے محمد جمیل کے افسانوی مجموعے ''نوحہ بے نام'' میں ایک طرف سوات سے بڑے پیمانے پر لوگوں کے ہجرت، صعوبتوں اور بے سر وسامانی کا ذکر جبکہ ساتھ ہی پشتونوں کے رحم دلی، مہمانوازی اور انصاری کے جذبے کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ سوات سے ہجرت کردہ لُٹے پٹے اور بے سروسامانی کے حالات میں میدانی علاقوں میں پہنچے قافلوں کو جس والہانہ اور عقیدت مندانہ انداز میں یہاں کے باسیوں نے استقبال کیا، ان کے رہائش اور سازوسامان کا بندوبست کیا، اسی مہمان نوازی، بھائی چارے اور اخوت پر مبنی جذبات کو افسانہ نگار نے اپنے افسانوں میں عمدگی سے برتا یہاں ہر کہ و مہ، مرد و زن نے اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔افسانہ ''ایثار'' میں خان کے گھر کام کرنے والی بے روزگار خاوند اور ساتھ بچّوں کی ماں کا جذبہ ایثار نہایت بہترین انداز میں پیش کیا ہے:

"آج پھر سوات سے بھوکے لٹے پٹے تباہ حال لوگ آپ کے میزبانی اور بھائی چارے کے منتظر ہیں ۔ آپ کے گھروں میں کھانے کے لیے جو بھی ہو، وہ مسجد لے آئیں، تاکہ ہم اپنے بھوکے پیاسے بہن بھائیوں کی خدمت کر سکیں''۔اعلان بار بار دہرایا جانے لگا۔ ماں کا ہاتھ سالن ڈالتے ڈالتے ٹھٹھر اسا گیا۔چند لمحوں میں وہ کسی نتیجے پر پہنچ گئی۔ بھرا ہوا چمچہ اُس نے پھر بڑے سالن والے برتن میں خالی کر دیا اور کھانا اٹھا کر مسجد لے آئی۔ کمال کی بات یہ تھی کہ بچوں نے نہ تو شور مچایا اور نہ اعتراض کیا۔واپس آکر وہ مٹھی بھر کا آٹا گوندنے لگی۔ جو گھر میں تھوڑا سا پڑا ہوا تھا۔ وہ جوار کی روٹی بنا رہی تھی ۔ آگ کی تپش سے اُس کے چہرے کے نور اور آنکھوں کی چمک میں اور اضافہ ہو تا رہا۔"(۱۱)

یہ ایک غریب محنت کش گھرانے کی کہانی ہے جو مختصر ہونے کے باوجود مکمل اور متاثر کن ہے۔ سوات سے آنے والے بھوکے پیاسے، لٹے پٹے تباہ حال مہاجرین کی پزیرائی اور مہمان نوازی کا ایک ایسا واقعہ جس نے انسانی ہمدردی اور

قربانی کے جذبے کو لازوال بنادیا۔ افسانہ نگار نے یہاں کے ہر باسی اور ہر آنگن کی صورت حال پیش کی ہیں۔ اس جذبے کی محرک نہ صرف انسانی ہمدردی بلکہ پختون ثقافت پر مبنی مہمان نوازی کی روایت بھی تھی، جو کہ پشتون ولی کی جان ہے۔

خیبر پختون خوا کے اُردو افسانہ نگاروں نے یہاں کے دیہی ثقافت و روایت کا اپنے اپنے انداز سے مشاہدہ کرکے اپنے افسانوں میں مہمان نوازی کو مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے پرکھ کر برتا ہے۔ مہمان نوازی کی روایت اسی ثقافت کا ایک خاصہ ہے، جس کا مطلب نہ صرف مہمان کو کھانا پلانا، خاطر مدارت، تواضع، جان و مال کی حفاظت بلکہ یہاں تک کہ گھر اگر آیا مہمان اس کا جانی وجدّی پُشتی دشمن ہی کیوں نہ ہو اُن کی روایتی خاطر تواضع کرنا اور جان و مال کی بھی حفاظت کرنا اس روایت کا اہم و لازمی جُز ہے۔ رحیم گل نے اپنے افسانے ''مہمان'' میں پشتون ولی کی اسی اہم جُز مہمانداری کا نمونہ پیش کیا ہے:

''ایک اجنبی نے آدھی رات کوان کے گھر کادروازہ کھٹکھٹایا، جنوری کی یخ بستہ رات میں ایک بھولا بھٹکا مسافر پناہ کی تلاش میں تھا۔''(۱۲)

اس افسانے میں افسانہ نگار نے اپنے مرکزی کردار ''شیر خان'' کو ایک عجیب کشمکش میں مبتلا کرکے پختون دیہاتی روایات و اقدار کو نپی تُلی انداز میں اُجاگر کیا ہے۔ شیر خان کی والدہ گوہر بانو اپنے مرحوم شوہر کی قتل کا بدلہ لینے کے لیے اپنے بیٹے کو عملی وذہنی طور پر تیار کراتی ہے، جبکہ وقت گزرنے کے ساتھ شیر خان کو گھر، مسجد اور حجرے کے ذریعے معاشرتی روایات و اقدار کی سوجھ بوجھ ہو جاتی ہے۔ اور وہ اُن کے لئے کھڑی ازمائش کی گھڑی تھی، جب جنوری کی ایک یخ بستہ رات کوان کے والد کا قاتل پُر دل خان انجانے میں خود ان کے گھر ٹھٹرتا ہوا آیا۔ یہ رات اگر شیر خان کی جوانی میں بیوہ ہونے والی ماں کے برسوں پرانی انتقامی جذبے کی تکمیل کی رات تھی، تو دوسری طرف شیر خان کی باپ کا بدلہ لینے کی صورت میں شملہ اُنچا کرنے کی گھڑیاں، لیکن پُر دل خان تو اُن کی گھر مہمان بن کر آیا تھا! مہمان نوازی کی برسوں پرانے روایت بیچ میں دیوار بن کر کھڑی ہو گئی اور بقول افسانہ نگار:

''وہ ایک ایسے سہ راہے پر کھڑا تھا جہاں سے ایک راستہ گھر کو، دوسرا حجرے کی طرف اور تیسرا مسجد کی طرف جاتا تھا۔''(۱۳)

اور بالآخر برسوں پُرانی روایت مہمان نوازی فتح یاب ہوئی۔ پختون معاشرتی اکائیوں حجرہ، مسجد اور پشتونولی کا سکھلایا سبق اور آبا کی صدیوں پرانی روایت یہ اعصاب شکن معرکہ سر کرنے میں کامیاب ہوئی اور شیر خان اپنے خاندانی دُشمن کو بحفاظت اپنے حدود پار کرا کر سکون کا سانس لیتا ہے۔

خیبر پختون خوا کے اُردو افسانہ نگاروں نے اگر ایک طرف برسوں پُرانے قدیم روایات کی پاسداری کو اپنے افسانوں میں بحسن خوبی نبھایا ہے، تو دوسری طرف ان روایات کی مسخ شدہ شکل بھی پیش کی ہے۔ قیوم مروت نے اپنے افسانے "تالہ" میں روایات مہمانداری کی ایک ایسی بگڑی شکل شہر میں دکھائی ہے۔ افسانہ نگار نے روایت پرستی کو پس پشت ڈال کر مادہ پرستی کی اپنائیّت کا رونا رویا ہے۔ پشتون ولی کے دعویداروں اور مذہب کے ٹھیکداروں کے دُوغلے پن کو طشت از بام کیا ہے۔ اس افسانہ میں جب بیمار مسافر ہسپتال میں قصائی ڈاکٹر کے ہاتھوں لٹ جاتا ہے۔ اورراس کے پاس کرایہ کے لیے پیسے باقی نہیں بچتے۔ ویسے بھی دیر ہو جانے کی وجہ سے گاؤں کی آخری گاڑی اس سے چھوٹ گئی تھی اس لیے وہ رات گزارنے کی غرض سے مسجد میں آتا ہے۔ مسجد کا پیش امام مسافر کو دھتکارتے ہوئے مسجد کو تالہ لگا دیتا ہے۔ مولوی کے اس رویے سے مایوس ہو کر وہ اپنی پھٹی ہوئی چادر لپیٹے مسجد کے دروازے کے سامنے والی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ جاتا ہے۔ سردی کی شدت کی وجہ سے لوگ اپنے اپنے گھروں میں دبک جاتے ہیں۔ افسانہ نگار اس موقع پر شہروں میں پشتونولی کے مٹتے ہوئے اقدار کی بڑی خوبصورت انداز میں عکاسی کرتے ہوئے کہتا ہے:

"اکاّ دُکاّ راہگیر، کہیں گزرا بھی تو مسافر پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈال کر چادر میں چھپتا چھپاتا چوروں کی طرح نکل گیا۔ مسافر کو جب سردی کی شدّت نے تنگ کیا تو چادر کو اپنے گرد خوب لپیٹ کر زمین کے ساتھ چپک گیا۔ دن بھر کا تھکا ہارا تو تھا۔ سر رکھتے ہی خراٹے بھرنے لگا۔"(۱۴)

صبح جب موذّن اذان دینے کے لیے آتا ہے۔ تو وہ مسافر کو خوابِ غفلت میں سویا ہوا دیکھتا ہے چونکہ وہ خود بھی غنودگی کی حالت میں ہوتا ہے، اس لیے مسافر کی طرف متوجہ نہ ہو سکا۔ وہ مسجد کا تالہ کھول دیتا ہے اور گرم پانی سے وضو کر کے اذان شروع کر دیتا ہے۔ دوسرے لوگ بھی ایک ایک کر کے گرم چادروں، جرسیوں اور کنٹوپوں میں لپٹے مسجد کے اندر آتے ہیں۔ نماز کے بعد کچھ لوگ حسبِ معمول مولوی صاحب سے درسِ قرآن سننے بیٹھ جاتے ہیں۔ مولوی صاحب پہلے چند آیتوں کا ترجمہ کر لیتے ہیں اور پھر بقولِ افسانہ نگار خلاصہ فرماتے ہوئے کہنے لگتا ہے:

"لوگوں !اللہ نے نہ صرف اِن آیات میں بلکہ جگہ جگہ حقوق العباد کے بارے میں سخت تلقین کی ہے۔ اللہ اپنے حقوق تو بخش دے گا لیکن بندوں کے جو حقوق بندوں پر ہیں۔"(۱۵)

اس کے بعد مولوی صاحب پوری تفصیل سے میاں بیوی، پڑوسی، والدین، غرباء، مساکین اور مسافروں کے حقوق پر روشنی ڈالتا ہے۔ اور آخر میں دعا کر کے محفل برخاست کر دیتا ہے۔ جب مولوی صاحب مسجد سے باہر نکلتے ہیں تو دروازے کے قریب چند آدمیوں کا جمگھٹا دیکھ کر ٹھہر تا ہے۔ مولوی صاحب کو دیکھ کر ایک آدمی نے کہتا ہے کہ مولوی صاحب کوئی آدمی مر گیا ہے۔ اس موقع پر اسلامی اقدار اور پشتون تہذیب سے پہلو تہی کرنے والے مولوی صاحب کا

رنگ فق ہو جاتا ہے اور جب وہ جمگھٹے میں سے جھانک کر دیکھتا ہے تو اُسے وہی رات والا مسافر دکھائی دیتا ہے۔ بقولِ افسانہ نگار:

"مولوی صاحب کی زبان سے نکلا۔ ''اِنَّالِلّٰہِ وَاِنَّااِلَیہِ رَاجِعُون۔ توبہ توبہ'' دوسرے نے کہا۔ ''رات سردی زیادہ تھی شاید سردی کی وجہ سے اکڑ گیا ہے۔'' ایک اور نے انکشاف کیا میں نے گھر جاتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔ یہ گٹھڑی کی طرح یہاں لپٹا پڑا تھا۔ شاید اُسے بخار بھی تھا۔ کیوں کہ ہلکی ہلکی فریادیں کر رہا تھا۔'' ایک نے تبصرہ کیا۔ ''میں نے بھی اسے دیکھا تھا۔ میں سمجھا کوئی فقیر ہے خود ہی چلا جائے گا۔ کیا پتہ تھا۔۔۔ اُف بیچارہ۔۔۔۔۔۔؟''(۱۶)

افسانہ نگار نے شہر اور دیہات کی باسیوں کے روّیوں اور بودوباش و طرز معاشرت کا تقابل کیا ہے۔ دیہاتیوں کی روایت پرستی اور شہریوں کے مادہ پرستی کو اُجاگر کیا ہے۔ پشتون ولی کی صدیوں پُرانے روایات و اقدار سے انحراف کا ماتم اور مذہب کا لبادہ اُوڑھے عیار و مکّار چہروں کے پَردے واہ کئے ہیں۔

اشر آف حسین احمد اپنے افسانے ''چھت'' میں پشتون معاشرت کے اکائیوں میں سے ایک اہم اکائی حجرے کے روایت کے خاتمے، نفسا نفسی، مادیت پرستی، اجتماعی بھائی چارے اور خلوص و محبت کے ناپید ہونے پر ماتم کناں ہے۔ اور ''سپو گمئی'' کے بیوہ ہونے پر نصیحت کرتے بڑھیاں زمانے کے بدلتے صورت حال، مٹتے اقدار اور دم توڑتے روایات کا تذکرہ کرتے ہوئے نصیحت کرتی ہیں کہ آج کل کوئی کسی کے کام نہیں آتا اپنا مستقبل برباد نہ کر اور دوسری شادی کا مشورہ دیتی ہے یوں بر سبیل تذکرہ معاشرتی نا اتفاقیوں، نفسا نفسی، چھوٹے بڑے کی تمیز اور حجرے کے موجودہ تصور کا بھی ذکر کرتے ہوئے کہتی ہیں:

" آج کل تو بس نفسا نفسی کا دور ہے۔ خدا ترسی اور رحم دلی کی طرح ہر چیز کا سوکھا پڑ رہا ہے۔ دانے اپنی جگہ، خشاک اپنی جگہ، دال سبزیاں تو ہاتھ لگانے ہی نہیں دیتیں۔ ہمارے وقتوں مین گاؤں کے لوگ باگ جس کھیت چاہتے سبزیاں توڑ لے جاتے۔ آج تو غضب خدا کا ہر چیز کی قیمت لگ رہی ہے۔ اسی لیے تو مرد لوگوں نے حجرے مسمار کر کے بھیٹکیں سجا لیے ہیں۔"(۱۷)

افسانہ نگار معاشرتی زبوحالی، مادہ پرستی، نفسا نفسی اور روایات سے انحراف پر بڑا شاکی ہے۔ بے اتفاقی اور عدم برداشت کے رویےّ ان کے ذہن کو ٹھیس پہنچا رہے ہیں۔ وہ روایتی اتحاد و اتفاق اور پختون معاشرتی اکائیوں گھر، حجرہ اور مسجد کے کردار اور باہمی محبت و یگانگت کا خواہاں ہے۔ افسانے میں گاؤں کے بزرگ عورتوں کے زباں انہوں نے اپنا فریاد اور دلی بھڑاس نکالا ہے۔ اور پشتون ولی کے مٹتے اقدار پر ماتم کِناں ہے۔ وہ جہاں پشتوم معاشرے کے خصوصی مسائل کو

بیان کرتے ہیں وہاں انسانی آفاقی مسائل بھی ان کے نظر سے اُجھل نہیں ہیں۔ افسانہ "چھت" میں انھوں نے مظلوم عورتوں کی سماج کی اُنچی اُنچی دیواروں کے اندر کے گھٹے گھٹے ماحول میں سسکتی اور کراہتی زندگی کو بڑی کامیابی سے پیش کیا ہے۔ یہ مسائل صرف پشتون معاشرت کے خواتین کے ہی نہیں ہیں بلکہ مشرقی ماحول میں پلنے والی ہر عورت کی زندگی اس سماجی گھٹن میں دم توڑ رہی ہے۔ پشتون معاشرت سے باہر کی مشرقی دنیا کے ماحول کی مشکلات و واقعات بھی ان کی نظروں سے پوشیدہ نہیں ہیں اس لیے کہانی کی زیریں رو میں مقامیت کے پس منظر سے آفاقیت کی جھلک نظر آتی ہے۔

(ب)۔ حجرہ و جرگہ:

"پشتو" محض زبان کا نام نہیں یہ ایک قانون اور نظام کا نام بھی ہے۔ جسے "پشتون ولی" بھی کہتے ہیں۔ برطانیہ کے دستور کی طرح پشتونوں کا یہ آئین بھی لوگوں کے سینوں میں رقم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک پشتون کسی دوسرے کو کوئی غلط اور بزدلی کی حرکت کرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ تو فوراً کہتا ہے کہ تم کیسے پشتون ہو تم میں تو پشتو ہی نہیں ہے اس جملے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تمہارا عمل یا پھر تمہاری یہ حرکت اس قانون کے خلاف ہے جسے پشتو یا پشتونولی کہتے ہیں۔

پشتون ثقافت کا یہ سارا نظام "پشتونولی" کی بنیاد پر قائم ہے اور پشتونولی کے بنیادی اداروں میں حجرے کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی تعلیم یافتہ فرد بھی اس قانون کو توڑتا ہے تو پشتون سماج میں لوگ کہتے ہے کہ اس شخص کو حجرہ اور جومات (مسجد) کا پاس نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے۔ کہ یہ کبھی حجرے میں نہیں بیٹھا ہے، اس لئے اس نے پشتونولی کا سبق نہیں سیکھا ہے۔ دراصل انسانی تہذیب کوئی منجمند شے نہیں ارتقا اور تبدیلی ایک اٹل حقیقت ہے، مگر کسی بھی ثقافت میں بعض ادارے اور اس کے بعض حصے ایسے بھی ہوتے ہیں جو کہ نہ صرف نئے دور کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتے ہیں بلکہ تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ ان سے زیادہ فائدہ بھی اٹھایا جاسکتا ہے۔ پشتونولی میں جرگہ اور حجرہ ایسے ادارے ہیں، جو کہ اگر ایک طرف لازم و ملزم ہیں تو دوسری جانب آج کے پشتون اور آج کے ترقی یافتہ انسان کو اس کی زیادہ ضرورت ہے۔

حجرہ کی لفظی معنی ہیں کوٹھڑی، خلوت خانہ اور مسجد کے ساتھ ایک رہائشی کمرہ مگر اصطلاح میں پشتون سماج میں حجرہ ایک ایسی جگہ اور عمارت کو کہتے ہیں جو کہ سارے محلے کی ملکیت ہوتی ہے۔ جس کی تعمیر میں محلے یا پھر گاؤں کے تمام لوگوں نے اپنے بساط کے مطابق حصہ لیا ہوا ہوتا ہے، جبکہ محلے یا پھر گاؤں کے بڑے بزرگ اور خان محلے اور گاؤں کے تمام افرد کے مشورے اور مدد سے اس ادارے کو چلاتے ہیں۔ یہ ایک ایسا ادارہ ہوتا ہے۔ جس میں سب کی رائے کو اہمیت دی جاتی ہے۔ تمام معاملات اور تنازعات پر باہمی مشاورت ہوتی ہے۔ البتہ محلے کے بزرگوں اور خاندان کے سربراہوں کی رائے کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ دراصل حجرہ ایک کلب بھی ہے۔ ایک تفریح گاہ بھی، ایک فیصلہ گاہ اور جائے

مشاورت بھی ہے۔ یہ مساوی معاملات طے کرنے اور اس حوالے سے باہمی مشاورت کے طور پر اگر محلے یا گاؤں میں کوئی اجتماعی کام انجام دینا ہو، اگر فصل کی کٹائی کا وقت ہو یا پھر دوسرے ایسے کام کرنے پڑ رہے ہو جو کسی ایک فرد یا ایک خاندان کے بس کا روگ نہ ہو تو محلے کے افراد محلے کے حجرہ میں جمع ہو کر اس حوالے سے مشاورت بھی کرتے ہیں اور مسئلے کے حل کے لئے منصوبہ بندی بھی کرتے ہیں۔ مولانا عبدالقادر حجرے کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ہر قوم کے زندگی میں بعض ایسی امتیازای خصوصیات ہوتی ہیں جو اس کی سماجی زندگی کی بنیاد کہی جاسکتی ہیں اور جن پر اس کی اجتماعی زندگی کا انحصار ہوتا ہے۔ ترک معاشرے میں قہوہ خانے کا جو مقام ہے وہی افغانوں کی زندگی میں حجرے کو حاصل ہے۔ پٹھان کی سماجی زندگی ابتداء سے لے کر انتہا تک حجرے سے وابستہ ہے۔ حجرے کے بغیر کسی افغان گاؤں۔ خاندان یا گروہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔"(۱۸)

حجرہ میں محلے کے بزرگ بڑے بوڑھے اکٹھے ہوا کرتے تھے اور نوجوان ان بزرگوں سے سیکھا کرتے تھے کیونکہ ان کی باتوں میں زندگی کا تجربہ بھی ہوتا تھا اور فہم و فراست بھی۔ پختونوں کے تقریباً تمام ضرب الامثال دراصل حجرہ کے آنگن میں تخلیق ہوتے ہیں اس حوالے سے اسے سماجی علوم کی ایک یونیورسٹی کی حیثیت حاصل تھی۔ حجرہ میں لوگ برابری کی بنیاد پر مکالمہ اور بات چیت کیا کرتے تھے۔ اس سے معاشرے میں مکالمے dialogue کے کلچر کو فروغ ملا کرتا تھا بلکہ آپس میں مشت و گریبان ہونے کے برعکس سرد جنگ اور برداشت کا سبق سیکھا کرتے تھے۔ جرگہ فارسی زبان کا لفظ ہے اس کا ایک مطلب ہے، سب کے سامنے کھل کر بات کرنے کی ہر جگہ پشتون سماج میں جرگے کا اتنا احترام کیا جاتا ہے۔ کہ جو شخص جرگے کی بات ماننے سے انکار کر دیتا ہے یا منہ موڑ لیتا ہے تو اس کو جرگہ پلیت اور جرگہ بدرنگ کہا جاتا ہے۔ اور اسے اس کے بعد معاشرہ میں قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ حجرے میں "جرگہ" بھی بلایا جاتا ہے۔ جرگہ ہماری ثقافت کا ایسا مضبوط ادارہ ہے کہ آج کی دنیا کو بھی اس فورم کی اشد ضرورت ہے کیونکہ قانون سزا دیتا ہے۔ جبکہ جرگہ مسئلہ حل کرتا ہے۔ یہ ایک dispute resolution body ہے۔ راج ولی شاہ خٹک کہتے ہیں:

"جرگہ یا مرکہ پشتون رسومات و روایات میں بہت اہمیت رکھتا ہے اور تاریخی اعتبار سے پشتون تہذیب کا قدیم ترین رسم ہے۔ جرگہ کا فیصلہ قانونی حیثیت رکھتا ہے یہ اکثر گاؤں کے باہر کھلے میدان، حجرہ، مسجد یا کسی چوپال میں منعقد کیا جاتا ہے۔ پشتون معاشرہ میں جرگہ کے فیصلہ سے انحراف ممکن نہیں۔ اس لیے کہ اس کے فیصلے کو لاگو کرنے کے لیے پورا گاؤں ذمہ داری لیتا ہے۔"(۱۹)

جرگہ اور حجرہ آج کے انسان کے بھی تمام مسائل حل کر سکتا ہے ننواتے، پٹکے اور تیگہ جرگہ کی مختلف صورتیں ہیں۔ ننواتے میں دشمن اپنے دیرینہ دشمن کی دہلیز پر جا کر پشیمانی کا اظہار کرتا ہے اور پشتون روایات کے مطابق ننواتے

کے طور پر آنے والے کو ضرور معاف کیا جاتا ہے۔اس تہذیب میں عارضی راضی نامے کو "تیگہ " کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔اس پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اسے معاف کر دے جبکہ تیگہ عارضی فائر بندی کو کہتے ہیں۔جرگہ کی روایت اوراہمیت کے حوالے سے جیمز ڈبلیوں۔ سپین لکھتا ہے:

"پاکستان کا وہ واحد علاقہ جہاں پر اب تک اس کے قوانین لاگو نہیں ہو سکے یہاں کے قبائلی علاقہ جات ہیں۔پشتونوں کے روایتی قانون کے مطابق جرگہ یہاں کے تصفیوں کا حل تلاش کرتا ہے۔قانون مجریہ ۱۹۰۱ء کے تحت مقدمہ جرگہ کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے جبکہ مقامی پولیٹیکل ایجنٹ جرگے کے ارکان منتخب کرتا ہے۔"(۲۰)

ماضی میں حجرہ زیادہ فعال تھا کیونکہ حجرہ محض سماجی ہی نہیں اقتصادی زندگی کا بھی مرکز تھا مگر زندگی کے بدلتے ہوئے دھارے اور تہذیب کی نئی کروٹوں نے ہماری ثقافت کے اس مضبوط،مثبت اور مرکزی ادارے کو بھی متاثر کیا ہے اگرچہ آج بھی پختونخوا میں اکثر دیہات میں حجرے آباد ہیں اور اکثر و بیشتر سماجی معاملات حجرہ کے آنگن میں طے کئے جاتے ہیں مگر بعض قصبوں ااور خاص طور پر بڑے شہروں میں حجرہ یا تو سرے سے موجود نہیں اور اگر حجرے آباد بھی ہیں تو ویران پڑے ہیں۔

حجرہ جو کہ مشترکہ ملکیت ہوا کرتا تھا اور کسی کے لئے خاص نہ تھا انگریز کے آمد پر اس مشترکہ ملکیتی ادارے میں دراڑ پڑنے لگی اور اتفاق کے بجائے نفاق نے ایک سازش کے تحت سر اُٹھانا شروع کیا علاقے میں انگریز ایجنٹ خاص کر مَلک،خوانین اپنے ذاتی اور الگ حجرے بنانے لگے اور اس طرح پشتون ولی کے روایات کا آمین یہ اہم ادارہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے لگا۔افسانہ ’’نجب خان‘‘میں نجب خان کے ایک ایسی حجرہ کا تذکرہ کچھ یوں کیا گیا ہے:

’’ایک رات ہم نجب خان کے حجرے میں بیٹھے لال شیر ربابی سے " آدم درخانئ "کا قصہ سن رہے تھے۔عین اس وقت جب مجلس خوب گرم تھی کسی نے اچانک ہجرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔خان زادہ حجرے سے باہر گیا ۔‘‘(۲۱)

حجرہ جو کہ comunity center کا درجہ رکھتی تھی اور جہاں ہر کوئی اپنے مسائل اور رائے بیان کرنے کا حق رکھتا تھا اب اس کی یہ حیثیت ماند پڑتی جا رہی ہے مراد شنواری نے اپنے افسانے میں ملک کے رویےؔ،دھوکہ بازی،اپنوں سے غداری اور فرنگیوں کی چاپلوسی کے ساتھ ساتھ حجرے کی منظر کشی اور ملک کے جابر داری کو عمدگی سے پیش کیا ہے:

"اور یہ سامنے خوبصورت مکان کس کا ہے بابا۔؟

"یہ اسی ملک کا محل ہے جو نجب خان کے پاس دو بندوقیں نہ دیکھ سکا۔ اور جس نے انگریز کے ہاتھ سارے تیراہ کو بیچ دینے کا تہیہ کر لیا تھا۔"

حجرے کے باہر سیاہ گرد آلود موٹر کھڑا تھا اور ایک لڑکا اجھاڑن کے ساتھ اسے صاف کر رہا تھا۔"(۲۲)

افسانہ نگار نے پشتون معاشرت کے ایک اہم اکائی "حجرے" کے روایات سے انحرافی اور ملک، خوانین اور جاگیر داروں کے ظلم و استبداد اور پشتون ولی کے قدیم روایات کو پس پشت ڈالنے اور مادہ پرستی کا تذکرہ افسانے کے قالب میں فنی نزاکتوں کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ مراد شنواری کا افسانہ "کفن" بھی اسی موضوع پر لکھا گیا ہے اور دیہاتی ثقافت، روایات اور عناصر کو دلکش انداز میں بیان کیا ہے ملک عزیز خان کے روپ میں جابر جاگیر دار اور حجرے کو ثقافتی نشانی کے طور پر پیش کیا ہے معنی خیز انداز میں قدیم روایات کی بگڑی شکل اور دم تھوڑتی اقدار کا رونا رویا ہے۔ اتفاق کے جگہ نفاق اور بھائی چارے کے جگہ جابر داری ملک جو کہ ناصح، مصلح اور باکر دار رہنما ہوا کرتا تھا ان کو قابض، عیار و مکار اور شیطان کے روپ میں پیش کیا ہے۔

سحر یوسفزئی نے اپنے افسانوی مجموعے "آگ اور سائے" میں پشتون قبائلی زندگی، یہاں کے ثقافت، روایات، اقدار، بودوباش، معاشرت اور غمی خوشی کو موضوع بنایا ہے۔ ان کے افسانوں میں قدیم پشتو روایات حجرہ و جرگہ کو خاص اہمیّت حاصل ہے اور انہوں نے حجرے کا پرانا اور قدیم رُوپ یا بہ الفاظ دیگر سنہرے دور کو بیان کیا ہے، وہ دور جب حجرہ کو Community center کا درجہ حاصل تھا۔ لوگ انفرادی و اجتماعی مسائل بیان کرتے اور بزرگ اُن کا حل بتلاتے تھے۔ یہاں جرگے کے ذریعے دشمنی کو دوستی میں بدلنے کا رواج تھا۔ جہاں دشمن دوست بن کر باہم شیر و شکر بن جایا کرتے۔ حجرے کا یہی رُوپ سحر نے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ سحر کے افسانے "سائے" میں گاؤں کے حجرے کا منظر ہو، یا افسانہ "خشک چٹانیں" میں عبدالمجید کا حجرے میں چلم پینے کے عادت کا تذکرہ، افسانہ "آرزوئیں اور فاصلے" میں گاؤں سے آئے باراتیوں کے مہمان نوازی کا منظر اور حجرے میں باہمی محبت وبھائی چارے کا بیان۔ افسانہ "اندھیرے کا بیٹا" میں حجرے کی منظر کشی ہو یا پھر سردیوں میں آگ جلا کر قصے کہانیوں کا دور چلے۔ چلم اور رباب کی ساتھ منگّے (گھڑا) اور "یا قربان" کی آواز ہو۔ بزرگوں کی فہم و فراست پر مبنی باتوں کو سننے اور سمجھنے کیلئے جوانوں کا متوجہ ہو کر دوزانوں بیٹھنے کا انداز ہو۔ گاؤں میں فوتگی کی فاتحہ خوانی ہو یا رسم نکاح سحر نے کمال مہارت کے ساتھ ان تمام مذکورہ افعال و کردار، مناظر و واقعات، رسوم و رواج اور تہذیبی جھلکیوں کو اپنے افسانوں میں برتا ہے۔ حجرے میں ہر شام جمنے والی محفلوں کی رونقوں کو بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

"ماحول ساز گار تھا۔ معمولی سی فرمائش پر سرور گانے پر راضی ہو گیا، "یاقربان" کے ساتھ ستار کے تار جھنجھنانے لگے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ساتھیوں نے گھڑا اٹھالیا۔ اس وقت سرور کے آواز میں بلا کا سوز تھاایسا سوز جو دلوں کو روندے ڈالتا تھا۔ ستار ساز نہیں رہا تھابلکہ آواز بن گیا تھا آواز اور ستار کی ایسی موزونیت پہلے کبھی نہیں آئی تھی۔ سرور کی آواز بلند ہوتی گئی اور سارے ماحول پر چھا گئی۔ "(۲۳)

سحر یوسفزئی کے افسانوں کا جائزہ لینے کے بعد یہاں کے باسیوں کے دکھ سُکھ ، رنج و کرب اور مسائل کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ یہ افسانے اٹک کے اس پار بسنے والے پاکستانیوں کو خیبر پختون خوا کے معاشرت سے متعلق معلومات فراہم کرنے کی ایک شعوری کوشش کا نتیجہ ہیں۔ انھوں نے کسی مخصوص علاقے یا طبقے کو پیش نہیں کیا بلکہ تمام قبائلی علاقہ جات اور اس کے عوام کی نفسیات اور کلچر کو اساس بنا کر کہانی کا تار و پود تیار کیا ہے۔

سحر نے اس افسانے ''اندھیرے کا بیٹا'' میں حجرے کے اس منظر کو دل پذیر انداز میں پیش کیا ہے۔ سحر کے حجرے میں جہاں بزرگوں کے موجودگی میں احترام ، روایات و اقدار کی تعلیم ، فہم و فراست کی سکھلاہٹ ہوتی ہے، تو دوسری طرف انہی بزرگوں کی اجازت سے ٹنگ ٹکور ، اور رباب و موسیقی کا دور چلتا ہے، اور جب ''یاقربان'' کی آواز بلند ہوتی ہے تو بچے اور عورتیں منڈیروں پہ آکر اس محفل سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یہی حجرہ اِن دیہاتیوں کے غمی خوشی کا مرکز اور قدیم روایات کی آمین ہے۔

خیبر پختون خوا میں شادی بیاہ اور خوشی کے مواقع پر ڈھول کے تاپ پر بنگڑے اور ناچ گانے کا رواج قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے۔ مختلف علاقوں کیلئے ان کے خاص روایت کے مطابق ایسے محافل سجائی جاتی ہیں۔ پشتون قبائل میں ''اتنڑ'' اور ''خٹک ڈانس'' کافی مقبول و معروف ہیں۔ جبکہ شدی بیاہ کے موقع پر طوائفوں کی ڈانس کی خاص محفل سجائی جاتی تھی۔ جو کہ بعد میں تبدیل ہو کر ''لحتئ'' یعنی مرد ڈانسر ان کے جگہ لینے لگے اور طوائفوں کے بجائے ناچنے والے مرد جن کو مقامی زبان میں ''لحتئ'' کہتے ہیں۔ ایسے محافل میں بلائے جانے لگے۔ ایسے محافل کیلئے عموماً کھلے میدان یا حجرے کے کھلے صحن میں انتظامات کیے جاتے۔ مرد حضرات ان کے گرد حلقہ بنائے چار پائیوں پر بیٹھ کر جبکہ خواتین منڈیروں پر چڑھ کر اس محفل سے لطف اندوز ہوتے۔ زیتون بانو نے اپنے افسانے ''پنکھا'' میں پشتون ثقافت کی اسی روایت کو پیش کیا ہے:

"اِدھر طبلے پر تاپ پڑی اُدھر عورتوں نے شیر ک کی چھت کی طرف دوڑ لگائی۔ اس آپا دھاپی میں کوئی کسی پر گری ۔ کسی کا دوپٹہ کسی کے پاؤں تلے آگیا۔ اور دوپٹے والی لگی کوسنے دینے۔ ''غرق ہوجاؤ ، برباد ہو جاؤ، میرا دوپٹہ ، ستیاناس ہو۔'' اس طرح گرتی پڑتی تمام خواتین چھت پر پہنچ ہی گئیں۔ وہاں جا کر پتہ لگا کہ کسی

کا پائنچہ پھٹ گیا تھا۔ کسی کی قمیض، کسی کا زیور گرا۔ شیر ک کے کمرے کی چھت سیسیّد خان کا حجرہ صاف نظر آتا تھا۔ اور اس جگہ سے مُجرے کا تماشہ اچھی طرح کیا جاسکتا تھا۔ "(۲۴)

زیتون بانو نے اس افسانے میں دیہی ثقافت کے رسم خوشی اور اس رسم کی ادائیگی میں حجرے کے کردار کو پیش کیا ہے۔ حجرہ مہمانوں کے مہمانداری کیلئے یا صرف جرگوں کیلئے خاص نہیں بلکہ یہاں پر شادی بیاہ کے موقع پر موسیقی کے ایسے محافل سجائی جاتی ہے جس سے نہ صرف مرد بلکہ خواتین بھی محظوظ ہوتی ہیں۔ زیتون بانو کا افسانہ ''شیشم کا پتّا'' اگرچہ معاشرتی نفسیاتی اُلجھنوں اور خواتین کی حق تلفی کے موضوع پر مبنی ہے لیکن یہ نفسیاتی اُلجھنیں افسانہ نگار نے کمال مہارت کے ساتھ حجرے تناظر میں پیش کی ہے۔ اس میں حجرے کی منظر کشی، فیروز کاکا کے حجرہ رکھنے کی خاندانی روایت کا بیان اور پختون دیہات میں حجرہ کے رکھنے والوں کی مقام و منزلت کو بہترین انداز میں پیش کیا ہے۔ پشتون تہذیب و ثقافت ، دیہاتی زندگی اور اس کے عناصر کو طاہر آفریدی نے اپنے افسانوں میں دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔ اُنہیں دیہات کا عملی تجربہ ہونے کے بنا اُن کے افسانوں میں مشاہداتی عنصر نمایاں ہے انہوں نے بڑی باریک بینی سے دیہی ماحول کا مشاہدہ کر کے ان کے عناصر اور معاشرتی اکائیوں کو عمیق انداز میں اپنے افسانوں میں برتا ہے۔ حجرہ و جرگہ کے متعلق ان کے افسانوں میں کافی مواد موجود ہے اور انہوں نے کھل کر ان کے معائب و محاسن بیان کئے ہیں۔ حجرہ و جرگہ کے معاشرتی مقام و حیثیت اور کردار کو دل پذیر انداز میں پیش کیا ہے۔

زیتون بانو معاشرے کی زندہ حقیقتوں کی ترجمان ہیں۔ پشتون معاشرے کے تہذیبی، سماجی، ثقافتی پس منظر سے اُبھرنے والی یہ کہانیاں مقامی ہونے کے باوجود دوامی رنگ لیے ہوئے ہیں۔ پشتون عورت کی بیچارگی و بے بسی کے رد عمل میں پیدا ہونے والا انتقام نفسیاتی اُلجھنیں اور جنسی گھٹن ہر ملک اور ہر خطے کی عورت کی نفسیاتی کہانی ہے۔ ان کی کہانی بڑے فطری انداز میں منطقی انجام تک پہنچتی ہے۔ وہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات و موضوعات سے اپنی کہانی کمال فن کاری سے تیار کرتی ہیں۔ واقعات کا کینوس محدود ہوتا ہے لیکن چھوٹے واقعے کے تناظر سے اُبھرنے والی کہانی میں وہ ٹھوس اور حقیقی زندگی کے گہرے نقوش اُجاگر کرتی ہیں جو ان کی فنی پختگی کی علامت ہے۔

طاہر کے افسانوں میں حجرے کے مناظر، ان میں منعقدہ تقریبات، معاشرتی کردار اور کسی حد تک بگڑی شکل و مقام کو اُجاگر کیا ہے۔ تمام قبائلی حجروں میں مشترک خصوصیات کو پیش کیا ہے۔ افسانہ ''آئینہ چہرہ'' میں چلم پینے کے رواج کو ''بیری کا درخت'' میں ملک فیروز کا اجنبی مہمان نصیر خان کے ساتھ ہمدردانہ رویہ اور ان کی مہمان نوازی کی جھلک، جبکہ ''برف پہاڑوں کا آدمی'' میں افسانہ نگار نے ایک منفرد پختون روایت کی نشاندہی کی ہے۔ کہ حجرہ یا گھر آئے

مہمان سے کبھی بھی اُن کا تعارف، وجہ آمد اور مدّت قیام کے بارے میں نہیں پوچھا جاتا۔ جب تک چاہے حجرے میں قیام کر سکتا ہے۔

افسانہ ''وہ جو گاؤں تھا'' میں طاہر نے جہاں حجرے کو کنوارے جوانوں اور رنڈوے بوڑھوں کے مستقل قیام کی جگہ قرار دیا ہے، تو دوسری طرف انہی نوجوانوں کی تفریح کا ذریعہ جہاں موسیقی کی محافل ہوتے ہیں اور عموماً مقامی شعری صنف ''ٹپہ'' گایا جاتا ہے۔ مقامی آلات موسیقی کا ذکر کرتے ہوئے منگے (گھڑا) ستار رباب وغیرہ کو ان محافل کے جان قرار دیا ہے۔ اسی طرح کی ایک محفل کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

"اور پھر جب ایک رات حجرے کی محفل اپنے رنگ پر تھی۔ رباب بجانے والے کی انگلیاں رباب کے تاروں سے الجھ رہی تھیں گھڑا بجانے والا اپنے دھن میں مست ہو کر گھڑا بجا رہا تھا اور گانے والا اپنے فن میں ڈوب کر گا رہا تھا۔ حجرے کے پوری ماحول پر ساز و آواز ایک دم تھم گئے۔ "(۲۵)

پختون ثقافت میں جرگہ مسائل کو حل کرنے اور باہمی مشاورت سے اتفاق رائے کیساتھ پیچیدہ تنازعات کو سلجھانے کا ایک ایسا معاشرتی ادارہ ہے، جو کہ چنگاری کو بھڑکنے سے پہلے ہی بجھا دیتی ہے۔ حجرہ میں جرگہ کے ذریعے فریقین کے درمیان مصالحت ہوتی ہے یہاں کہنہ مشق، جہاں دیدہ اور با اعتماد بزرگ لوگوں کے تنازعات کا حل ڈھونڈتے ہیں بات چیت اور مکالمے سے معاملات طے کئے جاتے ہیں۔ یہاں کے افسانہ نگاروں نے اپنے ثقافت و روایت کا باریک بینی سے مشاہدہ کر کے اس کو اپنے افسانوں میں عمدگی سے بیان کیا ہے۔

طاہر نے اپنے افسانوں میں پشتون معاشرت اور ماحول کو پیش کر کے سماجی خرابیوں اور خوبیوں کو موضوع بنا کر خیر و شر کے جملہ معاشرتی ثمرات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ انسان خیر و شر کا مجموعہ ہے۔ اس کی فطرت تضادات سے عبارت ہے۔ وہ قاتل بھی ہے اور عفو و درگزر کا پیکر بھی، وہ نفرت بھی کرتا ہے اور محبت بھی۔ وہ انتقامی جذبے کی تسکین کے لیے مٹ بھی جاتا ہے اور مٹا بھی دیتا ہے اور چاہے تو زندگی کو امن کا گہوارہ بنا دے اور چاہے تو مصائب کا جہنم ۔انھیں مختلف النوع جذبات کی عکاسی ہمیں طاہر آفریدی کے افسانوں میں جلوہ گر نظر آتی ہے۔ وہ معاشرتی منافقتوں کے پردے چاک کر کے انسانی فطرت کے ملمع سازی کو بھی بے نقاب کرتے ہیں۔

افسانہ ''نجب خان'' میں مراد شنواری نے جرگہ اور مشاورت کی ایک جھلک اس وقت پیش کی ہے جب نجب خان اور اس کی ساتھی فرنگن عورت کو اغوا کرنے کے بعد ایک غار میں جا کر بزرگوں کے سامنے سارہ مسئلہ بیان کر دیتے ہیں اور ان بزرگوں ہی کی مشاورت پر سب متفق ہو جاتے ہیں۔ افسانہ ''سورہ'' میں بھی اسی پختون روایت کو پیش کیا گیا ہے۔ گاؤں کے ایک غریب لوہار فیضی کاکا کے بیٹے کے ہاتھوں اسی گاؤں کے خان کا بیٹا پائندہ خان قتل ہو جاتا ہے اور فیضی کاکا

گاؤں کے بزرگوں کا جرگہ لیکر پائندہ خان کے والد کے پاس جاتے ہیں۔ حجرہ و جرگہ پختون ثقافت کے مضبوط ادارے ہیں ۔ جرگہ متفقہ طور پر جو فیصلہ سناتا ہے ان کو فریقین کیلئے ماننا لازمی ہوتا ہے۔ بد قسمتی سے بعض اوقات ایسے فیصلے بھی کیے جاتے ہیں جو کہ قانون اور انصاف کے تقاضے پورے نہیں کرتے۔ قتل مقاتلے میں مقتول کے لواحقین تو اپنا انتقام لینے کیلئے اس فیصلے کو قبول کر لیتے ہیں جبکہ قاتل کی طرف سے قبولیت اس وجہ سے ہوتی ہے کہ اس سے اُن کی جان بخشی ہوتی ہے جرگوں کی اسی طرح کے غیر منصفانہ فیصلوں کو بھی یہاں کے افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں بیان کئے ہیں۔

افسانہ "حوالدار فقیر خان" میں کئی روز سے گمشدہ فقیر خان کو گاؤں کے خوانین فقیر خان کے والد کو ایک دوسرے کے خلاف قتل کے دعواداری پر اُکساتے ہیں۔ ایک کا کہنا ہوتا ہے کہ یہ قتل دوسرے خان کے بیٹے اور بھتیجے نے مل کر کیا ہے جبکہ دوسرا اُن کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتا ہے کہ مذکورہ قتل میں ملوث خان کا بھانجا اور نوکر ہے۔ جرگے کہ صورت میں دونوں خان اپنے تئی ایک دوسرے کو مجرم ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں گواہان پیش کیے جاتے ہیں اور قسمیں اٹھائی جاتی ہیں۔ اور بالآخر جرگہ یہ فیصلہ کرتا ہے کہ فقیر خان کا قاتل زردار خان کا نوکر ہے۔ زرداد خان کے بھانجے کو باعزت بری جبکہ نوکر کو چودہ سال قید کی سزا سنائی جاتی ہے۔

> "کچھ دنوں بعد گاؤں کے منڈی کے اڈے کے پاس ایک تانگہ آکر رکا۔ اور اس میں سے ایک شمشاد قد جوان فوجی وردی پہنے اترا۔ اور اترتے ہی سیدھا غلام خان کے گھر کی طرف چلدیا۔ ارے یہ تو فقیر ہے۔ فقیر آگیا۔ فقیر آگیا۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے، مرد عورتیں حیران تھیں کہ ماجرا کیا ہے۔۔۔۔۔۔۔ فقیر اب حوالدار فقیر خان تھا جو فوج سے ایک ہفتہ کی چھٹی گذارنے گھر آیا تھا۔ "(۲۶)

حقیقت حال یہ ہوتا ہے کہ گھر سے اجازت لئے بغیر فقیر خان فوج میں بھرتی ہو جاتا ہے اور تربیت مکمل کرنے کے بعد جب واپس گاؤں آتا ہے، تو سب لوگ حیران ہوتے ہیں۔ اس افسانے میں جرگے کے طرفداریوں جھوٹی گواہیوں اور غلط فیصلوں کو اُجاگر کیا ہے۔ اگرچہ جرگہ پختون ثقافت کی ایک اہم اکائی ہے لیکن بعض اوقات اس کے غلط فیصلیں نسلیں اُجاڑ دیتی ہیں۔ اگرچہ پختون ایک راسخ العقیدہ مسلمان قوم ہے، اور اسلام کے اُصولوں پر کاربند رہتے ہیں۔ لیکن جب پختون روایت اور عزت و ناموس کی بات آتی ہے تو یہ اسلامی اُصول و عقائد کو پس پشت ڈالتے ہیں اور روایات کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے غلط روایات میں بدلہ، انتقام، سورہ، غگ شامل ہے۔

ظلم و جبر، تخریب کاری اور ناانصافی معاشرے کی ریت بن جائے تو امن پسند لوگ بھی اس آگ سے بچ نہیں سکتے۔ انہیں بھی الاؤ جلانے والوں کے ساتھ ساتھ ماحول میں پھیلنے والے شعلوں کی تپش اور حدت کو سہنا پڑتا ہے۔ سید

انوارالحق نے پشتون معاشرے کی ایک ایسی ہی کہانی کو "حوالدار فقیر خان" میں موضوع بنایا ہے، وہ سادہ زبان اور دھیمے لہجے میں ماحول کی نقش گری افسانوی رنگ میں کرتے ہیں۔

طاہر آفریدی کا افسانہ ''برف پہاڑوں کا آدمی'' قبائلی رسم ورواج اور محبت کے باہمی تصادم کا موضوع لئے ہوئے ہے۔ اس افسانے میں طاہر نے روایتی جرگے کا ذکر کیا ہے۔ جب گل شیر کی محبوبہ زلفانہ کا والد لالچ میں آکر اس کا رشتہ دوسرے گاؤں میں طے کر دیتا ہے، تو رواج کے مطابق جرگے تک بات جاتی ہے۔

"رواج کے مطابق گاؤں میں جرگے بیٹھے کئی روز تک یہ زبانی جھگڑا چلتا رہا۔ گل شیر اس لڑکی سے دستبردار ہونے کیلئے تیار نہیں تھا۔ نہ وہ جس کو لڑکی کے والدین کے زبان دیدی تھی۔ آخر جرگے کا فیصلہ گل شیر کے حق میں ہو گیا مگر لڑکی کے باپ نے جرگے کے فیصلے کو بھی ماننے سے انکار کر دیا اور اس کی شادی اس دوسرے آدمی سے کر دی چونکہ لڑکی کے ساتھ گل شیر کا نام منسوب تھا اور جرگے نے بھی اس کے حق میں فیصلہ دیا تھا۔ اس لئے گل شیر کو اب اس لڑکی پر پورا حق حاصل تھا۔ "(۲۷)

اس افسانے میں طاہر نے مسائل کے حل کے لئے جرگہ کو پیش کیا ہے اور اس افسانے کے مرکزی کردار گل شیر کو اپنا مسئلہ جرگہ میں پیش کرتے دکھایا ہے۔ جبکہ زلفانہ کے والد کو جرگہ کے حکم عدولی کرتے دکھایا ہے۔ پختون روایات کے مطابق جب کوئی فریق جرگہ کے فیصلے کو ماننے سے انکاری ہو تو بطور سزا اس کے پورے گھر یا گھر کے کسی خاص حصے کو جلانے کا حکم دیا جاتا ہے۔ اس حکم کو قابل عمل بنانے کیلئے ''اربکی'' کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔ اربکی جو کہ قومی لشکر ہی کی ایک شکل ہے۔ اس حوالے سے راج ولی شاہ خٹک کہتے ہیں:

''''''اربکی''ایک پرانی اصطلاح ہے۔ یہ قومی سپاہی حالت جنگ میں ایک جنگی لیڈر کا کردار ادا کرتا ہے۔ اور حالت امن میں امن کے فروغ کے لیے کام کرتا ہے۔''(۲۸)

مقامی طور پر قانون کے دوسرے رستوں کی موجودگی کے باوجود جرگے کی اہمیت کسی طرح کم نہیں ہوئی ہے۔ اور قبائلی علاقوں کے طرح بندوبستی علاقوں میں بھی ابھی تک جرگے کا طریقہ کار احسن سمجھا جاتا ہے۔ خیبر پختون خوا کے دیہی ثقافت کا آئنہ دار ''حجرہ و جرگہ'' جو کہ زمانہ قدیم سے پشتون ثقافت کی اہم اکائیوں میں گردانے جاتے ہیں۔ اور پشتون قبائل میں مہمان نوازی اور متنازع مسائل کے حل کے اہم مقام و ادارے تصور کئے جاتے ہیں۔ حجرہ ایک comunity center جبکہ جرگہ dispute resolution body کے حیثیت رکھتے ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ان ثقافتی اداروں کے حیثیت مادیت پرستی کے اس دور میں ماند پڑتی جارہی ہیں۔ اور روایت پسند پشتون مادیت پرستی کا شکار ہو کر اپنے اس قدیم ثقافتی اکائیوں کو کھوتے جارہے ہیں۔ وہ ان اداروں کو زمانے کی بدلتی حالت کے ساتھ تبدیل اور ان میں

جدّت لانے سے قاصر رہے۔ نفسا نفسی کے اس دور میں ہر کوئی اُکتاہٹ کا شکار ہے اور باہمی محبت وبھائی چارے کا وہ قدیم ماحول مفقود ہو کر رہ گیا ہے۔ یقیناً تمام پشتون رہنماؤں کو مل بیٹھ کر ''حجرہ و جرگہ'' کو ایک جدید شکل میں اور قابل قبول اداروں کے طور پر پھر سے زندہ کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

(پ)۔رسوم ورواج:

جب ایک قانون اتنا پرانا ہو جائے کہ وہ ایک قوم، ایک نسل کے رگ وپے میں بس جائے تو وہ رواج بن جاتا ہے اور اکثر اپنی ضرورت و افادیت ختم ہو جانے کے بعد بھی عرصہ دراز تک رائج و حاوی رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دریائے آمو اور دریائے سندھ کے درمیان ایک ہی جغرافیائی وحدت میں رہتے ہوئے پشتونوں کے مختلف قبائل، مختلف رسم و رواج اور روایات کے باوجود ایک ہی قومی دھارے اور ثقافتی و تہذیبی دائرے میں اپنی مخصوص قبائلی شناخت کے ساتھ رہتے چلے آرہے ہیں۔ رسم ورواج کسی بھی معاشرے میں خاص اہمیت کے حامل ہوتے ہیں اور تہذیب کے زندہ ہونے کا ثبوت بھی انہی کے موجودگی سے ہوتا ہے۔ پشتون معاشرت میں زندگی میسر کرنے کے تمام طور طریقے، رویے اور اخلاقی ضابطے ان کے کھانے پینے، لباس، رہن سہن، رسم و رواج، میلے ٹھیلے اور کھیل کود کے علاوہ قومی نوعیت کے ادارے، مقامات اور آپس کے معاملات و تعلقات، مذہبی رسومات، شادی بیاہ، خوشی غمی اور رشتوں کے طور طریقے اور وسائل و مسائل کے حوالے سے قوانین وغیرہ یہ سب پشتون ثقافت و تہذیب کے مختلف روپ اور شکل پیش کرتے ہیں۔ خیبر پختون خوا کے دیہی تہذیب و ثقافت میں مختلف رسوم ورواج زمانہ قدیم سے چلے آرہے ہیں۔ اولاد نرینہ ایک بیش بہا عطیہ خداوندی ہے لیکن پشتون معاشرت میں جہاں وراثت اور بہت سارے وجوہات کے بنا اولاد نرینہ کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے اور اس کے پیدائش پر عجیب طرح کی خوشی، ہوائی فائرنگ، بنگڑے اور محافل موسیقی کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ مُفلس درانی نے اپنے افسانہ ''بیٹا دو روپے کا'' میں اس منظر کو پیش کیا ہے جب گاؤں کے خان شیر علی خان کے یہاں بیٹا پیدا ہوتا ہے تو وہ کس طرح دل کھول کر نوٹ نچھاور کرتا ہے اور پشتون ولی کے تقاضوں کے مطابق بیٹے کے پیدائش پر خوشی منانے کا اہتمام کرتا ہے:

> "اور پھر ایک دن اس کی دعائیں قبول ہو گئیں۔ اللہ نے اسے ایک خوبصورت بیٹا عطا فرمایا۔ شیر علی نے طوائفوں پر نوٹ نچھاور کرنے کے ساتھ ساتھ فقیروں کی جھولیاں بھی بھر دیں۔ مہینوں حجرے میں موسیقی کے محافل جمی رہی۔"(۲۹)

افسانہ نگار نے معاشرے میں رواج پذیر رسموں کا ذکر اس انداز سے کیا ہے کہ اگرچہ شیر علی خان عمر کے اس حصے میں ہے، اور بہت پرہیز گار اور دین دار ہے لیکن اس موقع پر مذہبی اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر معاشرتی رسم و

رواج کے مطابق روپے کا بے دریغ استعمال کر کے نہ صرف طوائفوں بلکہ فقیروں اور غریبوں پر نوٹ نچھاور کر تا جارہا ہے ہوائی فائرنگ اور بنگڑے ڈالے جارہے ہیں۔ رسوم ورواج زمانی اثرات قبول کرتے ہوئے یا تو اپنی شکل تبدیل کرتے ہیں یا پھر سرے سے ختم ہو جاتے ہیں پشتون معاشرت میں بھی بعض رسوم ورواج ختم ہوتے جارہے ہیں سمندر خان سمندرؔ نے اپنے افسانوں میں کچھ ایسے معاشرتی رسومات کا ذکر کیا ہیں جو کہ اب ناپید ہو گئے ہیں۔ اپنے افسانے ''چادر اور شملہ'' میں افسانہ نگار نے شادی بیاہ کے موقع کے چند ایسے رسوم کا ذکر کیا ہے۔

> "مانڑی والوں کو بارات کی آمد کا جب علم ہوا تو انھوں نے راستے میں لکڑی کی کیلیں گاڑدیں، اس لیے دیہی رسم ورواج کے روسے جب تک باراتی چاندماری سے انھیں ختم نہ کریں بارات آگے نہ جاسکتی تھی۔"(۳۰)

شادی بیاہ کے ایک اور رسم کے مطابق لڑکی والے بارات کی آمد پر دور پہاڑ کی چوٹی پر ایک نشانہ رکھ دیتے ہے اور جب تک گولی نشانی پر نہیں لگتی تب تک باراتی دلہن کو نہیں لے جاسکتے۔ اس لئے اکثر شادیوں میں دلہا والے ایسے ماہر نشانہ بازوں کو ساتھ لے جاتے جو جلد از جلد مقررہ نشانہ کو مار گراتے اور جتنی جلدی نشانہ مار گرایا جاتا اتنی جلدی بارات واپس اپنے گاؤں پہنچ جاتی جو کہ بہت فخر کی بات ہوتی۔ اس طرح ایک اور رسم ''چاندماری'' کی تھی بارات والے جس گاؤں سے گزرتے تو گاؤں کے منچلے جو ان بارات کے راستے میں لکڑی کے کیلیں گاڑ دیتے اور جب تک باراتی ان کیلوں کو فائر کر کے اُکھڑوا نہ دیتے تب تک وہاں سے نہیں گزر سکتے تھے۔ شادی بیاہ تقریباً تمام تہذیبوں میں شادمانی و مسرّتوں کا موقع ہوتا ہے۔ پشتون روایات کے مطابق ایسے موقع پر ڈھول سُرنا، ہوائی فائرنگ اور ناچ گانوں کا اہتمام ہوتا ہے۔ روایتی ناچ اتنڑ اور خٹک ڈانس جو کہ تقریباً تمام خیبر پختون خوا میں مقبول عام ہے ناچا جاتا ہے۔ طوائفوں اور خواجہ سراؤں ''لختئ'' کے ناچنے گانے کے محافل سجائے جاتے ہیں۔ یہاں کے افسانہ نگاروں نے خوشی کے ایسے مواقع اپنے افسانوں میں بہترین منظر کشی کے ساتھ پیش کئے ہیں۔ افسانہ ''برات'' میں ظریف خان کے نفسیاتی اُلجھنوں اور معاشرتی رویوں کو افسانہ نگار نے بہترین الفاظ میں بیان کیا ہے جب ظریف خان بیوی کے وفات پر اپنے چھوٹے بیٹے کے خاطر دوسری شادی نہ کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ شادی کی شدید خواہش اور معاشرتی رویوں سے نفسیاتی جھگڑن کا شکار ہو کر گھوڑے پر سوار دور پہاڑی سے گاؤں کا نظارہ کرتا ہے، تو خیالوں ہی خیالوں میں بارات، دلہن اور اتنڑ کرتے جوانوں کا منظر دکھائی دیتا ہے:

> "دلہن سرخ گیند کی مانند سرخ شال اور عروسی ملبوسات میں لپٹی ہوئی گھوڑی پر سوار تھی۔ کسی کے دل کے آرماں فائرنگ کے گنگناہٹ اور ڈھول و بانسری کے مدھ بھرے سازوں میں "اتنڑ ڈانس" کرتے پہاڑ کے دامن میں گاؤں کے طرف رواں تھے۔"(۳۱)

پشتون رسم ورواج میں ''اتنڑ'' ایک رسم بھی ہے اور رواج بھی، ایک طرف یہ ایک قسم کا ثقافتی ناچ یا ڈانس ہے۔ جو کہ خوشی کے موقع پر ناچا جاتا ہے جبکہ تاریخی حوالوں سے یہ جب بگل جنگ بجتا تو جو جوان اس میں شامل ہوتا اس کا مطلب ہوتا کہ وہ جنگ میں جانے کیلئے تیار ہے۔ اتنڑ پشتون قبائل کا ایک خاص ناچ بھی ہے اور رسم بھی۔ جس کی مثال دیگر ثقافتوں میں کم ملتا ہے۔ دیہی علاقوں میں اکثر کام مشترکہ طور پر سرانجام دئے جاتے ہیں۔ اور مل کر کسی شخص کے مدد کرتے ہیں۔ عام طور پر کھیتی باڑی کے کاموں میں فصل کاٹنے یا کرش کرنے جسے پشتو میں ''غوبل'' کہتے ہیں۔ اس موقع پر اکثر عزیز ولی یا خیل قبیلہ کے لوگ جمع ہو کر ایک دوسرے کا ہاتھ بٹھاتے ہیں۔ لیکن وسیع معنوں میں دوستوں اور رشتہ داروں کے علاوہ بھی لوگ شامل ہو سکتے ہیں۔ چونکہ نئے فصل کی آمد کسان کیلئے خوشی کا موقع ہوتا ہے اس لئے موسیقی اور ڈھول وغیرہ کا بندوبست کرتا ہے۔ اس طرح مل کر مشترکہ کام کرنے کو مقامی طور پر ''اشر'' کہتے ہیں۔ یہ پشتون قبائل کی ایک رسم بھی ہے اور رواج بھی مختلف افسانہ نگاروں نے اس رسم کو اپنے افسانوں میں برتا ہے افسانہ ''آن'' میں اسی طرح کی ''اشر'' کا بیان ہے جس سے اشر کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے:

> ''دیہاتوں میں قاعدہ ہے کہ بیاہ شادی یا اس قسم کے دوسرے سوشل کاموں میں باہمی تعاون کرکے ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے ہیں پشتو میں اسے اشر کہتے ہیں۔"(۳۲)

افسانے میں اعظم خان کے ''غوبل'' میں دوست احباب، رشتہ دار اور گاؤں والے جمع ہو کر فصل گاہ کرتے ہیں ۔ ڈھول سُرنا کے تاپ میں دنوں کا کام گھنٹوں میں مکمل ہو جاتا ہے افسانہ نگار پشتون ثقافت کے اس رسم کو اتفاق وبھائی چارے کے طور پر پیش کرتا ہے۔ یہ پشتون ولی کی ایک قدیم اور خوبصورت رسم ہے جو کہ آج کل بھی دیہات میں نبھایا جاتا ہے۔

خیبر پختون خوا کے افسانہ نگاروں نے معاشرتی عکاسی کرتے ہوئے اپنے افسانوں میں یہاں کے دیہاتیوں کو بندوق تھامے دکھایا ہے خوشی و غمی ہر موقع پر ان کے کردار کلاشنکوف تھامے نظر آرہے ہیں۔ اور شادی کے موقع پر بندوق اور ہوائی فائرنگ کا ہونا تو لازمی ہے۔ خوشی کے موقع پر ہوائی فائرنگ کرنے کی رسم پشتون ثقافت کا حصہ ہے۔ کسی کے یہاں رشتہ مانگنے اور پکّا ہونے پر شدید ہوائی فائرنگ عام سی بات ہوتی ہے۔ افسانہ "چند لمحوں کی خوشی" میں افسانہ نگار نے ہوئی فائرنگ اور اس کا نتیجہ کو اس طرح پیش کیا ہے۔

> "میں نے اپنی ماں کی گود میں ثانیہ کو خون میں لت پت دیکھا۔ میری ماں دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ میں بے یقینی سے کبھی ثانیہ کو اور کبھی اپنے ماں کو دیکھتا رہا" یہ نہیں ہو سکتا "۔۔۔۔۔ میری آنکھوں کے سامنے

اندھیرا سا چھا گیا۔۔۔۔۔۔۔۔پلک جھپکتے ہنستا مسکراتا گھرانہ اجڑ گیا کسی بے حس کی چند لمحوں کی خوشی نے میرے دل کی دنیا برباد کر دی۔"(۳۳)

یہاں کے دیہی علاقوں اور قبائل میں کسی بھی خوشی کے موقع پر ہوائی فائرنگ ایک عام سی بات ہوتی ہے۔دو خاندانوں کے بیچ لڑکا، لڑکی کی رشتے کی بات پکی ہونے پر نتائج سے بے پرواہو کر دوست احباب، رشتہ دار اور جوان لوگوں کو خبر کرنے کیلئے بے تحاشہ ہوائی فائرنگ کرتے ہیں۔شادی کے موقع پر ہوائی فائرنگ، ڈھول سُرنا، اتنڑ اور طوائفوں اور خواجہ سراؤں "لحتئ" کے ناچ گانے کے محافل پشتون ثقافت کا حصّہ ہے۔ان سب کا اہتمام نہ کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ شادی امیر کی ہو یا غریب دہقان کی مذکورہ لوازمات کا ہونا لازمی ہوتا ہے۔افسانہ "گردصحرا"میں افسانہ نگار نے ان تمام رسومات کو اپنی تمام جُزئیات کے ساتھ پیش کئے ہیں۔دعوت ولیمہ میں عموماً چاول اور گوشت کے دیگیں تیار کر کے سارے گاؤں والوں اور دوست احباب کو مدعو کر کے تواضع کیا جاتا ہے۔گاؤں کے حجرے میں مہمانوں کے مہمانداری کیلئے سب کمربستہ ہوتے ہیں۔اس موقع پر عموماً سارا خرچہ دُلہا کے گھر والے کرتے ہیں نہ صرف اپنے مہمانوں کیلئے بلکہ لڑکی کے گھر آئے مہمانوں کیلئے تیار کھانا بھجوایا جاتا ہے۔پشتونوں کے مختلف دیہات میں شادی کے حوالے سے مختلف رسوم کا رواج ہے۔بعض علاقوں میں لڑکی دینے کے عوض لڑکے والوں سے رقم لی جاتی ہے، لیکن یہ رواج اب ختم ہوتا جا رہا ہے جبکہ بعض مقامات پر شادی کے رسومات کے ادائیگی کیلئے کھانے پینے کے اشیاء مہیا کرنا لڑکے والوں کی ذمہ داری ہوتی ہے۔شادی میں ہوائی فائرنگ کی رسم تو عام ہے لیکن ناچ گانے اور طوائفوں کے محافل بعض مذہب پسند حلقوں میں معیوب جانے جاتے ہیں اور وہاں ناچ گانے کے بجائے مولود شریف کے محافل، ختم قرآن کے محافل اور اس موقع پر لوگوں کے ضیافت کیلئے کھانوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔افسانہ "دوشیزگی کی نشانی"میں اسی طرح کی منظر کشی کی گئی ہے۔

"نکاح کے دن سے سات روز پہلے قرب وجوار کے مشہور علماء اکھٹے ہونے شروع ہوئے اور پھر مولود شریف ہوا اور نعت خوانوں نے ابھی چار راتیں بھی جاگ کر نہ گزاری تھیں پندرہ بلخی بھیڑوں میں سے ابھی آٹھ بھیڑیں باقی تھیں اور سبز چائے کی پیٹی ابھی نصف سے زیادہ باقی تھی۔"(۳۴)

افسانہ نگار نے دبے الفاظ میں ان مذہب پرستوں کے دُغلے پن کو آشکار کیا ہے، کہ جو اگرچہ روایتی ناچ گانے کے محافل کا انعقاد تو نہیں کرتے لیکن جاہ و حشم، رعب و دبدبہ اور امیری جتانے کیلئے مبینہ دینی محافل منعقد کر کے ان پر بے تحاشا روپے پیسہ خرچ کرتے ہیں۔سات دن تک آس پاس کے گاؤں والوں اور نعت خوانوں کو بُلا کر دُنبے ذبح کر کے لوگوں کو کھانے کھلائے جاتے ہیں۔افسانہ نگار نے ذو معنی انداز میں اگر اس طرح کے محافل کو یہاں کے لوگوں کے دین سے والہانہ لگاؤ کو قرار دیا ہے، تو دوسری طرف ایک اچھوتے انداز میں امیری جتانا بھی گردانا ہے۔یہاں کے افسانہ نگاروں

نے اگرچہ اپنے افسانوں میں زیادہ تر پشتون نوجوانوں کو بندوق تھامے دکھایا ہے اور شادی بیاہ کے موقع پر ہوائی فائرنگ کو قدیم روایت قرار دیا ہے۔ لیکن دوسری طرف انہوں نے اس ہوائی فائرنگ کے بھیانک نتائج بھی پیش کئے ہیں۔افسانہ ''پہچان'' میں زیتون بانوں نے اسی روایتی پشتون رسم کے بھینٹ چڑھتے اکرام کو عین شادی کے دن گولی کا نشانہ بنتے ہوئے ان کی نئی نویلی دلہن کو بیوہ ہوتے اور شادمانی کو ماتم میں بدلتے دکھایا ہے۔

اشر آف حسین احمد اپنے افسانے ''نانی مریم'' میں پشتون قبائل کے اس رسم کا ذکر کیا ہے۔ جس میں عورتیں میّت پر بین کرتے ہوئے اپنے بال نوچتی اور سینہ کوبی کرتی ہے چادر و دوپٹہ پھاڑ دیتی ہیں۔اور گریبان تک چاک کر دیتی ہیں۔ میّت پر زیادہ بین کو قابل تعظیم و فخر گردانا جاتا ہے۔ جبکہ طاہر آفریدی نے فوتگی کے موقع پر پشتون قبائل کے بھائی چارے پر مبنی دستور کا ذکر کیا ہے، کہ جس گھر میں فوتگی ہوتی ہے تو تین دن تک وہاں پر آگ نہیں جلائی جاتی آنے والے مہمانوں کیلئے کھانے وغیرہ کا انتظام خیل، قبیلہ یا محلّے والے کرتے ہیں جبکہ تیسرے یا عام طور پر چالیسویں دن میّت کے گھر والے ایک بڑے ضیافت کا اہتمام کرتے ہیں۔ جسے مقامی زبان میں ''خیرات'' کہا جاتا ہے۔ بھیڑ، دُنبے یا کوئی بڑا جانور ذبح کر کے سارے گاؤں والوں اور آس پاس کے علاقے والوں کو مدعو کیا جاتا ہے۔ رواج، دستور، رسم زمانی تبدّل و تغیر کے ساتھ اپنی شکل، اہمیت و افادیت تبدیل کرتی رہتی ہے۔ بعض رسوم و رواج مزید بہتری کی طرف گامزن جبکہ بعض نہایت فرسودگی کا شکار ہو جاتی ہے، زمانہ قدیم سے پشتون ثقافت میں رواج پذیر رسم ''سورہ'' جو کہ فریقین میں آمن و آشتی، دوستی اور باہم شیر و شکر ہونے کا سبب گردانا جانا جاتا تھا۔ آج کل خیبر پختون خوا کے بعض دیہی علاقوں میں نہایت فرسودہ شکل میں موجود ہے۔ تاریخی طور پر مختلف پشتون قبائل میں قتل مقاتلے کے فیصلے کے طور پر جرگہ چار طرح کے فیصلے کرتے۔ (۱) قتل کرنا یعنی قصاص (۲) دیت دینا جس کو ''نیکہ'' بھی کہتے ہیں (۳) عورت یا سورہ دینا (۴) جلاوطن کرنا۔ جرگہ کے فیصلے کے مطابق فریقین ایک دوسرے کو بہ رضا و رغبت معاف کر دیتے اور آئندہ کیلئے باہم شیر و شکر ہونے کے لیے قاتل کے گھر والے کسی لڑکی کو مقتول کے بھائی یا رشتہ دار کو بیاہ دیتے۔ اوائل میں یہ کام نہایت نیک دلی کیساتھ کیا جاتا اور عموماً دونوں خاندان رشتہ میں منسلک ہو کر دشمنی بھول جاتے لیکن رفتہ رفتہ اس رسم نے غلط شکل اختیار کی اور بطور ''سورہ'' آنے والی خاتون کیساتھ ناروا رویّہ روا رکھا جاتا اور ذلّت آمیز زندگی گزارنے پر مجبور ہوتی۔ خاندان کے مرد کی کئے کے سزا اس بچاری کو بھگتنا پڑتی۔ عبدالکافی ادیب نے افسانہ ''سورہ'' میں اس طرح کے رویّے کا شکار لڑکی کی کہانی بیان کی ہے۔ اور اس قبیح رسم کا نتیجہ بھی دکھلایا ہے۔

"سعید اپنی بہن کی لاش کی طرف اشارہ کر کے کہا "دیکھ لو اج میری معصوم بہن تمہارے خود ساختہ اندھے سماج کی بھینٹ چڑھ گئی مگر یاد رکھو وہ دن دور نہیں کہ تمہاری بہن بیٹی کی بھی یہی حالت ہو گی مگر اس وقت تمہیں مجبوراًاس پرانے سماج کی کینچلی بدلنی ہو گی۔"(۳۵)

اس افسانے میں رسم ''سورہ'' کا شکار دس سالہ چھوٹی بچی ''زبیدہ'' کی قربانی، اس پر ڈھائے گئے مظالم، جرگے کے ارکان مقامی مسجد کے امام اور گاؤں کے خان کی سنگدلی، زبیدہ کے شوہر اکرام اور سوتن کلثوم کا ہتک آمیز جبر و تشدّد زبیدہ کے والد بابا رحمت اور بھائی سعید کی بے بسی اور آخر میں معصوم زبیدہ کا بھائی کیلئے جان تک دینے کی قربانی کا بیان موجود ہے۔ افسانہ نگار نے مہارت کے ساتھ اس رسم قبیح کی فرسودگی اور بھینٹ چڑھتے معصوم بچّیوں کے احساسات اور معاشرتی جبر کو آشکار کیا ہے۔

خیبر پختون خوا کی دیہی معاشرت میں جہاں مثبت اقدار اور اچھی روایات کی پاسداری کی جاتی ہیں وہاں کچھ قبیح رسمیں بھی اس معاشرت کا حصہ بنتی چلی آ رہی ہیں۔ رسم سورہ کی طرح رسم ''ولور'' یعنی بیٹی کے رشتے کے عوض پیسے لینا جیسے رسم قبیح عرصہ دراز سے چلی آ رہی ہے۔ یہ رسم سارے پشتون معاشرت میں عام تھی اور ہر خاص و عام اس رسم میں برابر کا حصہ دار تھا۔ یہاں تک کہ مذہبی حلقوں میں بھی اسے برا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ جس لڑکی کے عوض جتنے زیادہ پیسے دئے جاتے سُسرال میں اس کو اتنی عزّت دی جاتی۔ دوسری طرف رقم لینے کی عوض لڑکی کو جہیز بھی اتنی ہی ملتی یعنی جتنی رقم زیادہ اتنی زیادہ جہیز۔ ''ولور'' کو اس زمانے میں ایک رسم کی حیثیت حاصل تھی خرید و فروخت کا تصور تک نہ تھا لیکن رفتہ رفتہ اس رسم نے ایک بھیانک صورت اختیار کی اور اس کو مالی منفعت اور معاشی استحکام کا ذریعہ بنالیا گیا۔ بتدریج اس کے خلاف معاشرتی رویّوں نے جنم لینا شروع کیا اور مہذب و باشعور لوگوں نے اس کو ترک کر دیا جبکہ بعض طبقوں نے اس کی حالت تبدیل کر دی اور نقد کی جگہ شادی کے رسوم پر اخراجات، کھانے پینے کے اشیاء اور جہیز کی صورت میں لینے لگے۔ تقریباً ہر دور میں یہاں کے افسانہ نگاروں نے اس رسم قبیح کا تذکرہ اپنے افسانوں میں کیا ہے۔ طاہر آفریدی نے افسانہ ''کھلا صندوق'' میں ان طنزیہ جملوں سے اس کو نوازا ہے:

''اس کی تو ماں، باپ یا بھائی گائے بکری کی طرح قیمت لگاتا ہے۔'' (۳۶)

یہاں کے افسانہ نگاروں نے رسم ''ولور'' کے بُرے پہلوؤں اور بہیانک چہرے کو قاری کیلئے آشکار کئے ہیں۔ اور اس رسم کے غیر اخلاقی اور غیر انسانی ہونے اور معاشرت پر بُرے اثرات کو واضح کیا ہے۔ اس رسم کی تحت بیاہی گئی لڑکی ساری عمر مصائیب و مشکلات کا شکار رہتی ہے۔ لڑکے والے اسے زر خرید لونڈی سمجھتے جبکہ لڑکی کے والدین شدید خواہش کے باوجود اس کے عوض رقم وصولی کے بنا سُسرال میں اس کو حق دلانے اور جائز حیثیت منوانے کے پوزیشن میں نہیں ہوتے۔ یہ

رسم قبیح اگرچہ صدیوں سے چلا آرہا ہے لیکن جدت زمانہ اور علمی آگہی کے بنا اب یہ سمٹ کر پختون خوا کے ان علاقوں تک محدود ہو گیا ہے جو کہ پڑوسی ملک افغانستان سے ملحقہ ہیں افسانہ ''ایک آنے کا بیٹا'' میں رسم ولور سے پیدا شدہ ایسی صورت حال کو افسانہ نگار نے قمر گُل کی ماں کی زبانی یوں بیان کیا ہے:

"میں تیراہ کی رہنے والی ہوں باپ نے مجھے ڈیڑھ ہزار روپے میں بیچ ڈالا تھا۔ میرا خاوند اچھا تھا لیکن تین سوتیلے بھائیوں کی اس سے نہیں بنتی تھی۔ قمر گل ابھی میرے پیٹ میں تھا کہ یتیم ہو گیا کسی نے اس کے باپ کو قتل کر دیا تھا اور پھر تین مہینے بعد قمر گل پیدا ہو گیا۔ بڑے دیور نے زبردستی مجھے گھر میں ڈال لیا اور طرح طرح کے ظلم مجھ پر توڑے جانے لگے لیکن میں سب کچھ برداشت کرتی رہی صرف اپنے قمر گل کے لیے میں سارے گھر کی خدمت گار بن گئی۔"(۳۷)

پشتون معاشرے میں گھر بیاہی عورت کو ہر صورت اپنا حق تصور کرتی ہے۔ بیوہ گی کی صورت میں اس کے خواہش کے بر خلاف اسی گھر میں کسی دوسرے مرد کو بیاہی جاتی ہے۔ یوں ان کے بقول گھر کی عزت گھر ہی میں رہ گئی، بے شک اس کی مرضی کے خلاف ہو۔ پھر اس کے ساتھ رویّہ بھی منکوحہ بیوی کی طرح کا نہیں ہوتا بلکہ یہ شادی تو غیرت کے تقاضوں کو پورا کرنے معاشرت کے انگشت نمائی اور بھائی کے اولاد کی سرپرستی کرنے لیکن حقیقتاً اس کی جائداد ہتھیانے ہی کیلیئے کی جاتی ہے۔ اس افسانے میں قمر گُل کی ماں شوہر کے فوت ہو جانے کے بعد اس کے سوتیلے بھائیوں کے جبر کا شکار رہی وہ اپنے قمر گل کے خاطر سب کچھ برداشت کرتی رہی جبکہ اس کے والدین ولور کے رقم وصولی کے بنا اس کا حق منوانے سے قاصر رہے۔ قمر گل کا چچا ان کے جائیداد ہتھیانے یہاں تک کہ ان کے جان لینے کی درپے تھا۔ صورت حال کو بھانپتی ہوئی قمر گل کی ماں پشاور بھاگ گئی۔ اس دوڑ دھوپ میں وہ بیٹے سے ہاتھ دھوتی ہیں اور خود بھی پاگل ہو جاتی ہے۔ افسانہ نگار نے رسم ولور کے بھیانک نتائج اور اس رسم کی برے اثرات سے باخبر رہنے اور اس کا قلع قمع کرنے کے اپنے تئیں بھرپور کوشش کی ہے۔ شائد اس رسم ولور کا معاشرتی رد عمل ہے کہ اب یہاں جہیز جیسا ہندوانہ رسم اس قدر عام ہو چکا ہے کہ ایک معاشرتی کرب کی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ جہیز نہ ہونے کی وجہ سے کئی معصوم کلیاں اپنی جوانی ماں باپ کے گھر بتا دیتی ہیں اور اسی لعنت کی وجہ سے کالی بال سفید کر دیتی ہیں۔ شائد رسم ولور کی ابتداء سے اب تک جتنے بچیوں کے عوض لڑکے والوں سے رقم وصول کئے گئے ہیں آج کے والدین وہی قرض جہیز کی صورت میں چکا رہی ہے۔ صدیوں پُرانے پشتون ثقافت میں نت نئے اور عجیب قسم کے رسوم پائے جاتے ہیں۔ ولور اور سورہ جیسے فرسودہ روایات کی طرح چادر پھاڑنے یا زلف کاٹنے کی بھی ایک قدیم رسم کافی عرصہ تک موجود رہی اور یہاں کے افسانہ نگاروں نے اس کا ذکر اور خراب اثرات کو نہ صرف اپنے افسانوں میں برتا ہے بلکہ اس کی تدارک کا بھی شدید اظہار کیا ہے۔

عرصہ دراز سے پشتون دیہی معاشرت میں ایک رواج عام تھی کہ جب کوئی عاشق اپنے محبوبہ کو ہر طرح کے کوشش کے باوجود بھی حاصل نہ کر سکتا تو بالآخر اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر سرعام محبوبہ کی چادر پھاڑ تا یا زلف کاٹ لیتا۔یوں اگرچہ وہ تو کبھی کسی صورت اپنی محبوبہ کو حاصل تو نہ کر سکتا لیکن اس اقدام کی وجہ سے محبوبہ اس قابل بھی نہ رہتی کہ کوئی اسے بیاہ کرلے جاسکتا۔اس طرح کے اقدام سے نہ صرف خاندانوں میں دشمنیاں شروع ہو جاتی بلکہ اکثر و بیشتر عاشق مخالف کے گولی کا شکار ہو جاتا۔

افسانہ "خاموش نگاہیں" میں رحیم گل نے اسی رسم قبیح کے اثرات بد، وجوہات اور تدارک کا ذکر کیا ہیں۔ساتھ ہی اس افسانے میں رسم ولور کا ذکر بھی ہے، کہ جب ولی خان اپنے ماموزاد مہر جان کا رشتہ مانگنے پر ولور کی رقم پورا کرنے کیلیئے بمبئی جانے سے پہلے گودر "پنگھٹ" پر اس کا زلف کاٹ دیتا ہے۔رحیم گل نے مہر جان کی والد کی لالچ اور بد عہدی کہ ولور کی زیادہ رقم ملنے پر مہر جان کی شادی کسی دوسرے شخص سے کرادی اور ولی خان کی بے بسی و لاچاری اور محبت میں ناکامی پر بہترین لفاظّی کے ساتھ اس منظر کو کچھ یوں پیش کیا ہے:

"اس نے دوبارہ جیب میں ہاتھ ڈالا اور اپنی چھوٹی سی ڈبیہ نکال کر کھولی۔۔۔۔۔۔ننھی مُنی رلف نے اپنی چھوٹی سی گولائی میں تمام کائینات کو لپیٹ لیا تھا۔۔۔۔۔۔اس نے راکھ کے ڈھیر سے اک چٹکی بھری اور ڈبیہ میں ڈال دی۔۔۔۔۔۔دو آنسو گرے ۔۔۔۔۔۔ایک زلف میں اٹک کر جگمگانے لگا اور دسرا سیاہ راک میں گر کر جذب ہو گیا!!"(۳۸)

افسانہ نگار نے رواج پذیر رسم قبیح کی فرسودگی، معاشرتی بے حسی، لالچ اور اس کی وجہ سے نسل در نسل چلتی دشمنیوں، اس کے نتیجے میں ڈوبتے انسانیت اور غرق ہوتے معصوم کلیوں، عورت کی تذلیل اور معاشرتی گُھٹن کو آشکار کیا ہے۔اسی طرح کی ایک اور رسم جسے مقامی طور پر "غگ" کہا جاتا ہے، کا ذکر بھی جا بجا ملتا ہے۔کہ جس میں ایک ناکام عاشق یا سر پھرا دشمن کس کے در پر جاکر سرعام اس کی بہن، بیٹی سے اظہار محبت کرتا ہے اور اس کی اپنائیت یا ہر صورت حصول کا عہد کرتا، یہ اقدام سرعام اور بہ آواز بلند ہوتا تاکہ اہل محلہ و علاقہ باخبر ہو یہ اقدام یا تو محبت میں ناکامی اور کسی صورت محبوبہ کی ملنے سے نااُمیدی کے بعد یا پھر کسی کو دشمنی میں حد سے گزر کر اس کو بدنام کرنے کے لیے کیا جاتا۔یوں اس کے نتیجے میں کئے لاشیں گرتے، کئے معصوم کلیاں مسل جبکہ جوان اپنے زندگیوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے، نسل در نسل دشمنیاں چلتی۔انفرادی و اجتماعی توانائیاں عبث صرف ہوتی۔اور معاشرہ گھٹن اور کرب کا شکار ہو جاتا۔انفرادی و اجتماعی طور پر منفی رویّے جنم لیتی۔

خیبر پختون خوا کے دیہی ثقافت میں روایت پذیر رسموں میں جہاں اشر، جرگہ "ننواتے" اور بدرگہ جیسے قابل تقلید رسمیں موجود ہیں، وہاں فرسودہ رسموں میں ایک ختنہ کی رسم بھی ہے۔ جہاں اولاد نرینہ کے پیدائش پر بہت زیادہ خوشی منائی جاتی ہے ہوائی فائرنگ، ضیافتیں، طوائفوں اور خواجہ سراؤں کے محافل، ڈھول سُرنا اور اتنڑ وغیرہ کا خاص اہتمام ہوتا ہے بالکل اسی طرح اس بچّے کے ختنے پر بھی مذکورہ محافل سجائے جاتے ہیں۔ دوست احباب، رشتہ دار، قام قبیلہ کے لوگوں کو مدعو کیا جاتا ہے۔ رنگ و سرور کے محافل سجائے جاتے ہیں۔ بے تحاشہ ہوائی فائرنگ اور بے دریغ نوٹ نچھاور کئے جاتے ہیں۔ جہیز کی لعنت کی طرح بچّے کے ننھیال کے ساتھ اس موقع پر بھی بہت کچھ دینے کی فکر رہتی ہے اور اس طرح بچّے کے پیدائش پر اگر ایک طرف خوشی ہوتی ہے تو ساتھ ہی ننھیال والوں کو صابن سے لیکر سونے کی انگوٹھی تک دینے کا انتظام کرنا پڑتا ہے ورنہ معاشرے میں ناک کٹ جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ خان کے بیٹے کے رسم ختنہ پر حجرے میں ہونے اولی ٹنگ ٹکور کی افسانہ نگار نے اس طرح سے منظر کشی کی ہے:

> "رسم ختنہ کی ادائیگی کا دن جوں جوں قریب آتا گیا تیاریاں اتنے زور و شور سے تیز ہوتی گئی۔ کھیل تماشوں کے علاوہ لختئی اور لاہور سے خاص طور پر بلائے گئے طوائفیں بھی اپنا جھلک دکھلائے گی۔ غندل خان بولتا گیا اور کسان انہماک سے سنتے رہے۔"(۳۹)

اس طرح کے رسموں سے غریب اور پسماندہ طبقات احساس کمتری کا شکار ہوتے ہیں۔ اور متوسط لوگ معاشرتی ہمسری اور ہم پلّہ ہونے کیلئے نت نئے غیر انسانی اور غیر اخلاقی طریقے اپنا کر دولت کے حصول کی کوشش کرتے ہیں اور نتیجتاً معاشرہ برائے اور قباحت کی طرف گامزن ہو جاتا ہے۔ افسانہ نگار نے فنّی محارت کے ساتھ معاشرہ میں موجود رسم بھائی چارے پر مبنی "غوبل" کا ذکر کرتے ہوئے ساتھ ہی اس رسم قبیح کا ذکر بھی کیا ہے اور معاشرے میں موجود روایات کی محاسن و معائب قاری کیلئے عیّاں کئے ہیں۔

پشتون روایات اور قبائلی معاشرت کی نبض شناس افسانہ نگار فہمیدہ اختر نے اپنے افسانوں میں قبائلی زندگی کے تمام پہلوؤں کو ان کے ریت و رسم، بود و باش، طرز معاشرت اور روایات کو پیش کیا ہے۔ افسانہ "نشانہ" میں تبادلے کی شادی "وٹہ سٹہ" جیسے فرسودہ رسم کی قباحت بیان کی ہے۔ کہ جس کی وجہ سے کئے خوشحال اور ہنستے بستے گھر اُجڑ گئے کئے معصوم کلیاں مُرجھا گئی ان کے آرزوئیں اور سپنے ٹوٹ گئے اور آرمان خاکستہ ہوئیں۔ میری خیل قبائل کے ایک ایسی ہی خاندان کے اس فرسودہ رسم کے ہتّھے چڑھتی کہانی کو افسانہ نگار نے بیان کیا ہے۔ رومانہ سے دلّی محبت کے باوجود معاشرت اور روایات سے مجبور ساز گُل کے بہ امری مجبوری آخری الفاظ کو کچھ یوں بیان کیا ہے:

"گھر میں گھستے ہی ساز گُل نے بہن کو پکارا۔"خور شائے"اس کی آواز باغیانہ تھی۔"کیا ہے"۔چونک کر مگر روٹھی ہوئے انداز میں بولی۔"رومانہ سے کہ دو کہ اس وقت میرے گھر سے نکل جائے۔میں بے غیرت نہیں ہوں۔میں اسے اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتا اگر میری بہن کی جگہ میداخان کے گھر میں نہیں ہو سکتی تو میداخان کی بہن کی جگہ میرے گھر میں نہیں ہو سکے گی۔"(۴۰)

افسانہ نگار نے ایک بستے بستے گھر کو اُجڑتے دکھایا ہے۔راز گُل نے نہ چاہتے ہوئے بھی رومانہ کو گھر سے نکال دیا۔وہ معاشرتی طعنہ زنی اور انگشت نمائی کو برداشت نہ کر سکا اور میداخان سے بہن کا بدلہ اپنا گھر وجاڑ کر لیا۔وٹہ سٹہ کی شادی اور رسم کی قباحت اُردو کے دوسرے دیہات نگار افسانہ نگاروں احمد ندیم قاسمی،اور پریم چند وغیرہ نے بھی کیا ہے۔جبکہ یہاں فہمیدہ کے علاوہ طاہر آفریدی،سحر یوسفزئی وغیرہ نے بھی اس پر خامہ فرسائی کی ہے۔اس افسانے میں افسانہ نگار نے معاشرتی کرداروں خان،ساز گل کے دوست احباب اور حتّٰی کہ مولوی صاحب بھی ان کو غیرت دلاتا ہے اور ساز گل کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے بہن کا بدلہ رومانہ کو گھر سے نکال کر لے۔ساز گل کب تک ضمیر کا مقابلہ کر تابلاآخر فرسودہ روایات اور بے جاغیرت وحمّیت جیت اور محبت وچاہت نے سر تسلیم خم کر لیا۔

خیبر پختون خوا کے افسانہ نگاروں نے معاشرتی عکاسی کرتے ہوئے یہاں کے رسوم ورواج اور دود دستور کو اپنے افسانوں میں برتا ہے۔ان رسومات کے محاسن و معائب اور کسی حد تک ان کی اصلاح کی کوشش بھی کی ہے۔یقینی طور پر دنیاجہاں کا ہر معاشرہ مکمل طور پر حسن وخوبی اور بے عیبی کا پیکر نہیں ہو سکتا۔جہاں معاشرے میں موجود روایات اور رواج میں خوبی پائی جاتی ہے وہاں خرابی کا عنصر بھی ضرور ہو گا۔یہاں کے افسانہ نگاروں نے خیبر پختون خوا کے دیہی معاشرت میں رواج پذیر رسموں میں ایک طرف اگر اچھائیاں اور قابل تقلید و قابل رشک پہلوؤں کو بیان کیا ہے تو دوسری طرف ان میں موجود برائیوں اور قباحتوں کو چُن چُن کر قاری کے سامنے پیش کئے ہیں۔اور بسا اوقات ان خرابیوں سے کراہت کا اظہار کرتے ہوئے ان کی اصلاح کی جتن بھی کی ہیں۔اشر آف حسین احمد نے اپنے افسانہ"نانی مریم"میں پشتون قبائل کے اس رسم کا ذکر کیا ہے جس میں عورتیں میّت پر بین کرتے ہوئے اپنے بال نوچتی اور سینہ کوبی کرتی ہے۔چادر اور دوپٹہ پھاڑ دیتی ہیں اور گریبان تک چاک کر دیتی ہیں۔میّت پر زیادہ بین کو قابل تعظیم و فخر گردانا جاتا ہے۔اس افسانے میں جب نانی مریم کا شوہر فوت ہو جاتا ہے تو رشتہ دار اور محلے کے عورتوں کو سینہ کوبی کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے جبکہ نانی مریم بت بنے بیٹھی تھی۔

"ہائے ہائے،مریم تو جیسے پتھر سے بنی ہو،نہ چیخی،نہ بولی،بین کئے نہ روئی دھوئی،بال نوچے نہ دوپٹہ پھاڑا،گریبان چاک کیا نہ دامن پھیلایا۔بس یوں جیسے پتھر کی مورتی بنی،تیرے میرے چہرے دیکھتی

رہی، جیسے ہوا ہی کچھ نہ ہو، اور ہم ویسے ہی اس کے جیتے جاگتے میاں کی لاش کے گرد ہالے بنائے بیٹھی اپنوں پرائیوں کو یاد کر کے بین کر رہی ہوں۔"(۴۱)

پٹھان ایک راسخ العقیدہ مسلمان قوم ہے، اور اسلام پر کاربند رہنا اپنے لئے فخر گردانتے ہیں لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ بعض ایسے مواقع جہاں اسلام کا سیدھا سادہ اُصول اپنانے کی ضرورت ہوتی ہے یہ لوگ اس کو پس پشت ڈال کر پشتون روایات کی پاسداری کو اپناتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں۔ میّت اور حادثات پر صبر کی جتنی تلقین اسلام نے کی ہے بجائے اس پر کاربند ہونے کے یہاں معاملہ بالکل اُلٹ ہو جاتا ہے جتنا زیادہ رونا دھونا، چیخ وپکار، مار پیٹ، سینہ کوبی اور بال نوچے جاتے اتنی زیادہ معاشرتی دادو تحسین و سراہت، جبکہ اس کے برعکس طاہر آفریدی نے فوتگی کے موقع پر پشتون قبائل کے بھائی چارے پر مبنی دستور کا ذکر کیا ہے کہ جس گھر میں فوتگی ہوتی ہے وہاں تین دن تک آگ نہیں جلائی جاتی آنے والے مہمان کیلئے کھانے وغیرہ کا انتظام خیل، قام قبیلہ یا محلّے والے کرتے ہیں جبکہ عموماً پہلے جمعے کو یا پھر چالیسویں دن پر میّت کے گھر والے ضیافت کا اہتمام کرتے ہیں جسے مقامی زبان میں "خیرات" کہا جاتا ہے۔ بھیڑ، دُنبے یا کوئی بڑا جانور ذبح کر کے سارے گاؤں والوں اور آس پاس کے علاقے والوں کو مدعو کیا جاتا ہے۔ خیرات کی اس رسم کو بعض نو دولتیوں اور مالدار لوگوں نے نمود و نمائش کا ذریعہ بنایا ہے جو کار ثواب کے بجائے وبال بن جاتا ہے۔ شمیم فضل خالق نے اپنے افسانہ "انٹیک" میں اسطرح کے ایک سرمایہ دار وحید کی نمود و نمائش پر مبنی "خیرات" کا ذکر کیا ہے۔

"تابندہ نے دیگیں پکوا کر پورے محلے اور غریبوں میں تقسیم کر دی۔ رسم قل میں بیگمات کے لیے الگ کھانا تیار کروایا گیا تھا۔ جس میں انواع و اقسام کے ڈشیں شامل تھیں۔"(۴۲)

افسانے میں پشتون معاشرے کے ذبوں حالی اور سرابیت کا ذکر کیا گیا ہے جو کہ ظاہر میں کچھ اور باطن میں کچھ اور ہیں۔ جہاں اقدار کی بگڑتی حالت، اور حقوق العباد کی کمیابی پر افسانہ نگار نوحہ کناں ہے۔ افسانے میں وحید کی بیگم جو شہر سے بیاہ کر لائی گئی ہے اس کے ماں کے ساتھ ناروا سلوک اور پھر فوت ہونے پر نمائشی رسومات کو معاشرتی دورنگی کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

(ت)۔ توہم پرستی:

توہم اپنی موہوم صورت میں سہی لیکن انسان کی زندگی میں امید و بیم کی تخم ریزی کر کے وہم و خیال کے مرغزار ضرور اُگاتا ہے اور زندگی کو کبھی خوش گوار اور کبھی سوگوار بنا کر جینے کے رستے دکھاتا ہے۔ اسی توہم کے نقطے سے روانہ ہو کر شک و گمان سے ہوتے ہوئے یقین و ایمان کی سرحد پر پہنچاتا ہے۔ پشتون قوم اور تہذیب کی قدامت کے ساتھ ساتھ یہاں کے باسیوں میں روایتاً توہمات اب بھی موجود ہے۔ جدّت زمانہ کے ساتھ توہمات کا بتدریج ختم ہونا تو بنتا ہے

لیکن بد قسمتی سے بعض توہمات اس قدر رچ بس چکے ہیں کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہیں۔ یہاں کی دیہی معاشرت میں توہمات اور اعتقادات کی ایک نرالی دنیا آباد ہے۔ اور بنظر غائر مشاہدہ کرنے سے اعتقادات و توہمات کی بھرمار نظر آتی ہیں۔ نظر لگنا اور پیر فقیروں کو مختلف نوعیت کے مرادوں کیلئے خاص کرنا مثلاً اولاد نرینہ کیلئے ایک مزار تو پاگلوں اور دیوانوں کیلے دوسرا، بانجھ پن کیلئے پیر بابا تو جنوں کو بھگانے کیلئے سید وبابا اسطرح تعویذ اور کالے جادو کے خاتمے کیلئے باڑئی بابا وغیرہ اس پر بس نہیں جانوروں اور پرندوں میں بھی منحوس و متبرک کی درجہ بندی کی گئی ہے۔ الّو منحوس تو ابابیل متبرک، مکڑی اور چھپکلی کا مار ِگرانا گناہ، گھریلوں خرگوش، طوطا اور مینا کا گوشت کھانے سے اجتناب۔ زیادہ بارشوں کو ناجائز اولاد جننے اور قتل ناحق کی وجہ گردانتے ہیں۔ یہاں تک کہ اسلامی مہینوں میں سفر کے مہینے کو جنّات کا سایہ پڑنے کی وجہ سے منحوس خیال کیا جاتا ہے یہاں کے افسانہ نگاروں نے دیہی ثقافت میں رواج پذیر انہی توہمات کو اپنے افسانوں میں مختلف انداز سے بیان کیا ہے۔ پشتون معاشرت میں کسی لڑکی کا جوانی میں بیوہ ہونا بھی لڑکی کی نحوست سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بیوہ ہونے پر اس سے ہتک امیز رویہ روار کھا جاتا ہے۔ سید راحت زاخیلی کے افسانے ''کنواری بیوہ''میں اسی طرح توہم پر مبنی کہانی بیان ہوئی ہے۔ جب سترہ سالہ مرغے کا شوہر انتقال کر جاتا ہے تو سسرال والے مرغے کو منحوس جان کر اس پر طرح طرح کے مظالم ڈھاتے ہیں۔ بناو سنگھار تو دور کی بات دو سال تک میکے کا منہ نہ دیکھنے والی مرغے بالوں میں کنگھی تک نہیں کر سکتی۔ نحوست کا الزام لئے معصوم مرغے جب دو سال بعد بھائی کے شادی پر میکے جاتی ہے تو وہاں بھی اس کو اسی قسم کے صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ راحت نے اس منظر کو کچھ اس طرح پیش کیا ہے:

> " وہ ماں جس نے دودھ پلا کر پالا پوسا تھا۔ اسی نے اسے منحوس جانا خدا کا کرنا کیا باپ کا یہاں سے گزر ہوا اسے کسی نے بتایا تو اس نے ترس کھا کر کہا " کوئی بات نہیں بچاری سے غلطی ہو گئی ہے۔ "تب مرغے کا قصور معاف ہوا۔۔۔۔۔۔ جانے کب تک وہ یونہی روتی رہی مگر کسی نے اسے پوچھا تک نہیں۔ "(۴۳)

افسانہ نگار نے مرغے کے صورت میں پشتون معاشرت کے ان گنت بہو بیٹوں کا مقدمہ قارئین کے عدالت میں پیش کیا ہے۔ اور توہم کے زیر اثر معاشرتی زبوں حالی، گھٹن، ناانصافی اور اس کے نتیجے میں معصوم کلیوں کی ترستی، کُڑھتی اور اذیت ناک جیون کی جھلک دکھائی ہے۔ اسی توہم کی وجہ سے کئی خاندان اور گھرانوں کی زندگیاں تباہ اور معصوم بیٹیاں مرغے کی طرح خودکشیوں پر مجبور ہو جاتی ہیں۔

فہمیدہ اختر نے اپنے افسانے ''جلتے ہوئے دیئے''میں پشتون قبائل اور بالخصوص خواتین کی ضعیف الاعتقادی کو موضوع بنایا ہے۔ جس دن ماہ رُخ کی نوکرانی گل پروشہ کی منگنی مصرو بو کے بیٹے خان گل سے طے ہوتی ہے۔ اسی مہینے خان گل کا چچا فوت جبکہ اس کی چھوٹی بہن تیز بخار کا شکار ہو جاتی ہے جس کو گل پروشہ کی نحوست پر منتج کیا جاتا ہے۔ ماہ رُخ

کے جلتے دیئے ندی میں چھوڑنے پر مصرو ببو جب اس کو دیکھتی ہے تو اس کو قیامت کی نشانی بتلاتی ہے۔ جبکہ ماہ رُخ اس کو مزاق بنا کر کہتی ہے کہ اس سال آپ کے گھر ڈھیر سارا غلّہ جمع ہو گا۔ اتفاقاً ایسا ہو جاتا ہے اور یوں مصرو ببو کی جلتے دیوں پر یقین پختہ ہو جاتا ہے۔ ماہ رخ کو یقین ہو جانے پر کہ گل پروشہ کے ساس واقعی ان کو منحوس سمجھتی ہے تو ان کو اس مصیبت سے چٹکارا دلانے کیلئے گل پروشہ کی شادی کے دنوں پھر ندی میں جلتے دئے چھوڑ دیتی ہے یوں مصرو ببو کو گل پروشہ منحوس نہیں بلکہ بھاگو بھری معلوم ہونے لگتی ہے۔ ضعیف الاعتقادی کا فائدہ اُٹھا کر ماہ رخ گل پروشہ کی زندگی سنوار دیتی ہے۔

منور روف نے اپنے افسانے ''یاددوں کے دیپ''میں معاشرتی توہم پرستی کو موضوع بنا یا ہے۔ توہم اس معاشرے میں اس قدر ہے کہ والدین بھی اس کا شکار ہو کر بچوں میں بھی منحوس و بختاور کی تفریق کر کے جدا گانہ سلوک و رویہّ رکھتے ہیں۔ اس افسانے میں دو بہنوں دلکش اور دلفریب کے ساتھ بھی والدین کا اس قسم کا رویہّ ہوتا ہے۔ دلکش کے پیدائش پر اُن کے والد کا کاروبار اتفاقاً نقصان کر جاتا ہے اور ساتھ ہی والدہ بھی شدید بیمار پڑ جاتی ہے۔ ان اتفاقات کو دلکش کے پیدائش سے منسوب کر کے ان کو منحوس گردانہ جاتا ہے۔ جبکہ اس کے برعکس دلفریب کو خوش بخت و بختاور سمجھا جانے لگتا ہے۔ بالآخر نفرت و تذلیل کے رویہّ سے دل برداشتہ دلکش اپنی زندگی کا خاتمہ کر بیٹھتی ہے۔ افسانہ نگار نے اس افسانے میں معاشرتی ضعیف الاعتقادی کی وجہ سے معصوم زندگیوں کو اس کا شکار ہوتے ہوئے معاشرتی المیوں کو بیان کیا ہے۔ نحوست و خوش بختی کے ایسے ہی رویےّ کو افسانہ ''کِرم خورہ مستون''میں بھی دکھایا گیا ہے۔ اور ان توہم پرستانہ رویّوں سے جنم لینے والے واقعات اور برباد ہوتے زندگیوں اور خاندانوں کو آشکار کیا گیا ہے۔

زیتون بانو پشتون تہذیب و ثقافت اور بالخصوص خانگی زندگی کے ایک نبض شناس افسانہ نگار ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں اپنے مشاہدات و تجربات کو سمو کر اس کو پشتون معاشرت میں موجود خانگی مسائل، اعتقادات و نظریات اور رسوم و رواج کو بہترین و دلفریب انداز میں قاری کیلئے پیش کیا ہے۔ افسانہ ''بختاور''میں زیتون نے پشتون معاشرے کے ایک ایسی ہی توہمانہ خیالات کے ساس بہو کی کہانی بیان کی ہے۔ بہو بیاہ کر لانے پر اتفاقاً گھر میں خوشحالی اور سسر کی محکمانہ ترقی کو بہوں کی خوش بختی جان کر ان کو بختاور کے لقب سے نوازا جاتا ہے۔ نیک پروین بہو کی نہ صرف گھر میں بلکہ سارے خاندان میں بختاوری کے چرچے ہونے لگتے ہیں۔ ہر خاص و عام خوشی کے مواقع پر ''بختاور'' کے رائے کو اہمیت و فوقیت دی جانے لگی۔ خاندان بھر میں شادیوں کے موقع پر دلہا دلہن کے سہرے ''بختاور کے ہاتھوں باندھنا خوش بختی سمجھی جاتی۔ لیکن بختاور کے اچانک فوت ہو جانے والے شوہر کے وجہ سے اب معاملہ اُلٹ ہو گیا۔ بختاور اب خوش بخت و نیک

بخت ہونے کے بجائے منحوس و بد بخت شمار ہونے لگی اور یہاں تک کہ دیور کے شادی پر ساس کا ان کے ساتھ رویّہ افسانہ نگار نے یوں بیان کیا ہے:

''وہ دوسری عورتوں کے ساتھ جانے کے لیے تیار کھڑی تھی جب عورتیں ایک ایک کر کے چلی گئیں تو ساس نے آکر اس سے کہا کہ گھر کا دھیان رکھنا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ہم ابھی واپس آتے ہیں۔ساس کی یہ بات اس پر ناگہانی بجلی کی طرح گری وہ پتھر کے بت کی طرح کھڑی رہ گئی جیسے کسی نے اس کی روح سلب کر لیا ہو۔ساس نے گھر سے جاتے جاتے اس کی طرف منہ کر کے ایک بار پھر کہا۔''اے۔۔۔۔۔۔دیکھتی ہو جب ڈولی گھر میں آئے تو دلہن کے سامنے ہرگز نہ آنا۔''(۴۴)

افسانہ نگار نے پشتون معاشرت میں سرایّت کرتی توہم پرستی اور عورت ذات کے ظالم و مظلومیت کو بیان کیا ہے۔اس معاشرت میں بد قسمتی سے بچی پیدا ہوتی ہی بد بختی کی کسوٹی پر کسی جاتی ہے۔پسماندہ علاقوں میں بیٹی کی آمد سے رفت گزشت تک یا تو نیک پروین یا بد شگونی کے تھپیڑے سہ سہ کر اپنی شناخت و عزت نفس کھو جاتی ہے۔بابل کے گھر میں والدین اور بھائیوں کے آنکھوں میں محبت ڈھونڈتی ہے لیکن سسرال میں جا کر ہر آنے والا لمحہ اس کے تقدیر سے وابستہ کیا جاتا ہے۔

مشرف مبشر نے اپنے افسانے ''روگ''میں توہم پر مبنی ایسی نفسیاتی ماحول کا تذکرہ کیا ہے۔گھٹن، تعصب، جبر و تشدد، نفسیاتی الجھن اور تنگ نظری پر مبنی اس معاشرے میں عورت ذات کی حیثیت ان کے ساتھ روا رکھا گیا ظالمانہ و غیرہ اخلاقی رویّہ تو چلّو سسرال میں بہ امر مجبوری قابل برداشت ہے۔لیکن بابل کے یہاں بھی اس طرح کے سلوک و رویّے کا سامنا ہو تو مرنے کے سوا چارہ نہیں۔افسانہ نگار نے ایک طلاق یافتہ عورت کی بیٹی کے زباں کہانی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ والد کے دوسری شادی کرنے پر ہم گھر کے بالائی منزل میں رہنے لگے لیکن والدہ کے طلاق پر ہم چارو ناچار ننھیال منتقل ہو گئے ماموں نے بہت آو بھگت کی ہمارا اچھے طرح سے خیال رکھا لیکن میرا کلیجہ کٹ کے رہ گیا جب میری شادی پر اپنی اس ماں کو اکیلا چھوڑ رہی تھی جنھوں نے اپنے جوانی میرے لیے بتا دی اور مجھے بن باپ کے پالا پوسا۔

"اس ماں کا درد سمجھنے والا کوئی دل سوز نہ تھا جس نے اپنی جوانی کا رس نچوڑ کر ایک بن باپ کی بچی کو توانا اور مضبوط بنا دیا تھا مگر خود شاخ بریدہ اور برگ زرد کے مانند ایک بار پھر باد مخالف کے جھونکے سہنے کو تن تنہا ویران راہوں پر کھڑی تھی۔"(۴۵)

افسانہ نگار نے پشتون معاشرت کے اس المیاتی حقیقت کو اُجاگر کیا ہے، کہ یہاں اگرچہ بہنوں بیٹیوں کو والدین کے گھر عزت و توقیر سے بخشا تو جاتا ہے، لیکن اس ذہنیت کا کیا کیا جائے جو طلاق اور بیوگی کی نحوست گردانی پر مبنی

ہے۔اور ان کو بد بخت اور منحوس جانا جاتا ہے۔ڈاکٹر پروین عظیم کے افسانہ ''پاپی''کا گل محمد اور مس ثروت وہاب کے افسانہ ''بند گلی''کا علی بھی اسلئے منحوس اور بد بخت ہے کہ اس نے پیدا ہوتے ہی والدین کو کھالیا۔پشتون معاشرے کے اسی روئے کو افسانہ نگار نے کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

''وہ بچہ مجھے دوست سمجھتا تھا۔اور دل کی ہر بات مجھ سے کیا کرتا تھا۔میری بات پر وہ تھوڑی دیر تک سر جھکائے خاموشی سے کھڑا رہا اور پھر بہت دکھ سے بولا "میڈم کیا میں گندہ بچہ ہوں؟اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔۔۔۔۔۔۔۔چچی کہتی ہے کہ میں منحوس بچہ ہوں۔میری وجہ سے بابا اور اماں اللہ میاں کے پاس چلے گئے۔(۴۶)

بجائے اس کے کہ عزیز و اقارب اس کے سر پر دست شفقت رکھتے،ان سے مشفقانہ رویہ اور محبت کا سلوک رکھتے،نفسیاتی الجھنوں کا شکار اس معاشرے میں اس طرح کے کردار آگے چل کر خود اس معاشرہ کیلئے درد سر بن جاتے ہیں۔اور معاشرتی روّیوں سے گندہ ہونے والی یہ مچھلی پھر سارے معاشرت کو گندہ کر دیتی ہے۔دہشت ولا قانونیت کا دورو دورہ ایسی ہی کرداروں کے بدولت جنم لیتا ہے جو کہ دراصل اسی معاشرے کی پیدا کردہ ہوتے ہیں۔

افسانہ ''حوالدار فقیر خان''میں افسانہ نگار نے لوگوں کے اعتقادات اور توہمات کو واضح کرتے ہوئے بعض لوگوں کو فقیر خان کی گمشدگی پر یہ کہتے دکھایا ہے کہ "جنگلات میں جنّوں نے اسے قید کر لیا ہو گا"۔جانوروں اور پرندوں کے خاص اوقات میں آوازیں دینے کو بھی یہاں کے سادہ لوح باسیوں نے زندگی میں پیش آنے والے واقعات سے جوڑ رکھا ہے۔مفلس درانی کے افسانے "بیٹا دو روپے کا" میں گاؤں کے ایک قبرستان میں پرانے درخت کو جنوں اور بھوتوں سے منسوب کرر کھا ہے افسانہ نگار اس توہم پرستی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اگلے روز جب لوگ نماز کے لیے عید گاہ جارہے تھے تو راستے میں کٹو بابا کے مقبرے میں انہیں جنات والے توت کے ساتھ کوئی چیز لٹکتی نظر آئی۔اور جب لوگ اس کے نزدیک پہنچے تو کسی کی آواز آئی۔"اوہ یہ تو عملی خان ہے۔یہ کیوں لیکن کسی کے پاس ان کا جواب نہ تھا۔"(۴۷)

خیبر پختون خوا کے دیہی علاقہ جات میں تعلیمی شرح بہت کم ہے۔غربت و بے روزگاری اور تعلیمی سہولیات کا فقدان اس کی اہم وجوہات ہے۔علمی و مالی پسماندگی کی وجہ سے بچوں کی تربیت کماحقہ ہونے سے رہ جاتی ہے۔اور یوں نسل در نسل چلی اس پسماندگی کی وجہ سے معاشرہ نفسیاتی الجھنوں اور ذہنی عوارض کا شکار ہو کر دوسرے ترقیافتہ ملکوں و علاقوں کے ہم پلہ ہونے سے رہ جاتا ہے۔اور اسی بنا بے بنیاد مذہبی عقائد کا شکار ہو کر اپنے مسائل کے حل کے تلاش میں پیر و فقیروں،مزارات،تعویز گنڈ و اور ٹونوں ٹوٹکوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔خیبر پختون خوا کے دیہی علاقوں میں یہ رجحان

زیادہ پایا جاتا ہے۔اور انہی علاقوں کے لوگ اس طرح کے عوارض کا زیادہ شکار ہیں۔معاشرے میں موجود ضعیف الاعتقادی کو یہاں کے افسانہ نگاروں نے اجاگر کیا ہیں۔رضا ہمدانی اپنے افسانے ''غوبل''میں اسی قسم کے عقائد رکھنے والے کسانوں کا ذکر کیا ہے، کہ یہ لوگ اللہ کے ذات کو مشکل کشا جان کر پیر و فقیر کو اس کا وسیلہ گر دانتے ہیں اور مزارات پر جا کر منتیں مانگتے ہیں۔کسان بھی اپنے اچھے فصل کو پیر بابا کے برکات ہی کا طفیل سمجھتے ہیں۔''اللہ کے فضل اور پیر بابا کے برکت سے اب کے فصل خوب ہوئی ہے۔''اسطرح جب گاؤں کے کسان خان کے ظلم کے جواب میں اکھٹے ہوتے ہیں تو افسانہ نگار ان کے عزائم کا اظہار یوں کرتا ہے:

''گلاب کاکا گرج رہا تھا۔اس کے آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔اور وہ بے خودی کے عالم مین افق کو دیکھ رہا تھا وہ ایک دم "یا پیر بابا" کہہ کر اٹھا اب اس کی انکھوں میں چمک تھی خوشی کی چمک،خوشحالی کی چمک۔''

(۴۸)

افسانہ نگار نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ اس معاشرے میں پیر و فقیر کو خاص وسیلہ و سبب مانا جاتا ہے۔اور ہر کوئی اپنے روز مرہ زندگی میں انہی کے برکات وعنایات کا قائل ہے۔دراصل یہ معاشرتی ذہنیت کی کارستانی ہے کہ علم کی فقدان کی وجہ سے برسوں سے روایت پزیر عقائد کا ماننا اور اس کی پیروی کرنا مجبوری بن جاتی ہے۔جبکہ بعض اوقات کسی پیر فقیر کی پیش کردہ پیشن گوئی اتفاقاً سچ ثابت ہو جاتی ہے اور یوں آن کی آن میں وہ مشہور و مقبول ہو جاتا ہے۔لوگ جوق در جوق اس کے استانے پر حاضری دینے لگتے ہیں۔اور تعویز گنڈوں اور دم چھپ کا سلسلہ شروع ہو کر اکثر و بیشتر جاہل و ان پڑھ فقیر معجزات و کرامات کا مالک بن جاتا ہے۔ قتیل شفائی کے افسانہ ''خوبانی''میں پشتون معاشرے میں روایت پذیر اس روئے کو پیش کیا گیا ہے۔افسانہ نگار نے معاشرے میں عام وقوع پذیر ہونے والے واقعات کو یہاں کے اعتقادات کا حصہ بنتے دکھایا ہے۔اس افسانے میں نوروز نام کا ایک کردار پیش کیا گیا ہے۔وہ ایک متوکل،بااخلاق، زاہد،پارسا اور نیک بندہ ہوتا ہے۔وہ یہ کوشش کرتا ہے کہ اس سے بھی بڑھ کر وہ نیک اور پارسا بن جائے۔ آخر کار وہ مذہب کے سانچے میں پوری طرح ڈھل جاتا ہے۔اب اس کے ذہن پر ایک نیا نقشہ اُبھرتا ہے۔اور وہ ہے''کلام الٰہی سے آفات سماوی پر قابو پانا''۔جب بھی وہ شہر جاتا ہے تو واپسی پر عملیاتِ روحانی کی ایک آدھ کتاب ضرور لاتا ہے۔لیکن جب اس کا کوئی تعویذ یا دم کار گر ثابت نہیں ہوتا۔تو وہ اس بے اثری سے حیران اور پریشان رہتا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟لیکن جب وہ نانی اماں سے سنتا ہے کہ مرشد کامل کے بغیر کرامات حاصل نہیں ہو سکتیں۔تو نوروز ''ملنگ بابا کا غانی رحمۃ اللہ علیہ''اور ''پیر بابا رحمۃ اللہ علیہ'' کے در پر حاضر ہو جاتا ہے۔اس کے بعد وہ پیر بابا رحمۃ اللہ علیہ کی برکت سے مختلف بیماریوں کا تعویذ اور گنڈوں سے علاج کرتا ہے۔بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ مریض اتفاقاً صحت یاب بھی ہو جاتا ہے اس لیے وہ بہت جلد لوگوں میں

مشہور ہو جاتا ہے۔ نوروز کا شہر میں ایک دوست ہوتا ہے۔ اس کا بڑا بیٹا ربانی کالج سے فارغ ہو کر آرام کی خاطر مہینہ بھر سے نوروز کے ہاں مقیم ہو جاتا ہے۔ وہ سائنس کا طالب العلم ہوتا ہے اس لیے ایک طرف سائنس کی حقیقت پسندی اور دوسری طرف نوروز کے روحانی کمالات کے اثرات کا حامل ذہن ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نوروز اور ربانی کے ذہن اپنے اپنے ماحول کے تحت آپس میں لگا نہیں کھاتے۔ دونوں اپنا اپنا راگ آلاپتے ہیں لیکن ایک دوسرے کو قائل کرنے میں کامیاب نہیں رہتے۔ ربانی نوروز کے توہمات کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اکثر ایسا کوئی اتفاقی واقعہ پیش آجاتا ہے۔ کہ نوروز کو پھر توہم میں ڈال دیتا تھا۔ ایک روز زور کی آندھی آتی ہے جس سے نوروز کی خوبانیوں کے باغ کو نقصان پہنچنے کا خدشہ ہوتا ہے۔ نوروز پیر بابا کی منت مان لیتا ہے اور اتفاقاً اسی وقت گرد و غبار ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے یوں طوفان بھی تھم جاتا ہے اور بارش بھی برسنا شروع ہو جاتی ہے۔ اور بقولِ افسانہ نگار:

"نوروز نے اپنے بھیگے ہوئے کُرتے کا دامن نچوڑتے ہوئے ربانی کی آنکھوں میں کچھ اس ادا سے آنکھیں ڈال دیں، جیسے کہہ رہا ہو۔ ''کیوں بیٹا! دیکھ لیا نا پیر بابا کی دعاؤں کا اثر آندھی کا جگر پانی کر دیا ہے۔ آندھی کا۔'' اور یہی احساسِ فتحمندی تھا جس نے گھڑی بھر میں وہ تمام لہر مٹا دیئے تھے۔ جو ربانی کے جوان خیالات نے نوروز کے توہم آلود عقیدوں کی سطح پہ بنا دیئے تھے۔ نوروز کا ذہن کچھ دنوں سے گنڈے تعویذ اور منت مراد سے ہٹ کر محنت مشقت اور علم و عمل کے دریچے سے جھانکنے لگا تھا۔ لیکن اس نئے واقعہ نے یہ دریچہ بھی کھٹ سے بند کر دیا۔" (۴۹)

اس معاشرے میں یہ اور اسی قسم کی دوسری باتیں پیر بابا، ملنگ بابا، دیوانہ بابا اور دوسرے صاحب کشف و کرامات کے متعلق گھڑی جاتی ہیں۔ توہمات اور بے جا اعتقادات اس دیہی معاشرت کا حصہ ہے۔ پیر فقیر، جادو ٹونے اور تعویذ گنڈوں پر یقین ذہنی پستی اور جہالت کی نشانی کے طور پر افسانہ نگاروں نے اپنے تخلیقات میں اکثر و بیشتر بیان کئے ہیں۔

پیر فقیر اور مزارات پر منتیں مانگنے اور نذر و نیاز کا تذکرہ افسانہ ''آرزوئیں اور فاصلے'' میں کیا گیا ہے۔ وہ مزارات جن کی حقیقت اکثر نامعلوم ہوتی ہے اور جو اکثر جرائم پیشہ اور منشیات فروشوں کا ڈیرہ ہوتا ہے وہاں پڑے فقیروں میں اکثریت نشیوں کی ہوتی ہے جو کہ صرف اپنے نشے کیلئے رقم اکٹھے کرنے ملنگ اور فقیر بنے ہوتے ہیں۔ زائرین جن میں اکثریت عموماً خواتین کی ہوتی ہے ان فقیروں اور ملنگوں کو اپنے مرادیں پورے کرنے کیلئے نزر و نیاز کھانے پینے کے اشیاء یا نقد کی صورت میں دیتے ہیں۔ اس افسانے کا ایک کردار سُلطانے جو چرس کے نشے کا عادی ہوتا ہے۔ نشے کے پیسے نہ ہونے پر اپنا قمیص اتار کر مزار کو جاتے راستے میں لیٹ جاتا ہے۔ غازی بابا کے زیارت کو آئے خواتین کا سلطانے کو پیسے دینے کا منظر افسانہ نگار نے کچھ یوں پیش کیا ہے:

"سلطانے کی سوئی ہوئی آنکھیں کھل گئیں، چہرہ کھل آٹھا اس کے بے جان جسم میں کسی نے جیسے روح پھونک دی ہو۔اس کے دل میں اچانک ایک خیال گزرا اور ہونٹو پر مسکان پھیل گئی چنانچہ جلدی سے اس نے اپنے آس پاس دیکھا اور جب دور دور تک اسے کوئی اور نظر نہ آیا تو اس نے عورتوں کے ہجوم کے قریب آنے سے پہلے اپنی قمیص اتاری اور غازی بابا کے مزار کے پاس زمیں پر پھیلادی پھر اس نے زیارت کے کچھ پھول اور پتھر لے کر وہ بھی قمیص پر پھیلا دیئے خود مسکین صورت بنا کر مراقبے کے عالم میں بیٹھ گیا۔"(۵۰)

افسانہ نگار نے فنّی مہارت کا استعمال کرتے ہوئے دیہی معاشرت کے ان کرداروں اور ان کے نفسیات کو اُجاگر کیا ہے۔ کس طرح خواتین اپنے مرادیں پوری کرنے کے لئے روپے پیسے کا بے دریغ استعمال اور ان پیر فقیروں کو مسیحاو مشکل کشا سمجھ بیٹھتی ہیں۔ نسلِ نو کے بے راہ روی وتباہی میں جن منشیات فروشوں کا اہم کردار ہیں وہ زیادہ تر انہی مزارات کا استعمال کرکے فحاشی ومنشیات فروشی کے اڈے چلاتے ہیں۔ تعلیم کی کمی اور جہالت کی وجہ سے ملک بھر کے گوٹ اور دیہاتوں میں اور بلخصوص خیبر پختون خوا کے دیہی علاقاجات میں ضعیف الا اعتقادی بہ کثرت پائی جاتی ہے۔احمد ندیم قاسمی نے شمالی پنجاب کے گوٹ اور دیہات میں اسی رجحان کو اپنے افسانوں میں بہ کثرت پیش کیا ہے۔افسانہ ''دو قبریں''میں دریا کنارے پڑے دو نامعلوم نعشیں مقامی لوگوں کیلیئے شہدا کا درجہ اختیار کر جاتی ہے۔ان کی ایک جھلک دیکھنے کیلیئے جوق در جوق لوگ چلے آتے ہیں۔رات کو کھڑک کے ساتھ بارش کی وجہ بھی انہی دونوں کے مظلومیت سے جوڑا جاتا ہے۔اور پھر ان کے قبروں پر جھنڈیاں لگا کر ''مسافر بابا'' اور ''مسافر اماّں کے ناموں سے مشہور ہو کر کے منتیں مانگنا شروع کر دیتے ہیں۔ عرس ولنگر کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ افسانہ نگار مزارات پر اعتقاد کے حوالے لکھتے ہے:

" "مسافر بابا " اور "مسافر اماں " کے زیارتوں پر بڑے بوڑھوں اور عورتوں کا جمگھٹا رہتا لوگ منتیں مانگنے اور مرادیں پوری کرنے دور دور سے آتے، لنگر تقسیم ہوتا۔اب تو گاؤں کے خان اور صاحب ثروت لوگ اپنے عشر اور ر زکواۃ کی رقم بھی اسی لنگر میں دینے لگے ، اور تو اور زیارتوں کے رکھوالے اور منجاور بھی پیدا ہوگئے۔ یوں منشیات فروشوں اور جواریوں کے لیے ایک بہترین اڈہ ہاتھ آیا۔" (۵۱)

افسانہ نگار نے جہالت کا شاخسانہ قرار دیتے ہوئے پشتون معاشرے میں سرایت کرتے منفی رویوں کو صحیح تناظر میں پیش کیا ہے اور مذہبی عقیدت مندی کے بات کو ہر صورت میں قبول و مقبول کرنے کی روایت کو بیان کیا ہے، کہ اس معاشرے میں ہر قسم کے معجزات پر آنکھ بند کر کے یقین کیا جاتا ہے۔اور اس قسم کی بات آن کی آن میں ہر سو پھیل جاتی ہے۔ تصدیق کئے بنا پیر فقیر اور مزارات کی ہندوانہ پرستش اور مشکل کشا مانا جانے لگتا ہے۔

خیبر پختون خوا کے دیہی ثقافت میں نظر لگنے اور لگانے کا عقیدہ بہت پرُانا ہے۔ مرد وزن دونوں اس عقیدے کے قائل ہیں۔ یہاں کے افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں پشتون معاشرت کی اس توہم پرستانہ عقائد کو پیش کیا ہے اور یہاں کے باسیوں کے اس نفسیاتی اُلجھاو سے قاری کو باخبر کیا ہے۔ افسانہ "دعائے مغفرت" میں عین شادی کے دن فوت ہو جانے والے دلبر خان کے جوانسال بیٹے کے میت پر اس کی والدہ سینہ کوبی کرتی ہوئے اپنے بیٹے کے موت کو نظر بد کا نتیجہ قرار دیتی ہے۔ دہائی دیتے ہوئی کہتی ہے۔ "ہائے میرے بیٹے کو کس ظالم کی نظر کھاگئی"۔ ان دیہی علاقہ جات میں نظر بد اُتارنے کی بھی اپنے روایتی طریقے ہیں۔ دم درود کے علاوہ کُچھ جڑی بوٹوں کو مجمر میں انگاروں پر ڈال کر نظر بد کے شکار بندے کے گرد گھمایا جاتا ہے۔ طاہر آفریدی نے اپنے افسانے "دیدن" میں پشتون ثقافت کے اُس دستور کا ذکر کیا ہے جس میں نظر بد کا شکار فرد کے سر سے سپیند کے پودے کو پھرایا جاتا ہے:

> " آج تو الماس نے اس طرح سنگھار کیا ہے لگتا ہے۔ دلہن بن رہی ہے۔ یا اپنے محبوب کو کسی جگہ بلایا ہو۔ ایک عورت نے شرارتاً کہا۔ اور الماس یوں اُچھلی جیسے بچھونے ڈنگ مار دیا ہو۔ اتنے میں دوسری عورت نے جلدی کنویں کے پاس اُگی ہوئی سپند کی ہری بوٹی توڑ کر الماس کے سر سے تین دفعہ گھما کر اس کی نظر اُتار دی اور کہا۔ "کتنا خوش نصیب ہو گا وہ جو تجھے دلہن بنائے گا"۔(۵۲)

اس افسانے میں افسانہ نگار نے پشتون دیہات کے ایک اہم مقام پنگھٹ (گودر): جہاں گاؤں کے تمام لڑکیاں اور خواتین گھروں کو پانی لے جانے کے لیے جمع ہوتی ہیں۔ کا منظر پیش کرتے ہوئے پشتون ثقافت کا نمونہ پیش کیا ہے۔ جہاں سہیلیوں کے پیار و محبت، بناؤ سنگھار اور روایتی نظر بد اُتارنے کا انداز دکھایا ہے۔ نظر لگنے لگانے کا عقیدہ دیہاتیوں میں اگرچہ بہت پرُانا ہے۔ لیکن یہ پیار اور خلوص کے اظہار کا ایک انداز بھی ہے جو کبھی ماں کا بچّوں کے نظر اُتارتے ،ساس کا نئی نویلی دُلہن کا نظر اُتارتے یا بہن کی بھائی کا نظر اُتارتے دیکھا جا سکتا ہے۔ طاہر نے یہاں سہیلیوں کے درمیان خلوص اور پیار کا مظاہرہ کرتے دکھایا ہے۔ نظر بد لگ جانے اور اس سے وابسطہ توہمات یہاں کے دیہی معاشرت میں ایسی جڑ پکڑ چکے ہیں کہ یہاں کی لکھاریوں نے اس کو باقاعدہ اپنے تحاریر کا حصہ بنایا ہے۔

افسانہ "نظر بد" اسی موضوع پر لکھا گیا ہے۔ اس افسانے میں ضابطہ خان کو ایک ماہر زمیندار کا کردار سونپا گیا ہے۔ آج کے جدید سہولیات کے باوجود وہ بیلوں کا جوڑا رکھتا ہے اور اسی سے ہی کھیتوں میں ہل چلاتا ہے۔ گاؤں کے لوگ ان کے اس محنت کو بہت سراہتے ہیں۔ جب اس کی بیوی تک اڑوس پڑوس کی عورتوں کی حسد ورشک سے بھرپور باتیں پہنچتی ہیں تو ایک دن وہ ضابطہ خان سے کہتی ہے:

"عمر خان کے ابو! دیکھو پورے گاؤں کی آنکھیں تمہارے قُلبے (بیلوں کے جوٹ) پر لگی ہوئی ہیں۔ مزدوری کرو لیکن......کچھ کم کم۔ کہ کسی کی نظر بد نہ لگے۔ نظر بد سے تو پتھر ٹوٹ جاتے ہیں۔'' ضابطہ خان نے جواب دیا۔ ''کم عقل۔ یہ نظر کیا بلا ہے۔ میں تو یہ بالکل ماننے کو تیار نہیں۔'' بیوی نے فوراً کہا۔ ''اے ہے......یہ کیا کہتے ہو۔ نظر تو لگتی ہے......'' مجھے یہ بتاؤ کہ لوگ ٹریکٹروں کو کیوں نظر نہیں لگاتے؟ نظر کے لیے مجھ غریب کا قُلبہ رہ گیا ہے؟......'' ابھی ضابطہ خان مزید کچھ کہنے والا تھا۔ کہ بیوی نے اس کی بات اچک لی۔ ''تم تو سارا دن کھیت میں ہل چلاتے ہو۔ لوگوں کی باتیں تو میں سنتی ہوں۔'' ضابطہ خان نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی۔ ''لوگوں کے ہاتھ آزاد ہیں۔ وہ ٹکڑے ہو جائیں۔ مجھے نظر لگائیں۔ میں نظر کو بالکل مانتا نہیں''۔(۵۳)

ضابطہ خان اپنے بیٹی کا رشتہ اس کی مرضی کے خلاف کہی طے کرا دیتا ہے جس پر وہ گھر چھوڑ کر کسی کے ساتھ بھاگ جاتی ہے اور پھر ہر وقت اس کی بیوی اس کو نظر بد لگ جانے کا طعنہ دیتی رہتی ہے۔ افسانہ نگار نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اگرچہ یہ سب فطری باتیں ہوتی ہے۔ اس میں نظر لگنے کی کوئی بات نہیں لیکن ضعیف الاعتقادی ہی کی وجہ سے ضابطہ خان بھی یہ ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ واقعی نظر لگ جانے ہی کے وجہ سے ہوا ہے۔ ایسے بہت سارے اتفاقاً ہونے والے واقعات لاعلمی اور کم فہمی کے وجہ سے بے بنیاد عقائد کو پختہ کر دیتی ہے۔

بد دیانت اور عدم مساوات والا معاشرہ انسان کو ذہنی پسماندگی اور غیر فطری طریقوں سے حصول معاش پر مجبور کر دیتا ہے۔ حقوق کی عدم دستیابی کے سبب پیر فقیر، جادو ٹونے، توہم پرستی اور گیدڑ سنگھی جیسے تصورات جنم لیتے ہیں۔ اور خواہشات کے عدم تکمیل پر دم درود، تعویذ گنڈو سے ہوتا ہوا پیر فقیر، آستانوں اور ملنگوں پر سے گزرتا یہ سفر "گیدڑ سنگھی" پر جا کر رکتا ہے۔ جس کے بارے میں یہ مشہور کر دیا گیا ہے کہ اس کے حصول پر سارے مرادیں بھر اور تمنائیں پوری ہو جاتی ہیں۔

فرید عرش نے اپنے افسانے "گیدڑ سنگھی" میں یہاں کی دیہی معاشرت کی اسی توہم کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار خلیفہ درزی پے درپے ناکامیوں، معاشی بد حالی اور لاولدی سے مایوس ہو کر روایتی دم درود، تعویذ گنڈو اور مختلف درگاہوں پر حاضریاں لگانا شروع کر دیتا ہے۔ لیکن نتیجہ ندارد، وہی معاشی بد حالی اور بے چینی، دکان پر کوئی شاگرد، ملازم ٹکتا ہی نہیں۔ گاؤں کے ایک سیانے کے مشورے پر اس نے گیدڑ سنگھی کے حصول کا ارادہ کیا۔ اسے یقین ہو چلا کہ یہی ان کے تمام مشکلات کا حل ہے۔ خدا خدا کر کے ایک سنیاسی سے اس کا حصول ممکن ہوا یوں اب وہ پھولے نہیں سما رہا تھا۔

"خلیفہ کا ہاتھ بار بار جیب کو ٹٹولتا ہے۔دوستوں کے خوش گپیوں میں وہ بظاہر شامل لیکن اس کا دیہان سہانے مستقبل ،بچے کے شرارتوں اور مقبول و معروف ٹیلرنگ شاپ پر ہوتا ہے۔اب اگر وہ خاک کو بھی چھولے گا تو وہ بھی سونا بن جائے گی۔"(۵۴)

خلیفہ سہانے مستقبل کے خواب لیے گھر پہنچتا ہے تو بیوی گھر پر موجود نہیں ڈھونڈنے پر پتہ چلتا ہے۔ کہ وہ ان کے ایک ملازم کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔افسانہ نگار نے اس معاشرتی المیے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہاں توہمات اور بے جا اعتقادات اس انتہا تک پہنچ چکے ہیں کہ اتنا تک نہیں سوچا جاتا کہ گیدڑ سنگھی بیچنے والے کی اپنی حالت کیا ہے۔ان بیوپاریوں کو خود ایک وقت کی روٹی نصیب نہیں ہوتی یہی حال ان نام نہاد نجومیوں کا بھی ہے،جو لوگوں کو ان کی مستقبل کی خبر دیتے ہیں،لیکن ستم ظریفی یہ کہ ان سب سے باخبر ہو کر بھی ان سے جا کر اپنے مستقبل کے حال معلوم کیے جاتے ہیں۔اور ان کے غلط پیشن گوئیوں پر یقین کرتے ہیں۔

(ٹ)۔روایتی کھیل / میلے ٹھیلے اور دیگر مشاغل:

ارتقائی مراحل طے کرنی والی قومیں جب مصائب و آلام کا شکار ہوتی ہیں،تو وہ ثابت قدمی سے ڈٹ کر ان کا مقابلہ کرتی ہیں اور خوشی کے مواقع پر اپنی روایات اور ثقافت کے مطابق جشن مناتی ہیں۔اسی حوالے سے پشتون قوم اتنڑ،ناچ،موسیقی اور دیگر کھیلوں سے خوشی کا اظہار کرتی ہے۔کھیل نہ صرف ذہنی نشونما کے لیے ضروری ہے بلکہ اس سے ذہنی صلاحیت بھی بڑھتی ہیں،اور آنے والے وقتوں کے لیے بھی خوشگوار اثرات چھوڑتے ہیں۔ہر قوم کے زندگی گزارنے کی اپنے مخصوص طریقے ہوتے ہیں۔انہی طریقوں سے اس قوم کے نفسیات،رسم ورواج اور ثقافت کی پہچان ہوتی ہے۔بچّوں کے کھیل بھی اسی تہذیب و تمدن کا حصہ ہیں جو بچّوں کے جسمانی،معاشرتی اقدار،کسی قوم کے ثقافتی و معاشرتی ترقی کا ذریعہ ہیں۔ہم جن کھیلوں کا ذکر کرنے جا رہے ہیں وہ پشتون ثقافت کا حصہ ہونے کے ساتھ ساتھ فوک لور (Folk lore) میں بھی شامل ہیں۔کھیل بھی فوک ثقافت کا اہم جز ہے۔پروفیسر داور خان اس کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

''فوک لور(Folk lore)انگریزی زبان کا ایک مرکب کلمہ ہے جو دو کلموں فوک (Folk) اور لور(lore)سے بنا ہے۔فوک کی معنی عوام اور لور کی معنی ہے سمجھ بوجھ یا جاننا۔''(۵۵)

ادبی اصطلاح میں کسی قوم کی رسم ورواج،عقائد،تہذیب و ثقافت اور ان میں پائے جانے والے خصائص کو جاننے کا نام فوک لور ہے۔اس کی تین اقسام ہیں۔ا۔مادی ۲۔نیم مادی ۳۔لفظی یا غیر مادی اس طرح کھیل مادی فوک لور کا ایک اہم جز ہے یہ پختون ثقافت آئینہ داری میں اہم کردار ادا کرتا ہے پختونوں کے اپنے مخصوص کھیل ہیں جن میں سے کچھ تو آریائی

کھیل ہیں جو کہ ہندوستان بھر میں کھیلے جاتے ہیں اور کچھ ان کے اپنے منفرد کھیل ہیں۔ان کھیلوں میں گلی ڈنڈا، تتی، ٹنڈی، کرخئی، پیل مایہ، غل باچا، میر گاٹی، تور مخی باباوغیرہ قابل ذکر ہیں۔جو کہ بچوں کے ذہنی، جسمانی اور سماجی نشو نما میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ان میں کچھ تواِن ڈور تھے اور کچھ آوٹ ڈور، کچھ رات کو کھیلے جاتے تھے اور کچھ دن کی روشنی میں کچھ ایسے بھی تھے جن کیلئے کوئی وقت اور قاعدہ بھی مقرر نہیں تھا مگر کچھ کھیل ایسے بھی تھے جن کے قاعدے اور قوانین بڑے سخت اور منظّم تھے، ان کھیلوں میں کچھ ایسے بھی تھے جن میں ذہن کا استعمال زیادہ ہوتا تھا اور یہ ایک طرح سے ذہنی آزمائش یا پھر ذہنی نشو نما کے تعلیمی کھیل تھے۔مگر اس وقت یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ کھیل کھیل کر ہم ذہنی اور سماجی نشو نما کے مدارج بھی طے کررہے ہیں۔اوران کی نفسیاتی ضرورتیں بھی پوری ہورہی ہیں۔

ان کے بعض کھیل مردانہ اور بعض زنانہ تھے مگر چند کھیل ایسے بھی تھے جنہیں لڑکیاں اور لڑکے ایک ساتھ کھیلا کرتے تھے۔وہ تمام کھیل اگرچہ جدید کھیلوں، کرکٹ، فٹ بال، ٹینس اور اب ویڈیوں گیمز وغیرہ کے رواج پانے کے بعد یا تو یکسر ختم ہو چکے ہیں یا پھر کہیں کہیں جدید کھیلوں میں ان کی ایک ہلکی سی جھلک نظر آتی ہے۔مثال کے طور پر رات کے وقت ایک کھیل کھیلا جاتا تھا جس کا نام ’’غوگے ‘‘ تھا اور شاید اس کا یہ نام اسلئے پڑ گیا تھا کہ اس میں دونوں ٹیمیں کان (غوگ) کا استعمال کیا کرتی تھیں۔جب ٹیلیویژن آیا تو جہاں اس ایجاد نے بچوں سے آوٹ ڈور گیم کے مواقع چین لئے وہاں اس نئی دنیا میں یہاں کے اس روایتی کھیل ’’غوگے ‘‘ کو ’’کسوٹی ‘‘ کا نام دے دیا گیا۔’’غوگے ‘‘ میں دو ٹیمیں حصہ لیتی تھیں A اور B دونوں ٹیموں کے اپنے اپنے مشران یعنی بادشاہ ہوا کرتے تھے۔A ٹیم کے بادشاہ B ٹیم کے کھلاڑی اور B ٹیم کے بادشاہ کے پاس A ٹیم کے کھلاڑی بیٹھ کر آپس میں فیصلہ کرتے تھے کہ ہر ایک ٹیم باری باری خفیہ طور پر ایک پرندہ یا جانور منتخب کرکے دوسری ٹیم کے کھلاڑیوں سے اس پرندے کا نام بوجھے گی۔ دونوں ٹیموں کے لیڈر ایک دوسرے کے کان میں چپکے سے بتاتے کہ انہوں نے کون سا پرندہ یا جانور منتخب کیا ہے پھر ٹیمیں میدان میں کود پڑتیں۔ ٹیم کا بادشاہ ٹیم کے کھلاڑیوں کو مناسب اشارہ دیتا مثال کے طور پر ہاتھ کے اشارے سے بتا دیا جاتا کہ ایک پرندہ ہے جس کی جسامت اتنی ہے۔اس کے بعد ٹیم کے کھلاڑی آپس میں مشورہ کرکے باری باری سوالات پوچھتے تھے اور انہی سوالات کے ذریعے وہ اس پرندے کو پہچاننے کی کوشش کرتے تھے۔یہ کھیل ان کے ہاں اس زمانے میں کھیلا جاتا تھا جب گاؤں میں ریڈیوں تک پوری طرح عام نہیں ہوا تھا۔پختون خوا کے اکثر دیہات میں جو روایتی کھیل ایک جیسے مقبول و مروج تھے ان میں سے اکثر بچوں نے خود ایجاد کئے تھے چند چیدہ چیدہ کھیل یہ تھے۔اس سلسلے میں پہلے ان کھیلوں کا تذکرہ جو محض لڑکوں کیلئے مخصوص تھے اور جنہیں آوٹ ڈور گیمز کا نام بھی دے سکتے ہیں۔

i۔ گلی ڈنڈا:

یہ کھیل لڑکے کھیلا کرتے تھے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ یہ کھیل پورے برصغیر اور افغانستان میں بھی مقبول تھا۔ شائد یہاں کے بعض دیگر روایتی کھیلوں کی طرح یہ بھی آریائی کھیل ہے۔ موجودہ دور میں کرکٹ اور گلی ڈنڈا میں گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔ مشہور افسانہ نگار منشی پریم چند نے اسی روایتی اور دیسی کھیل کو موضوع بنا کر افسانہ ''گلی ڈنڈا'' تحریر کیا ہے۔ افسانہ نگار انگریزی اور دیسی کھیلوں کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتا ہیں:

> "ہمارے انگریزی دان دوست مانیں یا نہ مانیں میں تو یہی کہوں گا کہ گلی ڈنڈا سب کھیلوں کا راجہ ہے اب بھی جب میں کبھی لڑکوں کو گلی ڈنڈا کھیلتے دیکھتا ہوں، تو جی لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے کہ ان کے ساتھ جا کر کھیلنے لگوں، نہ لان (میدان) کی ضرورت ہے، نہ ٹینٹ کی، نہ بلّے کی مزے سے کسی درخت کی ایک شاخ کاٹ لی، گلی بنائی اور دو آدمی بھی آ گئے تو کھیل شروع ہو گیا۔ ولایتی کھیلوں میں سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ اس کا سامان بہت مہنگا ہے۔"(۵۶)

یہ قدیم روایتی کھیل تقریباً سارے برصغیر میں کھیلا جاتا تھا۔ گاؤں کی سیدھی سادی زندگی کی مہک اور بچّوں کی دنیاں میں پائی جانی والی رنگارنگی اور معصومیّت کی جھلک ان روایتی کھیلوں میں اُبھر کر سامنے آتی ہے۔ سارا دن کھیتوں میں کام کرتے تھکے ہارے کسان بڑے انہاک سے ان روایتی کھیلوں کا نظارہ کرتے محظوظ ہوتے۔

ii۔ چوپیدار:

یہ کھیل مردانہ کھیل تھا اور عموماََ رات کو کھیلا جاتا تھا۔ اس میں ایک لڑکا باقی لڑکوں کو پکڑنے کی کوشش کرتا تھا جو کہ رات کی تاریکی میں گلیوں میں چھپے ہوتے تھے۔ جو لڑکا باقی لڑکوں کو ڈھونڈا کرتا تھا وہ یا تو باآواز بلند صدا لگاتا یا پھر بجلی کے پول کو پتھر مارتا یہ سن کر باقی لڑکے جمع ہونے لگتے جب تک پوری ٹیم میں وہ کسی ایک کو پکڑ کر اور پہچان نہ لیتا اس وقت تک اس کی گلو خلاصی ممکن نہ ہوتی تھی اور باقی لڑکے کہا کرتے تھے اس میں ''کونڑے'' ہے یہ جسمانی ورزش کے ساتھ ذہن کے استعمال کا بہترین ذریعہ تھا۔

iii۔ تور مخی بابا:

جب وطن میں خشک سالی کا موقع آتا تو لڑکے کپڑے اُتار کر جانگیہ پہنتے، ایک لڑکا آگے آگے جاتا اور سب اپنے چہرے کالے کرتے آگے والا لڑکا یہ آواز لگاتا کہ ''تور مخے بابا مانگتا ہے'' اللہ کے نام پہ مٹھی بھر دانہ دے دیں۔ اے اللہ خوب بارش برسا۔'' گھر گھر جا کر اور سارے گاؤں میں پھر کر دانے یا نقد رقم اکھٹے کرتے ان سے میٹھی چیزیں خریدتے اور

پھر سارے بچّوں میں تقسیم کرتے بچے اپنے ننے ہاتھ آسمان کے طرف بلند کر کے بارش کی دعا مانگتے۔ڈاکٹر یاسین اقبال یوسفزئی لکھتے ہیں:

"تور مخی بابا اجتماعی ہمدردی ،درد دل اور عوام کے ساتھ محبت کے اظہار کا کھیل ہے ۔جس میں کھیل کے دوران اپنائیت اور شناخت پیدا ہوتی ہے اور ارد گرد کے ماحول میں بھی وہ جانے جاتے ہیں۔بچوں میں اجنبی لوگوں کے درمیان بات کرنے کی جرات پیدا ہوتی ہے اور پانی کی قحط سالی کی وجہ سے بچوں کے جسموں میں جو کمی پیدا ہوتی ہے وہ کافی حد تک پوری ہوتی ہے ۔"(۵۷)

iv۔ آنکھ مچولی:

یہ کھیل بھی زمانہ قدیم سے پورے برصغیر میں کھیلا جاتا تھا۔لڑکے لڑکیاں علاحدہ علاحدہ یہ کھیل کھیلا کرتے تھے۔ مگر کبھی کبھار دونوں اکھٹے بھی کھیل لیتے تھے۔اس میں ایک لڑکا دیوار کے ساتھ کھڑے دوسرے لڑکوں کے سینوں پر باری باری انگلی رکھ کر یہ کہا کرتا تھا(ایچک، بیچک دم خالیچک بل وزیر باچا کے خرچ)اور خرچ یعنی خارج پر لڑکا قطار سے نکلتا تھاجب سب لڑکے نکل جاتے تو ایک رہ جاتا بد قسمتی سے جو آخر میں رہ جاتا اسے کہا جاتا تھا کہ تم مجرم ہو تبھی تم میں ''کونڑے'' ہے ایسی صورت میں وہی لڑکا دیوار کی طرف منہ کر کے آنکھ بند کر لیتا اور باقی سب جگہ جگہ چھپ جاتے جب ان میں سے اسے کوئی آواز دیتا کہ اب تم ہم کو ڈھونڈ سکتے ہو تو وہ ان کو تلاش کرنے لگتا اور تلاش کرتے وقت اگر کسی کو پکڑ لیتا یا کم از کم دیکھ کر پہچان لیتا تو پھر وہی ایسے عمل سے گزرتا جبکہ دوسری صورت میں پرانے لڑکے ہی میں کونڑے رہ جاتا۔خیبر پختونخوا کے اردو افسانہ نگاروں نے ان دیہاتی کھیلوں کو اپنے افسانوں میں جا بجا پیش کیا ہیں۔اشر آف حسین احمد نے اپنے ایک افسانے ''مِس اَپ'' میں انہی دیہاتوں میں بچپن میں کھیلے جانے والے کھیلوں کا تذکرہ کیا ہے۔

''ہم بچپن میں ایک ساتھ گلی ڈنڈا، چیندرو، توپ ڈنڈا، مایا گولی، کبڈی، چھپن چھپ، ایچنا پر میچنا کھیلا کرتے اور پتنگیں اڑیا کرتے تھے''۔(۵۸)

افسانہ نگار نے اپنے بچپن کے یادوں کو ہم جولیوں اور یار دوستوں کے ساتھ بتائیں گئے دنوں کو یاد کیا ہے۔جب وہ ٹولیوں کے شکل میں گاؤں کے گلی محلوں اور گھروں کے چھتوں پر کھودتے چھلانگیں لگاتیں چھپن چھپ کھیلتے۔نہ تھکن کے آثار نہ گرنے اور چھوٹ کھانے کا خوف۔مائیں لاکھ سمجھاتے لیکن ہم کہاں باز آنے والے۔اشر آف نے اس افسانے میں اپنے دوست تاج گل کا ذکر کرتے ہوئے اپنے بچپن کو بیان کیا ہے اور گاؤں کے پر سکون ماحول و پُرامن ماحول کا تذکرہ کیا ہیں۔دیہی روایتی کھیلوں کو بیان کیا ہے۔ کھیتی باڑی اور کسب و مزدوری سے فارغ ہونے کے بعد یہی دیہاتی شغل

اشغال کے لیے مختلف نوع کے دیہاتی کھیل کھیلتے ہیں۔ نیزہ بازی، نشانہ بازی، کشتی، بزکشی اور تیر اندازی جیسے قدیم کھیلوں کے علاوہ مرغ و بٹیر اور کتے پالنا اور ان کا لڑانا بھی فارغ اوقات کے مشاغل میں شامل ہے۔

اشر آف نے بیشتر افسانوں میں علاقائی ثقافت اور روایات پیش کرنے کی شعوری کوشش کی ہے لیکن وہ مکمل طور پر مخصوص ثقافتی فضا کا احاطہ نہیں کر سکے پھر بھی بہر حال پشتون تمدن کی تہہ داریوں کو چھونے کی کوشش ضرور کی ہے ۔یہی وجہ ہے کہ پشتون روایات سے ناآشنا قاری کو کہانی پڑھتے ہوئے قطعاً اجنبیت کی اس فضا کا احساس نہیں ہوتا جس کا سامنا ایک نامانوس تمدنی فضا کی حامل کہانیوں کے اولین مطالعہ میں بالعموم ہوتا ہے۔

روایتی کھیل و مشاغل اگرچہ دیہاتوں میں آج کل بہت عام ہیں اور اس کو یہاں کے روایتی کھیلوں میں شمار کیے جاتے ہیں لیکن بعض پشتون لکھاری اس کے تردید بھی کرتے ہیں اور ان مشاغل کو پختون ثقافت میں شمار نہیں کرتیں ۔بلکہ ان کا دعویٰ ہیں کہ یہ کھیل دراصل برصغیر کے نوابوں کے مشاغل تھے۔ نورالامین یوسفزئی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> "کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ بٹیر بازی، مرغ لڑانا اور کتّوں کو آپس میں لڑانا بھی ہمارے روایتی کھیل تھے، مگر یہ سب پختون روایت کے پیداوار نہیں، دراصل یہ کھیل لکھنو کے نوابوں کے پسندیدہ کھیل تھے جنہوں نے رفتہ رفتہ ہندوستان میں رواج پالیا، البتہ پختونوں میں نیزہ بازی اور گھڑ سواری جیسے مردانہ کھیل بعض علاقوں میں مقبول تھے۔"(۵۹)

دراصل اس زمانے میں پشتون قبائل خود اتنے جنگجو تھے۔ کہ سالہاسال آپس میں یا کسی بیرونی حملہ آور کے ساتھ حالت جنگ میں ہوتے ۔پشتون قبائل جہاں آباد ہیں اس خطے کو بنظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی جغرافیائی حالت اور محل وقوع ایسی ہیں کہ ان علاقوں سے اکثر حملہ آوروں کا گزر ہوا اور یوں یہ قبائل بہ امر مجبوری اکثر حالت جنگ میں ہوتے ۔اسی ماحول میں پروان چڑھتے نسلوں میں جنگجویانہ خوبو کا غالب ہونا قرین از قیاس نہیں۔ان کے کھیل اور مشاغل بھی انہی ہتھیاروں سے کھیلنا ہی ہوتا جن میں نیزہ بازی، نشانہ بازی، گھڑ سواری، کشتی اور شکار وغیرہ۔اس کے علاوہ ان کو دوسرے چیزوں کے لڑانے کی فرصت ہی نہ تھی۔ شکار کھیلنے کی اسی روایت کو یہاں کے افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہیں۔ افسانہ "زیتون اور نرگس" میں افسانہ نگار اپنے "اختر" نامی کردار کو جنگلوں اور پہاڑ کے برفیلی چوٹیوں پر شکار کرتے دکھایا ہے یہاں انہوں نے شکار کے دوران آنے والے سختیوں اور سردی کے تذکرے کے ساتھ ساتھ یہاں کے غیور و مہمان نواز پہاڑی گجروں اور ان کے روایتی مہمان نوازی کا ذکر بھی کیا ہے۔ بالکل اسی طرح افسانہ "بدلہ" کا گلاب خان یورپ میں طویل عرصہ رہنے کے بعد جب واپس وطن آتا ہے تو مرغ زریں کے شکار پر مقامی پہاڑوں کے برف پوش چوٹیوں میں جاتا ہے ۔شکار کھیلنا یہاں کے دیہی معاشرت میں ایک محبوب کھیل یا مشغلہ ہے

۔مختلف قسم کے شکار کئے جاتے ہیں مثلاً بٹیروں کا شکار خرگوش، تیتر اور مچھلیوں کا شکار وغیرہ اس کی قدامت و مقبولیت کا اندازہ ہمیں پشتون لکھاریوں کے تحاریر سے ہوتا ہے۔خوشحال خان خٹک اپنی تصنیف دستار نامے میں رقمطراز ہیں:

"ماڈ سویوں ښکار کو وهو سئی می ښکار کڑه

زمارزق به کله تله دبل ترکومی"

ترجمہ: میں خرگوش کے شکار کو نکلا کہ ہرن ہاتھ آگیا کسی کے نصیب میں لکھا رزق کب کوئی اور کھا سکتا ہے۔

خوشحال خان خٹک نے اپنے اس "دستار نامے" میں پشتونوں کے لیے شکار کرنا لازمی قرار دیا ہے اور اسے بہادروں کا مشغلہ قرار دیا ہے۔وہ سمجھتے ہیں کہ یہ جرّی جیدار اور بہادروں کا کھیل ہے۔ تلوار و بندوق کو یہاں کے جوان اپنا زیور گردانتے ہیں ان سے متعلق جتنے بھی کھیل ہیں وہ یہاں بڑے شوق سے کھیلے جاتے ہیں۔چونکہ پشتون اکثر پہاڑی علاقوں میں رہائش پذیر ہوتے ہیں اور شکار کے مواقع زیادہ ملتے ہیں۔اس لیے شکار ان کی زندگی میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔افسانہ "بے اعتبار" میں زرمینہ اپنے محبوب زرک سے ملنے جاتی ہے تو اسے اپنے باپ اور بھائی کے آنے کا خوف ہوتا ہے اور زرک سے کہتی ہے کہ:

"آج بابا اور جہانگیر لالہ شکار سے جلد ہی لوٹ آئے تھے اگر انہیں معلوم ہو گیا تو۔۔۔۔۔۔" (۶۰)

وحیدہ فرحت نے اپنے کرداروں کو پشتون روایت شکار کھیلتے دکھائے ہیں۔ گولی کی تڑاخ اور بہتی لہو کی دھار یہ مناظر پشتون قوم کے زندگیوں میں ایسی سرایت کر چکی ہے کہ ان کے بغیر گزران مشکل۔اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ یہ ایک خونخوار اور درندہ صفت قوم ہے بلکہ اس قوم کو عرصہ دراز سے ایسی جنگجویانہ ماحول میں رہنے اور ایسے حالات کا سامنا رہا ہے کہ جس کے بنا اس کو ہتھیار و اوزار جنگ سے اس قدر مانوسیت رہی کہ یہ ان کے زندگیوں کا لازمی جُز قرار پایا۔یہ بھی تاریخ ہے کہ پشتون قبائل نے اپنی بے سوادی اور بے اتفاقی کے باوجود صدیوں پہلے احمد شاہ ابدالی کو جمہوری انداز میں اپنا بادشاہ بنایا اور ایک بے مثال تاریخ رقم کی۔ مگر یہ تاریخ کا سبق ہے کہ اپنے روایات میں جمہوری نقطہ نظر رکھنے والے پشتون ہمیشہ دوسروں کے ہاتھوں بے وقوف بنتے رہے اور آپس کے دشمنیوں کے آگ میں جھلستے رہے۔بے اتفاقی اور روح عصر سے بے غوری اس قوم کا وطیرہ رہا اور یہ بھی تاریخ ہے کہ پشتون حملہ آوروں کے راستے میں آباد ہیں، اس لیے اس قوم نے ہمیشہ ایسی جنگیں لڑی ہیں جو ان پر تھوپی گئیں اور یہ تاریخ کا سبق ہے کہ کہ اس قدر طویل اور خون آلود عمل سے اس قوم نے من حیث القوم کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔

یہاں کی دیہی ثقافت میں رواج پذیر کھیل و مشاغل کو بنظر غائر دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ان کے بزرگوں کے ہوشیاری پر دلالت ہیں کہ انہی کھیلوں کے مدد سے وہ اپنے نوزائدہ نسل کی ذہنی، جسمانی اور روحانی تربیت

کرتے۔ یہاں کے اُردو افسانہ نگاروں نے ان روایتی کھیلوں اور مشاغل سے اپنے افسانوں کو مزیّن کیا ہیں۔ افسانہ "لوک گیت کا جنم"، میں پشتونوں کے انہی مشاغل کو افسانہ نگار نے یوں بیان کیا ہیں:

"ہماری دیہی معاشرت میں رواج پزیر کھیلوں میں گلی ڈنڈا، آنکھ مچولی، کبڈی ہوں یا اتنڑ و خٹک ڈانس ان کو دیکھتے ہی میری کیفیت مختلف ہو جاتی ہے۔۔"(۶۱)

اس اقتباس میں جن کھیلوں کا ذکر کیا گیا ہے پشتونوں کے اکثر علاقوں میں یہ کھیل کھیلے جاتے ہیں۔ بیلوں کے دوڑ والا کھیل سال میں دو دفعہ کھیلا جاتا ہے۔ یعنی بہار اور خزان کے موسم میں اس کھیل کے لیے زمیندار سال بھر بیلوں کو تیار کرتے ہیں، اس کھیل میں دو بیلوں کو جوڑا جاتا ہے بیلوں کے پیچھے ایک شخص سہاگے پر کھڑا ہوتا ہے اور ایک مقررہ نشان تک دوڑ لگاتا ہے اس دوڑ میں اناڑی بیل راستے سے ہٹ جاتا ہیں اور جو اتوڑتے ہیں تو وہی بیل ہار جاتے ہیں۔ گاؤں کے بزرگ منصفین کا کردار ادا کرتے ہوئے فیصلہ کرتے ہیں۔ خٹک ڈانس بھی پشتونوں میں اتنا مقبول ہے کہ یہ نہ صرف خٹک لوگ کرتے ہیں بلکہ عام پشتون معاشرے میں بھی یہ رقص کیا جاتا ہے اور لوگ اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ خیبر پختونخوا کی دیہی معاشرت میں سے یہاں کے اردو افسانہ نویسوں نے جہاں اس معاشرت کے بہت سارے عناصر کا اپنے افسانوں میں ذکر کیا ہے وہاں انھوں نے یہاں کے باسیوں کے روایتی کھیل کود اور مختلف مشاغل کو بھی بیان کیا ہیں۔ کھیتی باڑی اور کسب و مزدوری سے فارغ ہو کر یہاں کے دیہی ماحول میں یہ عام روایت ہے کہ زور آزمائی، نشانہ بازی، گھڑ سواری، نیزہ بازی اور ان جیسے قدیم کھیلوں کے علاوہ بٹیر بازی، کتوں کی لڑائی، مرغ اور کبوتروں کی لڑائی اور ان کو پالنے اور لڑائی کے لیے تیار کرنے کی روایت بھی کافی مقبول ہے۔ اس حوالے سے طاہر آفریدی کے افسانہ 'کُھلا صندوق"، سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

"لیکن وہ تم سے قمرو کے لیے زیور مانگے گا۔ کپڑے مانگے گا۔ اور شادی کے تمام اخراجات تمہارے ذمہ ہونگے اور تمہارے پاس سوائے اس بٹیر کے اور کچھ ہے ہی نہیں "(۶۲)

افسانہ نگار نے کمال مہارت کے ساتھ اپنے افسانے کے کردار "نادر خان" کی آوارہ مزاجی کو بٹیر باز بنا کر پیش کیا ہے۔ انہوں نے قاری کو اس کردار کے صورت میں بٹیر بازی کا شوق کرتے دکھانے والا نادر خان ایک بد مزاج اور بد چلن کے طور پر پیش کیا ہے۔ بٹیر پالنا اور لڑانا اس معاشرت کا اگرچہ حصہ رہا ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اب یہ کھیل اور شوق ختم ہوتا جا رہا ہے۔۔(مخہ) یا مقرر کردہ خاص فاصلے پر رکھا جانے والا نشان مارنا یہاں کا ایک قدیم روایتی کھیل و مشغلہ ہے۔ یہ اکثر خوشی کے موقع پر یا قومی دنوں کے موقع پر کھیلا جاتا ہے۔ جوان لڑکے ایک میدان یا پہاڑ کے دامن میں جمع ہو کر دور ایک نشان رکھ دیتے ہیں اور پھر دو ٹیموں میں منقسم ہو کر اس مخصوص جگہ کو نشانہ بناتے ہیں۔ افسانہ "وہ

جو گاؤں تھا" میں یہاں کے لوگوں کے اس روایتی شوق کو دکھایا گیا ہے۔ کہ گاؤں کے جوان اس روایتی شوق کے خاطر نشانہ بازی کے لیے قریبی پہاڑوں کے طرف جاتے ہیں۔ جہاں کسی بات پر اُلجھ کر لڑکوں کے بیچ توں توں میں میں ہو جاتی ہے۔ اور یوں رفتہ رفتہ گویا یہ شغل نشانہ بازی اور مقابلہ بازی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور جب گاؤں بٹ کر دو حصّے ہو جاتا ہے تو یہ شوق مجبوری بن جاتا ہے اور لوگ اپنے دشمن کو نشانہ بنانے کے لیے یہ کھیل سیکھا کرتے۔طاہر کے اس افسانے میں پشتونوں کے جھگڑالوپن اور معمولی باتوں پر کشت وخون کو موضوع بنایا گیا ہے اور نوجوان لڑکوں کا بطور شغل کھیلنے والا کھیل آن ہی آن میں گاؤں کے پُر امن ماحول کو پراگندہ کرکے اس کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے، اور وہ خوشباش جوان جو نشانہ بازی کو تفریح کے طور پر کھیلتے تھے اب ایک دوسرے کے خلاف مورچہ زن ہو کر ان کی مجبوری بن چکا ہے۔ گل شیر کو افسانہ ''برف پہاڑوں کا آدمی'' میں یہی شوق نشانہ بازی کرتے دکھایا گیا ہے۔ خیبر پختون خوا کے اُردو افسانہ نگاروں نے یہاں کے دیہی معاشرت میں رواج پذیر کھیلوں کو اپنے افسانوں میں بیان کیا ہے اشر آف حسین احمد نے اپنے افسانہ ''پاگل''میں ان روایتی کھیلوں کا تذکرہ کچھ یوں کیا ہیں:

> ''ٹھنڈے میٹھے پانیوں کا دریا اور گنگناتے دریا کی کنارے، کبڈی، گھوڑی، گھوڑی، اور لکن میٹی کھیلتے بچوں کی ٹولیاں اور پنگھٹ پر چار بیتے، نیمہ کئی اور ٹپے الاپتی الپسراوں کی جھرمٹ۔''(۶۳)

یہ کوئی صدی یا نصف صدی پہلے کی بات نہیں تقریباً تین عشرے قبل تک ان کی ثقافت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود تھی حجرہ، جرگہ ، گودر (پنگھٹ) ،رہٹ اور پشتون ولی کے سارے اوصاف حمیدہ یعنی مہمان نوازی، راست بازی، بہادری، غریب پروری، روشن خیالی اور جمہوریت پسندی جیسی صفات اپنے روایتی انداز میں ہماری سماج میں موجود تھیں۔روایتی کھیل و مشاغل جاری و ساری، حجرے آباد، اور جرگے موثر ہوتے، گودر و رہٹ پر گاؤں کی لڑکیاں جھرمٹ کے شکل میں مٹکے و مشکیزے بھرنے آتی۔اشر آف نے اس افسانے میں بچپن کی ان یادوں کو تازہ کیا ہے۔

زندہ قومیں اپنے ثقافت وروایات کے امین ہوتے ہیں، اپنے روایات، اقدار اور اسلاف کی پیش روی جی جان سے کرتے ہیں۔ غمی وخوشی کے مواقع پر اپنے روایات کو پیش نظر رکھ کر ان پر عمل کرتی ہیں۔اسی حوالے سے پشتون قوم اتنڑ، ناچ اور موسیقی اور اسی طرح دیگر کھیلوں سے خوشی کا اظہار کرتی ہے۔ پشتون رسم ورواج میں ''اتنڑ'' ایک رسم بھی ہے اور رواج بھی ایک طرف یہ ایک قسم کا ثقافتی ناچ یا ڈانس ہے جو کہ خوشی کے موقع پر ناچا جاتا ہے جبکہ تاریخی حوالوں سے یہ جب بگل جنگ بجتا تو جو جوان اس میں شامل ہوتا اس کا مطلب ہوتا کہ وہ جنگ میں جانے کیلئے تیار ہے۔اتنڑ پشتون قبائل کا ایک خاص ناچ بھی ہے اور رسم بھی۔ جس کی مثال دیگر ثقافتوں میں کم ملتا ہے۔طالبان بھی دائرے کی شکل میں

اس ڈانس کا مظاہرہ کرتے ہیں جسے طالبان ڈانس کہا جاتا ہے۔اس میں صرف تالی بجائی جاتی ہے۔ خیبر پختونخوا کے دیہی معاشرت میں خٹک رقص، کاکڑ رقص، اتنڑ اور وزیر و محسود رقص وغیرہ بھی بہت مشہور ہیں۔ اتنڑ کے حوالے سے امین تنہا لکھتے ہیں:

"اس منفرد رقص کو پختونوں کے لوک رقص میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔یوں تو خٹک رقص ملکی اور بین الاقوامی سطح پر پختونوں کے رقص کی نمائندگی کرتا ہے لیکن اتنڑ ایک ایسا رقص ہے جو تقریباً پختونوں کے تمام قبیلوں میں ہوتا ہے۔"(۶۴)

شادی بیاہ تقریباً تمام تہذیبوں میں شادمانی و مسرّتوں کا موقع ہوتا ہے پشتون روایات کے مطابق ایسے موقع پر ڈھول سُرنا، ہوائی فائرنگ اور ناچ گانوں کا اہتمام ہوتا ہے۔روایتی ناچ اتنڑ اور خٹک ڈانس جو کہ تقریباً تمام خیبر پختون خوا میں مقبول عام ہے ناچا جاتا ہے طوائفوں اور خواجہ سراؤں "لختئی" کے ناچنے گانے کے محافل سجائے جاتے ہیں۔یہاں کے افسانہ نگاروں نے خوشی کے ایسے مواقع اپنے افسانوں میں بہترین منظر کشی کے ساتھ پیش کئے ہیں۔افسانہ "برات" میں ظریف خان کے نفسیاتی اُلجھنوں اور معاشرتی رویوں کو افسانہ نگار نے بہترین الفاظ میں بیان کیا ہے جب ظریف خان بیوی کے وفات پر اپنے چھوٹے بیٹے کے خاطر دوسری شادی نہ کرنے کا فیصلہ کرتا ہے ۔ شادی کی شدید خواہش اور معاشرتی رویوں سے نفسیاتی جھکڑن کا شکار ہو کر گھوڑے پر سوار دور پہاڑی سے گاؤں کا نظارہ کرتا ہے تو خیالوں ہی خیالوں میں بارات، دلہن اور اتنڑ کرتے جوانوں کا منظر دکھائی دیتا ہے:

"دلہن سرخ گیند کی مانند سرخ شال اور عروسی ملبوسات میں لپٹی ہوئی گھوڑی پر سوار تھی۔کسی کے دل کے آرماں فائرنگ کے گنگناہٹ اور ڈھول و بانسری کے مدھ بھرے سازوں میں "اتنڑ ڈانس" کرتے پہاڑ کے دامن میں گاؤں کے طرف رواں تھے۔"(۶۵)

پشتونولی کی مثبت اور اچھی روایات میں 'اشر' کو بہت اہمیت حاصل ہے۔اشر پشتون معاشرے کی وہ رسم ہے جس کے تحت معاشرے کے افراد ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانے کے لیے مشترکہ طور پر ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔اگر کوئی شخص کسی دوسرے کے کام میں اس کا ہاتھ بٹاتا ہے تو دوسرا شخص بھی اس کے کام میں آسانی پیدا کرنے کے لیے اُس کا ساتھ دینے آتا ہے۔اسی طرح معاشرے میں ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی، ایثار، قربانی اور اتحاد و اتفاق کا جذبہ قائم رہتا ہے۔اگرچہ موجودہ دور میں حالات کافی بدل چکے ہیں، مادیت پرستی کے غلبے اور زندگی کی تیز رفتاری نے اس روایت کو بھی خاصا کمزور کر دیا ہے لیکن پھر بھی دیہاتی اور قبائلی علاقوں میں اب بھی اس رسم کے آثار باقی ہیں اور لوگ ایک دوسرے کی مدد کے لیے اکٹھے ہو جاتے ہیں اور وہ کام جسے اکیلا سرانجام دینا کسی کے لیے پریشانی کا باعث بن

سکتا ہے اس کے لیے آسان ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ''اشر'' کا تصّور ایک دوسرے کے لیے سہولت پیدا کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ اشر کا تعلق زیادہ تر کھیتی باڑی اور اس سے وابستہ کاموں سے ہے۔ فصل بونے، کاٹنے، گھاس کاٹنے، گاہ جسے پشتو میں غوبل کہتے ہیں، کنویں کھودنے، نالے، سڑکیں بنانے اور اسی نوعیت کے دوسرے کاموں کے لیے گاؤں کے لوگ اکھٹے ہو جاتے ہیں اور مشترکہ طور پر اس عمل سے نبردآزما ہوتے ہیں۔ اشر میں اگر کسی کے پاس افرادی قوت کی کمی ہو تو ایسے موقعوں پر وہ یا تو اپنے طرف سے پیسے دیتا ہے یا اپنا کوئی جانور بھیج دیتا ہے یا کسی کو دیہاڑی پر رکھ کر اس کام کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ اشر کے موقع پر اکثر ڈول سرنا یعنی موسیقی کا بھی بندوبست کیا جاتا ہے۔ ادھر لوگ کام میں مصروف ہوتے ہیں ادھر ڈول سرنا بج رہا ہوتا ہے۔ اسی طرح جن کے ہاں لوگ اشر کے لیے آتے ہیں وہ ان تمام لوگوں کے لیے کھانے کا بھی بطورِ خاص اہتمام کرتا ہے۔

دیہی علاقوں میں اکثر کام مشترکہ طور پر سرانجام دئے جاتے ہیں۔ اور مل کر کسی شخص کے مدد کرتے ہیں۔ عام طور پر کھیتی باڑی کے کاموں میں فصل کاٹنے یا کرش کرنے جسے پشتو میں ''غوبل'' کہتے ہیں۔ اس موقع پر اکثر عزیز ولی یا خیل قبیلہ کے لوگ جمع ہو کر ایک دوسرے کا ہاتھ بٹھاتے ہیں۔ لیکن وسیع معنوں میں دوستوں اور رشتہ داروں کے علاوہ بھی لوگ شامل ہو سکتے ہیں۔ چونکہ نئے فصل کی آمد کسان کیلئے خوشی کا موقع ہوتا ہے اس لئے موسیقی اور ڈھول وغیرہ کا بندوبست کرتا ہے اس طرح مل کر مشترکہ کام کرنے کو مقامی طور پر ''اشر'' کہتے ہیں۔ یہ پشتون قبائل کی ایک رسم بھی ہے اور رواج بھی مختلف افسانہ نگاروں نے اس رسم کو اپنے افسانوں میں برتا ہے۔

تعلیم کی کمی جدید تفریحی سہولیات کے فقدان یا پھر ذہنی پسماندگی ایسے وجوہات ہی کے بدولت عرصہ دراز سے یہاں عورت ذات شدید جکڑبندیوں، معاشرتی جبر اور محکومیت کا شکار رہی۔ تفریح تو درکنار دن کے وقت گھر سے باہر قدم رکھنا محال تھا لیکن خاص تہواروں کے موقع پر ان خواتین کے لیے ایک الگ تلگ جگہ مقرر کر کے سارے گاؤں کے لڑکیاں، خواتین اور بچے جمع ہو کر کئی دنوں تک تفریح کرتیں۔ افسانہ "سیدہ خانم" میں سمندر خان سمندر نے ایک ایسی ہی میلے کا حال بیان کیا ہے۔:

> "سارے محلت کے عورتیں اس مقررہ مقام پر جمع ہوتے۔ ڈھولکی اور دف بجا کر مقامی گیت گائے جاتے۔ انواع واقسام کے کھانے پکائے جاتے۔ کسی بھی مرد کا اس طرف جانا ممنوع ہوتا۔ تین دنوں تک یہ میلہ سجا رہتا۔"(٦٦)

افسانہ نگار نے اسی قسم کے ایک میلے کا منظر کچھ یوں پیش کیا ہے۔

"دف اور ڈھولک بجاتی عورتوں کا ایک جلوس گاؤں ٹوپئی سے نمودار ہوا۔ گاتی بجاتی خواتین ،ہنستی ،شور مچاتی میلہ کی طرف جارہے تھیں ۔۔۔۔۔۔چیڑ کا وہ درخت جو دریائے کابل کے کنارے عرصہ دراز سے تھا ہر سال اسی کے نیچے یہاں کے سارے خواتین جمع ہو کر یہ میلہ سجاتی۔"(٦٧)

پختون ثقافت اور دیہی معاشرت میں خواتین کو محدود اور مشروط طور پر تفریح کے مواقع فراہم کرنے کا اندازہ اس افسانے سے بخوبی ہو جاتا ہے ۔عید کے تہواروں میں عموماً سارے پختونخوا میں اسی قسم کے میلوں کا انعقاد کیا جاتا پختون روایات کی رو سے یہاں پردے کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے میلوں میں مردوکانہ صرف داخلہ بلکہ اس طرف جانا بھی سختی سے ممنوع تھا۔ایک منفرد اور انوکھی بات اس افسانے سے یہ ظاہر ہوئی کہ تین دنوں تک یہ میلہ سجتا جہاں مختلف قسم کے کھانے تیار کیے جاتے اور مردوکے لیے وہاں سے بچوں کے ہاتھوں بجوایا جاتا۔

(ث)۔وطن دوستی / جذبہ حب الوطنی:

وطن سے محبت پختون اپنے ایمان کا جز گردانتے ہیں۔اپنی دھرتی کی حفاظت اور اس کی طرف دیکھنے والی ہر میلی نگاہ کو پھوڑ دینا اپنا فرض اور اس کی ترقی اور آن شان کے لیے جانوں کے نذرانے پیش کرنا اپنے لیے سعادت سمجھتے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ یہاں کے غیور پختونوں نے ہر کٹھن وقت میں اپنے جانوں کی پرواکئے بغیر دھرتی ماں کے لیے اپنا سب کچھ داو پر لگایا ہے تحریک آزادی کشمیر ہو،۱۹۶۵ء کی جنگ ہو یا ۱۹۷۱ء کی لڑائی پختونخوا کا بہادر جوان صف اول میں رہا۔وطن عزیز کی بقاو سلامتی کے لیے یہ بہادر پختون ہر موقع پر جان کی بازی لگاتے ہوئے ہمیشہ دشمن کے سامنے سیسہ پلائی دیوار کی طرح ڈٹا رہا۔ خیبر پختونخوا کے لکھاریوں نے اپنے تخلیقات میں ان قربانیوں کو سراہنے اور اور مزید جذبہ حریت وحمیت کو تقویت دینے کی شعوری کوشش کی ہیں۔

۱۹۶۵ء کی جنگ کے تناظر میں منور روف کا لکھا گیا ریڈیائی افسانہ "انمول رتن" انہی کوششوں کی ایک کھڑی ہے ۔یہاں پاک فوج کے کیپٹن جانثار کو وطن پر مر مٹنے جبکہ اس کے محبوبہ نیلم کو صبر تحمل اور حوصلہ مندی پر خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔

اس افسانے میں نیلم اور کیپٹن جانثار ہیر واور ہیر وئن کے کردار کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔یہ دونوں محبت کے جذبے سے سرشار ہیں۔جانثار ایک کڑیل اور بہادر جوان ہے اور نیلم اس کی دل زار منگیتر ہے۔ایک دن جانثار نیلم سے ملنے آتا ہے اسی اثنا میں اس کے افسر کی طرف سے پیغام ملتا ہے کہ دشمن نے حملہ کر دیا ہے۔اس لیے اسے فوراً محاذ پر

پہنچتا ہے۔ یہ فرض شناس فوجی وصال کی گھڑیوں کو خیر باد کہہ کر دشمن کے مقابلے پر چلا جاتا ہے۔ نیلم اس موقع پر ایک حوصلہ مند لڑکی کا کردار ادا کرتی ہے۔ جاں نثار اور اس کے ساتھی دشمن کو پسپائی پر مجبور کر دیتے ہیں۔ جنگ جاری ہے کہ ایک دن جاں نثار کے گھر کے سامنے پھولوں سے لدا ٹرک آن رکتا ہے اور اس میں سے جاں نثار کی میت نکالی جاتی ہے۔یوں ایک جانباز جوان وطن کی حفاظت میں جامِ شہادت نوش کر کے امر ہو جاتا ہے۔ یہ ایک مشکل اور صبر آزما مرحلہ ہوتا ہے لیکن نیلم بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے محبوب کی شہادت کی خبر کو حوصلے کے ساتھ سُن کر برداشت کرنا تو کیا فخر کرتی ہے کہ اس نے اپنی زندگی کی سب سے قیمتی متاع وطن پر لٹادی۔ اس کی سوچ یہ ہے کہ موت تو بہر حال آنی ہے پھر کیوں نہ انسان کسی عظیم مقصد کے لیے جان قربان کر دے۔ اس موقع پر نیلم جاں نثار کے یاد گار الفاظ دہراتی ہے:

''دنیا کا سب سے انمول رتن خون کا وہ آخری قطرہ ہے جو کوئی جانباز اپنے ملک کی حفاظت کے لیے بہادے۔''

(۶۸)

یوں جاں نثار وطن کی خاطر جان جیسی قیمتی شے قربان کر دیتا ہے جبکہ نیلم اپنے محبوب کو وطن کی آن پر نثار کر دیتی ہے ۔اس طرح دونوں حب الوطنی کا حق ادا کر کے اپنی پشتون ولی پر آنچ نہیں آنے دیتے۔ پریم چند کا افسانہ ''انمول رتن'' بھی وطن کے لیے خون کا قطرہ بہانے ہی کے متعلق ہے۔

منور روف مسلمان قوم کی تاریخ، تہذیب، مذہبی روایات، اساطیر، لوک کہانیوں اور داستانوں سے پوری واقفیت رکھتی ہے ۔اس لیے ان کا علامتی رنگ بڑا نکھرا نکھرا اور واضح ہے جس میں کہی بھی اُلجھاؤ نہیں کہانی ایسی روانی اور سبک رفتاری سے آگے بڑھتی ہے کہ جیسے کوئی رواں ندی کسی ہموار اُترائی میں اُتر جائے اور قاری کہانی کے بہاؤ میں ڈوب کر ان کے مقصد کو بخوبی پالیتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ علامت نگاری سے ان کا فن اور نکھر آیا ہے اور وہ بہتر افسانے پیش کر سکی ہیں تو بے جا نہ ہو گا۔ ان کے افسانے مختلف زاویوں سے ذہنوں کو متاثر کرتے ہیں۔ ان کے ہاں درس اخلاق بھی ہے اور سماجی زندگی کا سلیقہ بھی۔ حب الوطنی بھی ہے اور حب اسلام بھی قومیت پرستی بھی ہے اور اوطان کی سرحدوں سے نکل کر اسلام دوستی کا شعور بھی۔

افسانہ "ناتمام آرزو" میں افسانہ نگار زیتون بانو نے ایک ایسے جوان کا قصہ پیش کیا ہے جو کہ بہت لاڈلہ، نازک بدن اور ناز و پلا بڑا ہوتا ہے معمولی سا تکلیف بھی برداشت نہیں کر پاتا۔ ایک دفعہ پاؤں کے انگوٹھے میں سوجن اور پانی بھر جانے کے وجہ سے دو دن اور رات سو نہ سکیں تھے اور ہسپتال جانے پر چیخوں اور کراہنے پر سارا ہسپتال سر پہ اُٹھار کھا تھا اس کے برعکس جب وہ دشمن کے خلاف میدان جنگ میں اترتا ہے اور لڑائی کے دوران گولہ لگنے سے وہ شدید زخمی ہو کر اس کی ایک ٹانگ کاٹ دی جاتی ہے لیکن اس کے باوجود وعزم وہمت کا پیکر نظر آتا ہے۔ اس کی بیوی مہ جبین عنایت کی

صبر و استقامت پر ششدر و حیران۔ افسانہ نگار نے اس بہادر فوجی جوان کی حالت اس کی بیوی کی زبانی کچھ یوں بیان کی ہے:

"میرا دل دھک سے رہ گیا اور میں نے بے اختیار ہو کر اپنے ہاتھوں سے تمہاری ٹانگیں ٹٹولیں لیکن وہاں تو صرف ایک ٹانگ تھی اور تمہارے بائیں ٹانگ کو سیاہ توپ کا سرخ آتشیں گولہ نگل گیا تھا تم ایک ٹانگ سے محروم ہو چکے تھے۔"(۶۹)

مہ جبیں حیران و پریشان رہ جاتی ہے وہ سوچتی ہے کہ عنایت کتنا بدل گیا ہے۔ آج تک تو اگر اس کے پاؤں میں کانٹا بھی چبھ جاتا تو وہ شور مچا تا رہتا تھا اور اتنی فریاد کرتا تھا کہ پڑوسی بھی اس کی فریاد کو سن کر اس کے گھر آنے لگتے اور آج نہ اُسے کٹے ہوئے پاؤں کا کوئی دکھ ہے اور نہ زخموں کے درد کی کوئی پرواہ ہے۔ اُسے اگر کوئی دکھ ہے تو وہ صرف یہ کہ:

"مہ جبینے کتنا اچھا ہوتا اگر ایسا نہ ہوا ہوتا اور میں میدانِ جنگ میں مر جانے کے قابل ہوتا ایک یہی ارمان دل میں رہ گیا ہے۔"(۷۰)

وطن پاک پر مر مٹنے اور جان نچھاور کرنے کا جذبہ رکھنے والے غیور پختون جوانوں کے جذبہ حب وطن کو جلا بخشنے کے لیے زیتون بانو نے ایک شعوری کوشش کی ہے۔ ان بہادر سپوتوں کو سمجھانے کے طور پر سعی کی ہے کہ بجائے اس کے کہ آپس میں لڑ کر، رنجشیں اور عداوتیں پال کر اپنی توانائیاں ضائع کریں، ہمیں اپنے قوت بازو اور توانائی ملک دشمن عناصر اور اس پاک دھرتی ماں کو میلی نگاہ رکھنے والے دشمن کے عزائم کو خاک میں ملانے کے لیے صرف کرنی چاہئے۔

افسانہ "آبلہ پا" میں اُس والد کے صبر و تحمل اور رضا بقضائے الٰہی کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ جن کے دو بیٹے ۱۹۷۱ء کے جنگ میں وطن پاک پر جان نچھاور کر گئے تھے۔ وہ پیشے کے لحاظ سے موچی ہے اور کام نہ ہونے کی وجہ سے فاقہ کشی کا شکار ہے۔ لیکن پھر بھی وہ صبر کا پیکر بنا حرف شکایت زبان پہ نہیں لاتا اور نہ ہی جوان سپوتوں کے جانے پہ نادم ہے۔

"وہ روزانہ ان بے ہنگم سوچوں کا شکار رہتا دو جوان بیٹے اے کے جنگ میں سفاک دشمن کے بمباری کا نشانہ بن چکے تھے تب سے وہ لمحہ لمحہ مر رہا تھا۔"(۷۱)

سیّدہ حنا کے افسانہ "دھوپ" میں بھی عادل کی منگنی رانی سے ہو جاتی ہے وہ تو بہت خوش ہوتا ہے لیکن اپنی اس زندگی سے مطمئن نہیں ہوتا۔ اس کی رگوں میں جو اں خون گردش کر رہا ہے۔ اُسے فوجی زندگی بہت پسند ہوتی ہے اس لیے کہ وہ اپنے ملک و وطن کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اس کا باپ اسکی ان تمناؤں سے بے خبر اُس کا سہرا باندھ کر دُلہن لانے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ وہ اپنے باپ پر اپنا نقطۂ نظر واضح کیئے بغیر گھر سے چلا جاتا ہے۔ اس عرصے میں کشمیر کی جنگ بھی چھڑ جاتی ہے۔ عادل کا پتہ نہیں چلتا کہ وہ کہاں گیا، زندہ ہے یا مردہ، اس کے متعلق متضاد افواہیں سننے

میں آرہی ہوتیں ہیں۔ کسی کا کہنا ہے کہ اُسے آزاد کشمیر کی فوج میں کمیشن مل گیا ہے اور وہ کشمیر جنت نظیر کو غاصبوں کے قبضے سے آزاد کرانے کے لیے کشمیری بھائیوں کے دوش بدوش جدوجہد میں مصروف ہے۔ کوئی یہ بھی کہتا ہے کہ وہ دشمن کی قید میں ہے۔ بعض یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ شہید ہو گیا ہے۔ اس کے والد کا تو یہ خیال تھا کہ اگر وہ زندہ ہوتا تو اس کا پتہ ضرور چل جاتا۔ اس لیے تو باپ اس کے غم میں مر جاتا ہے اور اس کے گھر والے بھی اس کی جدائی کے صدمے برداشت کرتے ہیں۔ آخر ان کے دل کو بھی قرار آجاتا ہے۔ کافی عرصہ گزر جاتا ہے لیکن اس کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔ ہوتے ہوتے جب کشمیر کی جنگ ختم ہو جاتی ہے، جنگ میں حصّہ لینے والے جوانوں کو تمغوں اور اعزازات سے نوازا جانا سن کر اپنا عادل بھی یاد آجاتا ہے کہ اگر وہ زندہ ہوتا تو شاید آج اس طرح کے تمغے اس کے کندھوں پر بھی سجا دیئے جاتے۔ اس کے گھر والے شدید سردی میں آگ تاپ کر گرم ہونے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن سردی کی شدت ہے کہ کم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ اچانک انہیں بھاری قدموں کی آہٹ سنائی دیتی ہے۔ ان کی نظریں دروازے پر ہیں اچانک انہیں عادل دکھائی دیتا ہے۔ جو فوجی ڈریس میں ملبوس اعزازی تمغے لگائے ان کے سامنے آن کھڑا ہو جاتا ہے۔ ان کی یہ اچانک خوشی نا قابل بیان ہے۔ وہ یہ ٹھٹرتی سردی بھول کر اپنے عادل میں محو ہو جاتے ہیں۔ ان کی حیرت اور خوشی کی انتہا نہیں ہے۔ بھولا بسرا عادل ایک فوجی اعزاز یافتہ افسر کی صورت میں ان کے سامنے ہے۔

''بجلی کے تیز روشنی میں ہم نے دیکھا ہمارے عادل بھیا فوجی ڈریس میں ملبوس اعزازی تمغے لگائے ہمارے سامنے کھڑے تھے۔ اُف خدایا جیسے دھوپ نکل آئی ہو۔ تیز دھوپ۔''(۷۲)

حب وطن کی درس پر مبنی اس افسانہ میں جوان نسل کو وطن پاک سے محبت اور اس پر فدا ہونے کی ترغیب دلائی گئی ہے۔ اس طرح کا جوان نہ صرف اپنے والدین اور خاندان کے لیے بلکہ پوری قوم کے لیے سرمایہ افتخار ہوتا ہے۔

سیدہ حنا کی "جھوٹی کہانیاں" زندگی کی سچائیوں کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔ زندگی کی جیتی جاگتی حقیقتیں افسانوی روپ دھار کر ان کے افسانوں "پیاسی جھیل"، "ماں"، "خلا"، "بلٹپروف"، اور "دھوپ" میں جلوہ گر ہیں۔ ان کی افسانوں کی دنیا حقیقت سے بہت قریب تر ہے اس لیے کہ یا تو وہ حقیقی واقعات کو بیان کرتی ہیں یا ایسی واقعات سے کہانی ترتیب دیتی ہیں جو حقیقی نہ ہوتے ہوئے بھی حقیقت کے بہت قریب تر ہوتے ہیں۔ وہ ادب برائے زندگی کی قائل ہیں۔ ان کے افسانوں کی دنیا مافوق الفطرت اور ماورائی نہیں یہاں کا اپنا ماحول، اپنی دنیا، اپنا جیون کہانی میں جان ڈال دیتا ہے جس سے ہر نا قابل یقین پہلو بھی اعتبار حاصل کر لیتا ہے۔

جذبہ حریت سے سرشار پختونوں کی بہادری اور وطن پر مر مٹنے کے لازوال داستانوں کو یہاں کے لکھاریوں نے اپنے افسانوں میں سموئے ہیں۔ افسانہ ''اعتراف'' میں افسانہ نگار نے پختونوں کی حریت اور وطن دوستی کو موضوع بنایا ہے۔:

"مقرب خان کی ماں بھی توبو نگی گھر گر تین نہ تھی، جو اپنے جنے کو جان نہ سکتی ۔۔۔۔۔۔ تاہم جب انگریزوں نے اس کی زمیں پر چو کی قائم کرنا چاہی اور اس نے انگریزی فوج سے ٹکر لینے کی کی ٹھانی تو وہ بہت چیخی چلائی ۔۔۔۔۔ وہ پشتون روایات کی پاسداری اور حریت کے پرچم کی سربلندی کے لیے بارہا انگریزوں کی جابر اور ظالم حکومت سے ٹکر لی"(۴۷)

اشر آف حسین احمد نے پختونوں کی وطن دوستی اور جذبہ حریت کو صرف مردوکا ہی شاخسانہ قرار نہیں دیا بلکہ پشتون خواتین بھی مردوں سے پیچھے نہیں اور ہر دور افتاد میں یہ بہادر زنانیہ اپنے مردوں کے شانہ بشانہ رہی۔ جذبہ جہاد سے سرشار اور ملک وملت پر جان نچھاور کرنے کے لیے جب بھی یہاں کے جوانوں نے ارادہ کیا ان ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں نے ہمیشہ ان کی حوصلہ افزائی کی۔ یہاں کے ماؤں نے برضاورغبت اپنے جگر گوشوں کو وطن پر مرمٹنے کے لیے پیش کیا۔

اشر آف اپنے حواس کو بروئے کار لاتے ہوئے مشاہدے کی گہرائی اور احساس کی شدت سے اپنی مخصوص ثقافت کا احاطہ کرتے ہوئے معاشرتی زندگی میں پلنے والی کہانیوں کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔ وہ معاشرے کے گھمبیر مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بناتے ہوئے اپنے تجربے کو تخیل سے ہم آہنگ کر کے کہانی کے پلاٹ میں منطقی ترتیب و تسلسل اس انداز میں پیدا کرتے ہیں کہ عوامی مسائل حقیقی رنگ میں ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ ان کے کہانیوں مین عوام کے دل کی دھڑکن محسوس کی جاسکتی ہے۔ ملک و قوم اور اپنی مٹی سے محبت ان کے افسانوں اور ان کے کرداروں میں جھلکتی ہیں۔

حوالہ جات

۱. راج ولی شاہ خٹک، پروفیسر، ڈاکٹر، پشتون ولی، پشتو اکیڈمی پشاور یونیورسٹی، ۲۰۰۸ء، ص:۸۱

۲. نواب محمد قطب الدین، دہلوی، علامہ، مظاہر حق، (جلد دوم)، دارالاشاعت، اردو بازار، ایم اے جناح روڈ کراچی، ص، ۳۸۱

۳. مراد شنواری، پشتو افسانے، مترجمہ رضا ہمدانی، گوشۂ ادب، لاہور، سن ندارد، ص:۳۲

۴. مراد شنواری، پشتو افسانے، ص:۲۴

۵. جیمز ڈبلیو سپین، ہسٹری آف پٹھان، مترجمہ پروفیسر ایم انور رومان، مسٹر ریپرنٹس، کوئٹہ، پاکستان، ۱۹۸۷ء، ص: ۱۳۰

۶. سحر یوسفزئی، آگ اور سائے، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، باراوّل:۱۹۶۷ء، ص:۴۹۔۴۸

۷. پیر محمد شارق، صرف شرفاء کے لیے، مترجمہ قیوم مروت، گلشن ادب پبلی کیشنز، سنگ نگر، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص:۷۶۔۷۷

۸. طاہر آفریدی، دیدن، بختیار اکیڈمی، کراچی، نومبر دسمبر ۱۹۸۲ء، ص:۲۰

۹. طاہر آفریدی، دیدن، بختیار اکیڈمی، کراچی، نومبر دسمبر ۱۹۸۲ء، ص:۴۷

۱۰. شمیم فضل خالق، بدلتے موسموں کے رنگ، ملت ایجوکیشنل پرنٹرز، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص:۳۰

۱۱. کاچو خیل، محمد جمیل، نوحۂ بے نام، پشتو ادبی ٹولنہ، الہ ڈھنڈ ڈھیری، ملاکنڈ، ۲۰۱۱ء، ص ۱۴۰

۱۲. رحیم گل، سرحدی عقاب، رابعہ بک ہاؤس، اردو بازار، لاہور، باراوّل:۲۰۰۰ء، ص:۱۰۷

۱۳. رحیم گل، مہمان، ص:۱۱۰

۱۴. قیوم مروت، وہ میں بھی ہوں وہ تم بھی ہو، گلشن ادب پبلی کیشنز، سنت نگر، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۲۹،۲۸

۱۵. قیوم مروت، تالہ، ص ۲۹

۱۶. ایضاً، ص ۳۲

۱۷. اشر آف حسین احمد، آکاس بیلیں، احمد سلمان پبلی کیشنز، گلبہار، پشاور، اپریل ۱۹۹۱ء، ص:۱۰۸

۱۸. عبدالقادر، مولانا، (مقدمہ) دی پٹھان، مترجمہ سید محبوب علی، پشتو اکیڈمی، پشاور، ۱۹۶۷ء، ص:۵۷

۱۹. راج ولی شاہ خٹک، پروفیسر، ڈاکٹر، پشتون ولی، پشتو اکیڈمی پشاور، ۲۰۰۸ء، ص:۶۴

۲۰.	جیمز ڈبلیو۔ سپین، (مضمون) پاکستان، سوسائٹی اینڈ کلچر، مترجمہ غلام رسول مہر / عبدالمجید سالک، تخلیقات ،لاہور، ۲۰۰۶ء، ص:۱۸۳

۲۱.	مراد شنواری، پشتو افسانے، مترجمہ رضا ہمدانی، گوشۂ ادب، لاہور، سن ندارد، ص ۲۷

۲۲.	مراد شنواری، نجب خان، ص ۳۳

۲۳.	سحر یوسفزئی، آگ اور سائے، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، باراوّل:۱۹۶۷ء، ص:۱۴۵

۲۴.	زیتون بانو، صرف شرفاء کے لیے، مترجمہ قیوم مروت، گلشن ادب پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص:۱۷

۲۵.	طاہر آفریدی، دیدن، بختیار اکیڈمی، کراچی، نومبر دسمبر ۱۹۸۲ء، ص:۸۹

۲۶.	انوار الحق، پشتو افسانے، مترجمہ رضا ہمدانی، گوشۂ ادب، لاہور، سن ندارد، ص:، ۱۶۴

۲۷.	طاہر آفریدی، دیدن، بختیار اکیڈمی، کراچی، نومبر دسمبر ۱۹۸۲ء، ص:۱۹

۲۸.	راج ولی شاہ خٹک، پروفیسر، ڈاکٹر، پشتون ولی، پشتو اکیڈمی پشاور، ۲۰۰۸ء، ص:۶۴

۲۹.	مفلس درانی، صرف شرفاء کے لیے، مترجمہ: قیوم مروت، گلشن ادب پبلی کیشنز، سنت نگر، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص: ۵۲

۳۰.	سمندرؔ، سمندر خان، چادر اور شملہ، (افسانہ)، مطبوعہ: ابلاغ، پشاور، جولائی، ۱۹۸۹ء، ص:۵۳

۳۱.	امیر ساغر آفریدی، پشتو افسانے، مترجمہ رضا ہمدانی، گوشۂ ادب، لاہور، سن ندارد، ص:۱۵۲، ۱۵۱

۳۲.	فضل حسین، پشتو افسانے، مترجمہ رضا ہمدانی، گوشۂ ادب، لاہور، سن ندارد، ص:۱۸۸

۳۳.	طاہر آفریدی، دیدن، بختیار اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۲ء، ص:۴۵

۳۴.	زیتون بانو، زندہ دکھ، مترجمہ تاج سعید، مقبول اکیڈمی، انارکلی، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص:۶۹

۳۵.	عبدالکافی ادیب، بگڑے چہرے، ملت پبلشنگ کمپنی، چارسدہ، ۱۹۹۲ء، ص:۴۷

۳۶.	طاہر آفریدی، دیدن، بختیار اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۲ء، ص:۴۶

۳۷.	زیتون بانو، زندہ دکھ، مترجمہ سعد اللہ جان برق، مقبول اکیڈمی، انارکلی، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص:۱۳۵

۳۸.	رحیم گل، سرحدی عقاب، رابعہ بک ہاؤس، اردو بازار، لاہور، باراوّل: ۲۰۰۰ء ص:۱۷۴۔۱۷۵

۳۹.	رضا ہمدانی، غوبل (افسانہ)، مشمولہ: اٹک کے اس پار، رضا ہمدانی / فارغ بخاری (مرتبین)، گوشۂ ادب، لاہور، س ن، ص:۲۹۱

۴۰.	فہمیدہ اختر، اپنے دیس میں، یونیورسٹی بک ایجنسی، پشاور، باراوّل، ۱۹۶۱ء، ص:۲۰۲

۴۱. اشرآف حسین احمد، آکاس بیلیں،، ادارہ، ابلاغ، پشاور، ۱۹۹۱ء، ص:۳۳

۴۲. شمیم فضل خالق، بدلتے موسموں کے رنگ، ملت ایجوکیشنل پرنٹرز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص:۲۰۹

۴۳. راحت زاخیلی، بگڑے چہرے، مترجمہ عبدالکافی ادیب، ملت پبلشنگ کمپنی، چارسدہ، ۱۹۹۲ء، ص:۲۵

۴۴. زیتون بانو، زندہ دکھ، مترجمہ تاج سعید، مقبول اکیڈمی، انارکلی، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص:۱۲۹

۴۵. مشرف مبشر، برکھا کی بدلی، دستاویز مطبوعات، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص:۱۳

۴۶. ثروت وہاب، خواب جب ٹوٹتے ہیں، بلال پریس، بٹ خیلہ، ملاکنڈ ایجنسی، ۲۰۰۸ء، ص ۱۰

۴۷. مفلس درانی، صرف شرفاء کے لیے، مترجمہ قیوم مروت، گلشن ادب پبلی کیشنز، سنت نگر، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص:۵۵

۴۸. رضاہمدانی، اٹک کے اس پار، گوشۂ ادب، لاہور، ۱۹۵۴، ص:۲۹۵

۴۹. قتیل شفائی، خوبانیاں (افسانہ) مشمولہ: اٹک کے اس پار، رضاہمدانی / فارغ بخاری (مرتبین)، گوشۂ ادب، لاہور، ۱۹۵۴، ص:۲۷۲

۵۰. ارباب رشید احمد، آرزوئیں اور فاصلے، دھڑکنیں، مترجمہ تاج سعید، مکتبہ ارژنگ پشاور، ۱۹۸۸ء، ص:۱۴۰

۵۱. لطیف وہمی، پشتو زبان کے بہترین افسانے، مترجمہ علی کمیل قزلباش، کلاسیک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص:۱۰۹

۵۲. طاہر آفریدی، دیدن، بختیار اکیڈمی، کراچی، نومبر دسمبر ۱۹۸۲ء، ص:۳۶

۵۳. یوسف زئی، مشتاق مجروح، صرف شرفاء کے لیے، مترجمہ قیوم مروت، گلشن ادب پبلی کیشنز، سنتنگر، لاہور۔ ۱۹۹۷ء، ص:۸۴

۵۴. فرید عرش، گیدڑ سنگھی، (افسانہ) مطبوعہ: ماہنامہ شاداب، پشاور، ۳۱مارچ ۱۹۶۳ء، ص:۱۵

۵۵. داور خان، پروفیسر، خوشحال اور فوک لور، پشتو اکیڈمی، پشاور، ۲۰۰۳ء، ص:۴۱

۵۶. پریم چند، منشی، گلی ڈنڈا، (افسانہ)، مطبوعہ: واردات، کلیات پریم چند، ا، قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی، پہلا ایڈیشن، جولائی ستمبر، ۲۰۰۰ء، ص:۱۱۳

۵۷. یاسین اقبال، یوسفزئی، ڈاکٹر، دپختنوں روایتی لوبی او دھغی اہمیت، پشتو اکیڈمی، ۲۰۰۹ء، ص:۴۷

۵۸. اشرآف حسین احمد، آکاس بیلیں،، ادارہ، ابلاغ، پشاور، ۱۹۹۱ء، ص:۱۴۵

۵۹. یوسفزئی، نورالامین، آرٹ، کلچر اور تاریخ، دی پرنٹ مین پرنٹرز، پشاور، اکتوبر ۲۰۱۲ء، ص:۱۲

۶۰. وحیدہ فرحت،، گونگا کلچر، ادارہ، ابلاغ، پشاور، ستمبر، ۱۹۹۷ء، ص:۳۹

٦١. رحیم گل، سرحدی عقاب، رابعہ بک ہاؤس، اردو بازار، لاہور، باراوّل:۲۰۰۰ء، ص:۱۵۷
٦٢. طاہر آفریدی، دیدن، بختیار اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۲ء، ص:۵۹
٦٣. اشر آف حسین احمد، آکاس بیلیں، ادارہ، ابلاغ، پشاور، ۱۹۹۱ء، ص:۱۱۷
٦٤. امین تنہا، پشتونوں کے لوک رقص، پشتو اکیڈمی، پشاور، ۲۰۰۹ء، ص:۵۸
٦٥. امیر ساغر آفریدی، پشتو افسانے، مترجمہ رضا ہمدانی، گوشۂ ادب، لاہور، سن ندارد، ص:۱۵۲، ۱۵۱
٦٦. سمندرؔ، سمندر خان، صرف شرفاء کے لیے، مترجمہ قیوم مروت، گلشن ادب پبلی کیشنز، سنت نگر، لاہور ۱۹۹۷ء، ص:۱۵
٦٧. سمندرؔ، سمندر خان، صرف شرفاء کے لیے، مترجمہ قیوم مروت، گلشن ادب پبلی کیشنز، سنت نگر، لاہور ۱۹۹۷ء، ص:۱۵
٦٨. مسز منور رؤف، انمول رتن، ایم جے بکس انٹرنیشنل، پشاور، ، ۱۹۷۴ء، ص ۱۱۶
٦٩. زیتون بانو، زندہ دکھ، مترجمہ فقیر حسین ساحر، مقبول اکیڈمی، انار کلی، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص:۳۸
٧٠. زیتون بانو، تماشا تماشائی، ص:۳۹
٧١. ثاقب، معصوم شاہ، سید، بند مٹھی، رائٹرز ایکویٹی (رجسٹرڈ) پشاور، مئی ۱۹۸۵ء، ص:۲۳
٧٢. سیّدہ حنا، جھوٹی کہانیاں، مکتبہ ادب نما، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص:۱۰۵
٧٣. اشر آف حسین احمد، آکاس بیلیں، ادارہ، ابلاغ، پشاور، ۱۹۹۱ء، ص:۱۰۰

باب سوم:

خیبر پختونخوا کے اردو افسانے میں طبقاتی کشمکش کی عکاسی

(الف)۔جاگیرداری:

یہ ایک تلخ مگر اٹل حقیقت ہے کہ روئے زمیں کے ہر چپے پر آباد انسانوں کے مادی وسائل پر محدود اقلیت کا قبضہ ہے۔اور یہ بھی ایک اٹل حقیقت ہے کہ دنیاں کے ہر معاشرے میں مفلوک الحال باسیوں کا حق مارنے اور استحصال کرنے والے طبقات پائے جاتے ہیں۔ اسی قابض ٹولے کو اُن خطوں میں مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔یورپ کا فیوڈل،جاپان کا سمورائی،عرب کا اقطاع دار،پنجاب کا چودھری،بلوچستان کا سائیں،سندھ کا وڈیرہ اور خیبر پختونخوا کا خان، ملک،نواب یا والئی ایک ہی طبقے کے مختلف نام ہیں۔بر صغیر میں مغل حکمرانوں نے ان طبقات کو اجتماعی طور پر جاگیردار کے نام سے متعارف کیا۔انگریزوں نے بھی ان طبقات کو مراعات یافتہ قرار دے کر اپنے مقاصد کے حصول کیلئے باقی ماندہ گروہوں پر ان طبقات کو برتری دی۔قیام پاکستان کے بعد بھی،ملک میں موجود اس گروہ نے سیاسی،سماجی اور معاشی اعتبار سے تمام معاشرے پر اپنی گرفت مضبوط رکھنے کی بھرپور کوشش کی۔یہ کامیاب کوشش آج بھی مختلف شعبوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ اُردو انسائیکلوپیڈیا میں جاگیردارنہ نظام کی تفصیل یوں درج ہے:

> "جاگیردارنہ نظام کسی معاشرے کا وہ نظام ہے جو دورِ جدید سے قبل یورپ اور ایشیاء کی اکثر ممالک میں جاری تھا۔اس نظام کے بعض خصوصیتیں یہ تھیں۔کہ بادشاہ یا حکومت وقت کے جانب سے گنے چنے افراد کو ان کی وفاداری کے صلے میں بڑے قطعات زمین بطور جاگیر دی جاتے ہیں۔۔یہ جاگیردار اپنی زمین میں رہنے والے باشندوں کو بطورِ مزارعین رکھتے تھے۔زمین کا لگان وغیرہ خود جاگیردار اپنے لئے وصول کرتے تھے۔ان کی حیثیت مزارعین ودیگر مقامی باشندوں کے لیے حکمران سے کم نہیں تھی۔"(۱)

جاگیردارانہ نظام میں وقتی ضروریات کو مد نظر رکھ کر تبدیلی آگئی اور موجودہ دور میں یہ صنعتی سرمایہ دارانہ نظام کی صورت میں موجود ہے۔تاہم یورپ کے مقابلے میں ایشیاء میں جاگیردارانہ نظام سُست روی کے ساتھ صنعتی سرمایہ دارانہ نظام میں منتقل ہورہا ہے۔یہ بھی ایک اٹل حقیقت ہے کہ اِن کا استحصالی رویہ پھر بھی مشترک قدر پر یکساں ہے۔ خیبر پختون خوا پاکستان کا ایک پسماندہ علاقہ ہونے کے ناطے جاگیردارانہ نظام کے شکنجے میں مضبوطی سے جکڑا ہوا ہے۔زیادہ تر وسائل پر خان خوانین،ملک اور نواب قابض ہیں۔ان خوانین اور جاگیرداروں کا اپنے رعایا اور کسانوں پر جبر اور ظلم و استبداد اس قدر ہوتا ہے کہ ان کی دہشت سارے معاشرے پر ہوتی ہے۔اور ان کی مظالم اور رسوخ کے

قصے زبان زد عام ہوتے ہیں۔ ان رعایا اور غریب ہاریوں پر اپنا تسلط بر قرار رکھنے کے لیے وہ مقامی تھانوں اور کوٹ کچہری میں بھی اپنا ایک حلقہ قائم رکھے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سماجی سیاسی اور معاشی اعتبار سے یہ گروہ کافی اثر ور سوخ کا حامل ہوتا ہے۔ اس حوالے سے فارغ بخاری لکھتے ہیں:

> " یہاں کی آبادی کو دو طبقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ غالب حصہ ادنٰی طبقے کا ہے جو غریب کسان ہیں اور باوجود محنت شاقہ کے نہایت ابتر زندگی گزارتے ہیں۔ دوسرا اعلٰی طبقے کے لوگ جو بڑے بڑے زمیندار اور جاگیر دار ہیں۔ انہیں یہاں کی اصطلاح میں خوانین کہتے ہیں۔ ان خوانین کے آباء و اجداد نے سیاسی خدمات اور وفاداری کے صلے میں انگریزوں سے بھاری جاگیریں پائیں اور نسلاً بعد نسلِ ان کی اولاد اس موروثی وراثت کی حق دار بن کر عیش و عشرت کی فضاؤں مین پل رہی ہے۔ تناسب کے اعتبار سے یہ گنتی کے لوگ ہیں۔ لیکن در حقیقت یہی لوگ سارے صوبے کے مالک ہیں۔ "(۲)

اس مقتدر طبقے کی عکاسی ادب میں بھی فطری طور پر ہوئی ہے۔ افسانہ نگاروں نے اپنی تخلیقات میں اس گروہ کا تجزیہ مختلف زاویوں سے کیا ہے۔ کہیں اس گروہ کی سفاکی ظلم و جبر اور سماجی برائیوں کا تذکرہ ہے۔ تو کہیں اس طبقے میں موجود اعلٰی اقدار اور انفرادی خوبیوں سے پردہ اُٹھایا گیا ہے۔ مظہر گیلانی کے افسانوی مجموعے "بدنصیب سارہ" کا موضوع بھی عورت کے سماجی مسائل سے پردہ اُٹھانا ہے۔ مذکورہ مجموعے کا افسانہ "آنسو" میں مرزا اینس ایک رحم دل جاگیر دار کے طور پر سامنے آتا ہے۔ وہ اپنی بیٹی مریم سے شدید محبت کرتا ہے اس کے علاوہ غریب غرباء کیساتھ بھی اس کا رویہ بڑا مشفقانہ ہے۔ اُس کی بیوی زبیدہ ایک مغرور اور تنگ نظر عورت ہے۔ مریم کو جب ایک غریب رشتہ دار خاتون شمسہ اپنی غربت کا تذکرہ کرتی ہے تو اس بات کا علم ہوتی ہی زبیدہ شدید غصہ ہو کر شمسہ کو گھر سے نکال لیتی ہے۔ اتفاقاً مرزا اینس حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے مر جاتا ہے اور اس کا مال و جائیداد مریم کے چچا آپس میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ ورثے میں زبیدہ اور مریم کو صرف گھر مل جاتا ہے لیکن زیورات اور نقدی ختم ہوتے ہی بات فاقوں تک پہنچ جاتی ہے۔ دوسری طرف شمسہ کا بیٹا ہمایون لاٹری کا ٹکٹ خرید لیتا ہے اور لاٹری نکلنے پر دس لاکھ روپے کا حق دار قرار پاتا ہے۔ شمسہ امیر ہو کر بھی انکساری سے کام لینے والی ہے۔ افسانہ کے آخر میں شمسہ زبیدہ کے ہاں آکر مریم کا رشتہ اپنے بیٹے ہمایون کے ساتھ جوڑنے میں کامیاب ہو جاتی ہے اور دس ہزار روپے شادی کے اخراجات کے طور پر بڑی منت سماجت کر کے زبیدہ کو دے دیتی ہے۔ افسانہ میں مرزا اینس اور شمسہ مثبت سوچ کے حامل جاگیر دار کرداروں کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ جبکہ زبیدہ کا کردار ایک ارتقاء پذیر کردار ہے۔ جاگیر دارانہ آن بان سے پستی اور غربت کی طرف سفر اُس کی ذہنیت سے غرور کا

خاتمہ کر دیتی ہے۔ مجموعی طور پر افسانے کی فضا اتفاقات کی وجہ سے غیر فطری معلوم ہوتی ہے تاہم سید مظہر گیلانی ایک اصلاحی افسانہ نگار ہے اس لئے کہانی کے واقعات پر مثالیت پسندی کے اثرات نمایاں ہیں۔اس مجموعے کا سب سے متاثر کن افسانہ ''بدنصیب سارہ'' آپ بیتی کی تکنیک میں لکھا گیا ہے۔راوی کا کردار ایک جاگیر دار و سرمایہ دار مرد ہے۔ جو سارہ نامی مظلوم لڑکی کا سہارا بن کر علاج و معالجہ کر دیتا ہے۔ اپنے نوکر ار جن اور کنیز کے ذریعے جنسی تشدد کی وجہ سے دماغی مریضہ سارہ کی دلجوئی کرتا ہے۔ سارہ جب اپنی داستان غم اُس کے سامنے بیان کر دیتی ہے تو اس کا ردعمل کچھ یوں ہوتا ہے:

''سارہ کی درد انگیز سر گزشت نے مجھے پاگل بنادیا۔..........اس بدنصیب جوڑے کی انوکھی طرز مواصلت سے بہت متاثر ہوا۔ میری آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ میں اشک بہاتا ہوا گھر لوٹا۔''(۳)

کسی امیر و کبیر انسان کے دل میں اس طرح کے جذبات واقعی قابل ستائش ہیں۔الغرض سیّد مظہر گیلانی کے یہ افسانے بلحاظ موضوع لائق تحسین ہیں یہ اور بات کہ اِن میں فنی خوبیاں بہت کم نظر آتی ہیں۔ ان کی کہانیوں کی بنیاد غیر فطری اور غیر معمولی واقعات و عناصر پر رکھی گئی ہے۔ زندگی کی سادہ حقیقتوں کو چھوڑ کر تخیل و تصور کی حسین وادیوں میں ایسے غیر معمولی کارنامے سامنے آتے ہیں جو مشاہدات کی حد میں نہیں آتے۔ان کی تخلیقات میں تخیل و تصور ہی جلوہ گر ہے۔ پلاٹ کی ہیت تصوراتی باتوں اور غیر فطری ماحول سے تیار کی گئی ہے۔ فرضی کرداروں اور بعید از قیاس واقعات و حالات سے آہستہ آہستہ کہانی ہماری زندگی سے دور ہوتی جاتی ہے۔

سید مظہر گیلانی کے تتبع میں فارغ بخاری نے بھی اپنے مجموعے ''عورت کا گناہ'' میں عورت کے سماجی و معاشی مسائل پر طبع آزمائی کی۔فارغ بخاری نے اپنے افسانوں میں جاگیردار طبقے کو ان مسائل کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔افسانہ ''ناکردہ گناہ'' کا مرکزی کردار جعفر ایک مالدار نوجوان ہے جس کی شادی نجمہ نامی لڑکی سے ہو چکی ہے۔ جعفر نجمہ کو دورانِ گفتگو سکینہ کے ساتھ اپنی داستان محبت بیان کر رہا ہے۔ جعفر کہتا ہے کہ میں نے اپنی دولت کے بل بوتے پر سکینہ کو دام محبت میں پھنسایا۔ لیکن جسمانی لذت کشید کر میں نے ان سے راستہ الگ کر لیا۔اسی غم کی وجہ سے مغلوب ہو کر اُس نے خود کشی کر لی اور اب میں خود کو قصور وار سمجھتا ہوں۔ نجمہ بھی اپنی ناکام محبت کا قصہ گوش گزار کرنے لگتی ہے۔ نجمہ کہتی ہے کہ مجھے بھی اپنے ماموں زاد سے محبت ہو گئی تھی۔ایک دن دوران ملاقات اُس نے مجھے چوم لیا۔ہماری محبت کی پہلی اور آخری غلطی تھی لیکن شومی قسمت کہ ہمیں اباجان نے دیکھ لیا۔اب مجھ کو پابندیوں میں جھکڑ کر اصغر سے دور رکھا گیا اور پھر میری شادی آپ سے ہو گئی۔ یہ سن کر جعفر نے نجمہ کو گھر سے نکال دیتا ہے۔یعنی مرد جو بھی کرے وہ

درست ہے لیکن عورت کی معمولی خطا بھی نا قابل معافی ہے۔ دراصل جعفر کے ذہن پر دولت کا نشہ سوار ہے۔ انسانی جذبات، احساسات اور انسانیت اُس کے لئے معمولی حیثیت بھی نہیں رکھتیں۔

رضا ہمدانی کا افسانہ ”غوبل“(گندم اور بھوسے کو پھٹک کر الگ کرنے کیلئے پشتو میں یہ لفظ مستعمل ہے) کا مرکزی کردار کف دردہاں خان ایک جاگیردار ہے جو ظلم واستحصالی رویے سے مفلوک الحال کسانوں کی سال بھر کی کمائی چھین کر شباب و کباب سے لطف اندوز ہوتے ہے۔۔ گلاب کاکا اس افسانے کا ایک جاندار اور انقلابی ذہنیت کا حامل کردار ہے۔ گلاب کاکا دردہاں خان کے منہ پر بھی حق بات کہنے کی جرات رکھتا ہے۔ خان اور گلاب کاکا کے درمیان مکالمہ بڑا خوبصورت ہے:

"خان یاد رکھو۔ ہمارا یہ مطالبہ تم رد نہیں کرسکتے۔ بخوشی یا بجبر، تمھیں ماننا ہی پڑے گا“۔ مڑتے ہی گلاب کاکا نے اپنے دل کا بخار نکال دیا۔ ”تمھارا ہاتھ آزاد ہے جو مرضی ہے کرلینا۔ میں دیکھوں گا تم کمینوں میں کتنی طاقت ہے“ خان کے ان الفاظ میں گھن گرج تکبر کی آخری حد تک تھی۔"(۴)

مندرجہ بالا مکالمے سے خان خوانین کے تکبر کے احساس کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ کف دردہاں خان بغاوت آمادہ کسانوں کو گھروں اور کھیتوں سے بے دخل کرنے کی دھمکی دے دیتا ہے۔ کچھ کسان تو اس دھمکی سے ڈر جاتے ہیں لیکن گلاب کاکا اور چند دیگر کسان اس دھمکی سے ڈرنے والے نہیں۔ اور یہ باغی کسان فصل کی بٹائی کر کے آپس میں تقسیم کر کے غلہ گھروں تک پہنچادیتے ہیں۔ خان یہ خبر سن کر اپنے غنڈوں کو لے کر کسانوں کے گھروں پر حملہ آور ہو جاتے ہیں۔ دورانِ فائرنگ کئی مفلوک الحال کسان حلاک ہو جاتے ہیں گلاب کاکا بھیانک گولی کا شکار بن کر مرجاتا ہے۔ لیکن یہ تباہی دیکھ کر غنڈوں کے دل بھی پگھل کر جاتے ہیں اور وہ کسانوں کے ساتھ مل کر خان اور اس کے اہل وعیال اور املاک کو ختم کر دیتے ہیں۔

اس افسانے میں مثالیت پسندی سے کام لے کر مصنف نے غریب کسانوں کو اپنا حق چھین کر حاصل کرنے کا پیغام دیا ہے۔ افسانے میں موجود کم ہمت کسان تو اونچی آواز میں خان کے خلاف کوئی بات، خان کی غیر موجودگی میں بھی نہیں کرسکتے۔ اس وجہ سے بھی صاف ظاہر کے یہاں کے تمام وسائل پر ان خان خوانین کو مکمل تصرف حاصل ہے۔ اِن جاگیروں کا تذکرہ اورنگ زیب نے اپنے مضمون ”صوبہ سرحد کے کسان اور سیاسی تحریکات“ میں یوں کیا ہے:

”صوبہ سرحد کی اکیس لاکھ ایکڑ زمین کے ساٹھ فی صد حصہ پر براہ راست بڑے بڑے خانوں (لینڈلارڈ) کا قبضہ ہے.......اِن خوانین کے پاس فی کس تین ہزار ایکڑ سے لے کر پندرہ ہزار ایکڑ تک زمین ہے۔“(۵)

سحر یوسف زئی کا افسانوی مجموعہ ''آگ اور سائے'' کا بنیادی موضوع خیبر پختون خوا میں طبقاتی کشمکش کا احاطہ کرنا ہے۔ اس تلخ موضوع میں موجود چھبن کو کم کرنے کیلئے مصنف نے اس خطے کی رنگینی، دلفریب مناظر اور برف پوش چوٹیوں کے تذکرے کے ساتھ ساتھ یہاں کے باسیوں کے دلوں میں اٹھنے والے محبت کے نغموں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ مجموعے میں شامل افسانہ ''سائے'' کا مرکزی کردار تازہ گل متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والا شخص ہے۔ وہ بخت مینہ کو پسند کرتا ہے لیکن تازہ گل اپنی زمین رہن رکھ کر تین ہزار روپے دے کر بخت مینہ کو حاصل کر ہی لیتا ہے۔ اپنی زمین دوبارہ حاصل کرنے کے لئے تازہ گل کراچی جا کر سخت محنت کرتا ہے۔ لیکن ایک دفعہ بغیر اطلاع دیئے جب گاؤں آجاتا ہے تو اپنی بیوی کو علاقے کے خان کے بیٹے کے ساتھ محوِ التفات دیکھ کر اس کا خون کھول اُٹھتا ہے۔ وہ موقع پر ہی دونوں کو قتل کر کے گاؤں کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے خیر باد کہہ دیتا ہے۔

افسانہ ''اندھیرے کا بیٹا'' اس مجموعے کا ایک اور دلچسپ افسانہ ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار سرور ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ اپنے علاقے کے خان داؤد خان کا وفادار ملازم ہے۔ وہ کئی مرتبہ دشمن قبائل کو شکست دینے میں اہم کردار ادا کر چکا ہے۔ لیکن جب داؤد خان کو اس بات کی خبر ہو جاتی ہے کہ سرور اُن کی بیٹی شیریں سے محبت رکھتا ہے۔ تب وہ سرور سے متنفر ہو جاتا ہے۔ جاگیر دار داؤد خان کی احساس برتری اور رعونت کی وجہ سے یہ رشتہ طے نہیں ہوتا۔ شیریں کو پانے کیلئے وہ سرور کو گاؤں کے پہاڑ کی بلند ترین چوٹی سے چلانگ لگانے کی شرط رکھ دیتا ہے۔ اب سرور شیریں کی محبت میں چلانگ لگا کر مر جاتا ہے۔ کچھ عرصے بعد شیریں بھی سرور کی قبر پر جان دے دیتی ہے۔ یوں غربت وامارت کی جنگ میں غربت کو فتح حاصل ہو جاتی ہے۔

''آگ اور سائے'' مجموعے کا سب سے متاثر کن اور جاگیر دار کردار پر مبنی افسانہ ''سبزہ اور چنار'' نامی کہانی ہے۔ مذکورہ افسانے کا مرکزی کردار شاہ نظر نامی دہقان ہے۔ جو علاقے کے خان کا دہقان بن کر اپنا مستقبل سنوارنا چاہتا ہے۔ لیکن محنت و مشقت کے باوجود وہ مستقل مقروض ہوتا جاتا ہے۔ تب وہ مزید قرضہ خان سے سود پر لے کر گھر چلا رہا ہوتا ہے لیکن جب بات حد سے گزر جاتی ہے تو کراچی جا کر محنت مزدوری شروع کرتا ہے۔ یہاں بھی وہی استحصالی نظام موجود ہے۔ خان کی نظر اس کی منگیتر اور بہن پر ہے۔ ان دونوں لڑکیوں کے والدین اُن کے مقروض ہیں۔ سو وہ اُن کو مجبور کر کے ان لڑکیوں کو اپنے گھر خدمت اور کام کاج کیلئے لے آتے ہیں۔ خان اس سے پہلے بھی گاؤں کی کئی لڑکیوں سے گھر میں خدمت لے کر شہر میں طوائفوں پر فروخت کر چکا تھا۔ اب وہ شاہ رو (شاہ نظر کی منگیتر) کو جال میں پھنسا لیتا ہے۔ خان شاہ رو اور شاہ نظر کے والدین کو بلا کر کہتا ہے کہ:

"میں نے دونوں کا انتظام کر دیا ہے۔ دونوں کو بہت ہی اچھے بر مل گئے ہیں۔ تم کو اس شادی میں سر اسر فائدہ ہے۔ جو کچھ ملے گا وہ تمہارا ہی ہو جائے گا......... تم نے سود پر جو رقم لی ہے انہیں واپس دینے کی ضرورت نہیں۔ اپنی زمین کے رہن کے کاغذات لے جاؤ۔ میں تو تم ہی لوگوں کی بھلائی کیلئے ہر وقت سوچتا رہتا ہو ں۔'' اور ان دونوں نے اس کے احسان کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔ اس لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ "(۶)

افسانے کے آخر میں شاہ رو کو طوائف کے کوٹھے پر دکھایا گیا ہے۔ افسانہ نگار کا پیغام یہ ہے کہ یہ خطے کے خان خوانین غریب مردوں کے ساتھ ساتھ ان کی عورتوں کا نہ صرف جسمانی بلکہ جنسی استحصال کے بھی ذمہ دار ہیں۔ ان جاگیر داروں کے سامنے ان غرباء کی کوئی حیثیت نہیں۔ معاشی مسائل میں گرفتار، یہاں کے باشندے احساس خودی سے بھی ناواقف ہو چکے ہیں۔ عزتِ نفس اور خودداری سے ناآشنا یہ لوگ جاگیر داروں کے ہاتھ میں کھلونے بنے ہوئے ہیں۔

"شاہ نظر جب بھی کھیتوں کے کام سے فارغ ہوتا۔ تو خان کے مویشیوں کے لیے چارہ لاتا اور جس دن کھیتوں میں کام نہ ہوتا تو اسے خان کو خوش رکھنے کے لیے اس کے گھر کا کام بھی کرنا پڑتا تھا۔ یہاں تک کے جلانے کی لکڑیاں بھی وہ پہاڑ سے لاتا۔ "(۷)

گاؤں کا ہر مرد وزن شاہ نظر اور شارو کی طرح خان کے ظلم و جبر کا شکار رہتا ہے اور مزاحمت کرنے پر ان کے مجبوریوں کو ڈھال بنا کر اس پہ وار کیا جاتا ہے۔ افسانہ نگار نے "سبزہ" کو بطور استعارہ استعمال کرتے ہوئے غریب کسانوں اور استحصالی طبقہ کو ظاہر کیا ہے جبکہ بطور جابر و ظالم "چنار کے درخت" کو ان جاگیر داروں کے لیے پیش کیا ہے۔ جس طرح چنار کے تناور درخت کے نیچے کوئی سبزی یا پھل پھول نہیں سکتی بعینہٖ ان جاگیر داروں کے زیر سایہ یہ کمی کمیں بھی سارے عمر خوار ہوتے رہینگے۔

اشر آف حسین احمد کا افسانہ ''پنگھٹ پر'' اس مجموعے کا معیاری افسانہ ہے۔ مذکورہ کہانی کا مرکزی کردار شہباز ایک نادار یتیم لڑکا ہے۔ شہباز اور گاؤں کے خان کی بیٹی طاہرہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ لیکن ظالم سماج درمیان میں آجاتا ہے اور طاہرہ کی شادی چچازاد بھائی سلیم خان سے ہوتی ہے۔ سلیم خان نے شہباز کو پھنسانے کی کوشش کی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ شہباز اور طاہرہ ایک دوسرے کو اب بھی پسند کرتے ہیں۔ سلیم اپنے کسان کے قتل کا جھوٹا دعویٰ شہباز کے خلاف درج کر کے پولیس سے گرفتار کروالیتا ہے۔ وہ قید میں اسیر پرانی یادوں کے سہارے جی رہا ہے۔ مصنف یہ واضح کرنا چاہتا ہے کہ امیر طبقے کے علاوہ اس خطے میں اگر کوئی اور محبت کرنا چاہے تو اُسے منہ کی کھانا پڑتی ہے۔ یعنی امیر اور غریب کے درمیان ناقابل عبور خلیج حائل ہے اور یہ آہنی دیوار بنانے والا طبقہ جاگیر دار طبقہ ہے۔

فہمیدہ اختر کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''کشمالہ'' بھی خیبر پختون خوا کی ثقافت اور رسم ورواج کی عکاسی سے معمور ہے ۔مصّنفہ نے مذکورہ مجموعے میں شامل افسانہ ''نیا سورج''میں ایک جاگیر دار گھرانے میں قدیم وجدید نسل کی کشمکش کو دکھایا ہے۔قدیم نسل کا نمائندہ کردار یوسف کی ماں ہے۔وہ چاہتی کہ ان کے مرحوم شوہر اعظم خان کی محبت کی نشانی بیری کا درخت یوسف نہ کاٹے۔لیکن یوسف اپنی بیوی کی بات مانتا ہے۔بیوی نے اُن سے فرمائش کی ہے کہ اس درخت کو کاٹ کر یہاں ایک بڑا چمن بناؤ۔یوسف کی ماں اس درخت سے والہانہ محبت رکھتی ہے۔مصنفہ نے ان کی سوچ یوں عیاں کی ہے:

"اُسے اس پودے سے کس قدر والہانہ پیار ہو گیا تھا۔اس کے احساسات میں یہ بات رچ بس گئی تھی کہ یہ پودہ اس کی اور اعظم خان کی پہلی اور آخری یاد گار ہے۔ایسی یاد گار جس کا خواب اس کی پاکیزہ روح نے آج سے ہزاروں سال پہلے کائنات کی تخلیق کے وقت دیکھا تھا۔"(۸)

یوسف خان کی ماں کی جذبات واحساسات کی کوئی پرواہ نہیں۔بلکہ وہ اپنی بیوی کو محبت کی نشانی۔ایک چمن کی صورت میں دینا چاہتا تھا۔ارتقاء کے اس سفر میں قدیم کی شکست لازمی ہے۔فہمیدہ اختر کے افسانوں کے تجزیے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ فہمیدہ اختر نے جاگیر دار طبقے کی وجہ سے معاشرے میں جو جو برائیاں پھیل رہی ہیں یا جاگیر دارانہ نظام کو جن جن مسائل کا سامنا ہے ان موضوعات کو مصنفہ نے اپنے افسانوں میں بھرپور فنی لوازمات کے ساتھ برتا ہے۔

حاصل بحث یہ کہ فہمیدہ اختر جاگیر دارانہ نظام کے ظلم واستبداد کے خلاف ایک توانا آواز ہے۔انہوں نے کئی زاویوں سے مذکورہ طبقے میں موجود خامیوں کا تذکرہ افسانے کے قالب میں فنی نزاکتوں کو مدنظر رکھ کر کیا ہے۔مربوط پلاٹ، جاندار مکالموں، متاثر کن کردار نگاری، دلکش منظر نگاری سے آراستہ یہ افسانے خیبر پختون خوا کے اُردو افسانہ نگاری کا ایک لازوال باب ہے۔

فہمیدہ ایک ترقی پسند فنکارہ ہیں انھیں قدیم روایات سے اُنس ہے۔لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ جدید روشنی کی بھی دلدادہ ہیں۔وہ پرانے نظام سے بے زار ہیں اور نئے نظام کے سپنے دیکھتی ہیں جس میں انسانیت کی قدر ہو آدمیت کا احترام ہو۔پٹھان معاشرے میں خوانین کا اہم کردار ہوتا ہے۔وہ سماج کے ٹھیکیدار بن کر صدیوں مزارعوں کا استحصال کرتے رہے ہیں جس سے طبقاتی تفریق کی خلیج بڑھتی رہتی ہے۔فہمیدہ انسانیت کی حرمت کی قائل ہیں۔انھیں خاندانی عصبیت اور تنگ نظری سے نفرت ہے۔انھوں نے خانوں کے محلات کی پر تکلف زندگی کے کھوکھلے پن کو بھی بیان کیا ہے جو اقتصادی بحران کا شکار ہو کر بھی ناک اُنچی رکھتے ہیں جن کے کال کوٹھڑیوں جیسے تاریک ذہن جدید دور کے تقاضوں کو نہیں سمجھ سکتے۔وہ جدید دور کی تابانی سے پشتون معاشرت کے تاریک گوشوں کو روشن کرنا چاہتی ہیں۔وہ ان ذہنوں کو

ضیاء سے منور کرنا چاہتی ہیں جو تعلیم نسواں اور عورتوں کی ملازمت کو بغاوت اور خاندانی وقار اور عزت وناموس کے خلاف سمجھتے ہیں۔

مراد شنواری نے افسانہ "نجب خان" میں دورنگی اور منافقت کالبادہ اڑے ملکان وخوانین کے مکروہ چہروں سے نقاب اتارنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ یہ لوگ اپنوں کے غدار اور ملک وقوم کے دشمنی میں پیش پیش ہوتے ہیں اپنوں کی عزت وکامرانی ان کو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ اپنے مفاد کے خاطر اپنے ماں اور وطن تک کو فروخت کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ ملک خانزادہ کے کردار میں افسانہ نگار نے ایک ایسی وطن فروش کا ذکر کیا ہے جو کہ اپنی دھرتی ماں کو اغیار کے چنگل میں دے دیتا ہے۔

> "اگر وہ مٹی تمہیں نظر آجاتی۔ جو تمہارا دشمن تمہاری آنکھوں میں ڈال رہاہے تو خودبخود سمجھ جاتے کہ ہمارا اصلی دشمن فرنگی نہیں ہے۔ بلکہ ہماری آستین کا سانپ ہمارا بھائی۔ وہ عزیز اور وہ تربور ہیں۔ جسے تم ملک کہتے ہو۔ جسے خان کہہ کر پکارتے ہو اور جسے نواب کے نام سے یاد کرتے ہو۔"(۹)

اس افسانے میں جب انگریز گاؤں کا محاصرہ کرنے کا پروگرام بنالیتے ہیں تو اس موقع پر گاؤں کا ایک جرگہ بلالیا جاتا ہے۔ اس جرگے میں ہر شخص "فکرِ ہر کس بقدرِ ہمّت اُوست" اپنا اپنا مشورہ دیتا ہے اور اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ اس موقع پر ایک بزرگ شخص جس انداز میں بات کرتا ہے اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ انگریزوں کو اپنے لوگوں کے خلاف کون کون اکساتے ہیں؟ اور ان کا ہاتھ مضبوط کرنے میں کن کن لوگوں کا عمل دخل ہے؟ یہ بزرگ جوانوں کی غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ ان کا اصل دشمن انگریز نہیں بلکہ اپنے ہی قام قبیلے کے لوگ ہیں۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ ان کے ملک، نواب اور خوانین ہی ان کے پیروں پر کلہاڑی مارنے والے ہیں۔ اس کے خیال میں یہ آستین کے سانپ ہیں جو انگریزوں کا پیسہ کھا کر اپنے عزیزوں کو نقصان پہنچارہے ہیں۔ اس کے خیال میں ان کے اصل دشمن ان کے یہی تربور (عزیز) ہیں۔ گاؤں کے یہ خان، ملک ہی ان کے اصل دشمن ہے طاہر آفریدی کے افسانہ "بہانہ" کا جنت گل کاکا بھی اسی طرح کے استحصال کا شکار کردار ہے۔ اس کردار کے ذریعے طاہر آفریدی غریب طبقے کی عکاسی کرتا ہے جبکہ ملک عظیم خان کا کردار جاگیردار طبقہ کا نمائندہ کردار ہے۔ جنت گل کاکا ملک عظیم کے حجرے میں آکر اس کی موجودگی میں چارپائی پر نہیں بیٹھ سکتا کیونکہ اس طرح ایک سردار کی تضحیک ہوتی ہے۔ وہ ملک عظیم کی بہت تعظیم کرتا ہے لیکن باوجود اس کے وہ اس کے ظلم کا شکار ہو جاتا ہے وہ یوں جنت گل کاکا کی زمین خان کی زمین کے اس طرف ہوتی جہاں نہر کا پانی پہلے جنت گل کاکا کی زمین کو سیراب کرتا ہے اس سے جان چھڑانے کے لیے ملک عظیم ان کی چھوٹے سے قطعہ اراضی کا ان سے سودا کرنا چاہتا ہے۔ وہ جب زمین دینے سے انکار کرتا ہے تو جس طرح کہ ایک خود نگر خان کا ظالمانہ

کردار ہے اسی طرح کا ملک عظیم بھی جنت گل کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے اور اس کے زمین اور گھر پر قابض ہو جاتا ہے۔۔وہ لوگوں میں یہ تاثر بھی پھیلا دیتا ہے کہ چونکہ جنت گل کی بیٹی اکیلی ہے اوراس پر تہمت لگنے کا خدشہ ہے اس لیے وہ اس کارِ خیر کو نیکی کے طور پر سرانجام دے رہا ہے۔موقع کو غنیمت جان کر وہ جنت گل کاکا کی بیٹی سے نکاح بھی کرلیتا ہے۔نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔اگرچہ پہلے سے شادی شدہ تھا۔افسانہ نگار نے یہاں کے دیہی معاشرت میں خوانین اور جاگیرداروں کی روایتی ظلم و جبر اور استبداد کا شکار جنت گل کاکا کی بے بسی اور معاشرتی اخلاقی پسماندگی کا رونا رویا ہے کہ اس معاشرے میں کوئی بھی خان ملک کے ظلم کو روکنے یااس کے خلاف آواز اٹھانے کی جراءت نہیں کر سکتا اور اخلاقی طور پر یہ معاشرہ ایسی پستی و کم ہمتی کا شکار ہو چکا ہوتا ہے کہ ظلم کا حساب نانگنے کے بجائے خوشامد اور چاپلوسیاں کرتے پھرتے ہیں۔

"ملک عظیم نے جنت گل کی زمین کے ٹکڑے کو اپنی زمینوں میں شامل کرلیا۔اس کے چھوٹے سے گھر کو اپنے حجرے کے صحن میں ضم کرلیا۔اور اس کی جوان بیٹی کو دو بول پڑھوا کر اپنے گھر میں ڈال لیا کہ اگر ایسا نہ کرتا تو جوان جہان اکیلی لڑکی پر ہزاروں تہمتیں لگ سکتی تھیں۔"(۱۰)

یہ جاگیر دار طبقہ ہمیشتاً بہت عیار، چالاک اور شاطر ہوتا ہے اپنے مفاد کے حصول کے لیے نت نئے طریقے اور جواز تراشتے رہتے ہیں۔اور حصول مفاد کے لیے انسانی خون کی ہولی کھیلنا ان کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوتا ہے۔مذکورہ افسانے میں افسانہ نگار نے ان کا یہی چہرہ قاری کے لیے وا کیا ہے جب عظیم خان جنت گل کاکا کے گھر و زمین ہتھیا لیتا ہے اور ان کی بیٹی تک کو بھی قبضہ کرلیتا ہے اور ساتھ ہی مونچھوں کو تاؤ دے کر احسان بھی جتاتا ہے کہ اس نے جنت گل کاکا کے خاندان اور بیٹی کو سہارا دیا ہے ستم ظریفی یہ کہ عام لوگ واقف حال ہو کر بھی منہ پر تالے لگائے بیٹھے ہوتے ہیں۔

"زبان بے زبان"نامی افسانہ کا مرکزی کردار مثال خان بچپن میں اپنے باپ کے انتہائی سخت مار کے نتیجے میں عمر بھر کے لیے جھوٹ بولنے سے تائب ہو جاتا ہے۔لیکن جوان ہونے کے بعد ہر شخص سے سچ بولنے کے نتیجے میں سب گاؤں کے لوگ اس سے نالاں ہوتے ہیں۔مثال خان کا والد چاہتے ہوئے بھی اُن کو سچ بولنے سے منع نہیں کر سکتا۔پھر ایک دن مثال خان نے گاؤں کے خان کے بیٹے کو ایک غریب عورت کے ساتھ دست درازی کرتے دیکھا۔اور وہ ہر محفل میں اس واقعہ کے بارے میں لوگوں کو بتاتا رہا۔خان کے حجرے میں بیٹھے ہوئے جرگے کے افراد نے مثل خان کے باپ کو، مثل خان کو اس طرح کی باتیں پھیلائے سے روکنے کا مشورہ دیتے ہیں۔مثل خان کو اس کے باپ نے آکر سمجھایا:

"تم نے ایک مرتبہ جھوٹ بولا تھا اور اپنے شفیق باپ کے بے رحم تھپڑ کی جلن اپنے رخساروں پر اب تک محسوس کر رہے ہو۔مگر تمھارا ہر سچ تمھارے باپ کے دل پر ایک نیا زخم لگاتا ہے۔یہاں

جھوٹ بولنا ہی سب سے بڑی سچائی ہے۔۔۔۔۔۔جہاں جھوٹی زبانیں ہو ں، جھوٹی باتیں ہوں، جھوٹی آوازیں ہوں اور جھوٹے چہرے ہوں وہاں زہر کے بھرے پیالے کا ذائقہ سچی زبان ہی کو چکھنا پڑتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔مثال خان! تم بھی زہر کا پیالہ پی لو ورنہ تمھارے باپ کو بتایا گیا ہے کہ صبح سورج طلوع ہونے پر تمھارے گھر سے دھواں اٹھتا ہوا نظر آئے گا" (۱۱)

صبح جرگے میں موجود تمام افراد چہروں پر نقلی خول چڑھائے خوشامدی بن کر گاؤں کے خان کی تعریف میں مصروف ہیں۔ گاؤں کا مولوی بھی خان کے بیٹے کو بچانے کے لیے قرآن و حدیث سُنا کر مثل خان اور اُس کے باپ کو ڈرانے میں مصروف ہے۔ جرگہ میں یہ تلخ حقیقت سامنے آتی ہے کہ مثل خان رات کو چارپائی سے گرے تھے اور دانتوں تلے زبان آنے کی وجہ سے زبان کٹ گئی ہے۔ یوں سچ بولنے والا مثال خان عمر بھر کے لیے بے زبان بن جاتا ہے۔ مصنف نے مثل خان کے توسط سے غریب طبقے کی بے بسی اور خان کے ذریعے جاگیر دار طبقے کی بھرپور عکاسی کی ہے۔

قابل غور بات اس افسانے کا عنوان "زبان بے زبان" ہے۔ زبان رکھنے والا بے زبان کیسے ہو سکتا ہے ؟اور جب ہم واقعات میں کھو جاتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ زبان رکھنے والا بول نہیں سکتا۔ اس افسانے کی تمام کڑیاں اور واقعات ایک دوسرے میں اس قدر پیوست ہیں کہ ایک دوسرے سے الگ کر دیکھنا ممکن نظر نہیں آتا۔ طاہر نے بھرپور توجہ سے پلاٹ تیار کیا ہے۔ تمام واقعات سے ایک ہی تاثر ابھرتا ہے جو افسانے کی جان ہے۔ لہٰذا پلاٹ کے اعتبار سے یہ بڑا کامیاب افسانہ ہے۔ افسانہ نگار کی زیادہ تر توجہ کرداروں پر رہی ہے اس افسانے میں باقی تمام افسانوں سے زیادہ کردار ہیں۔ خان، بابا ہمیش گل، ملک منان، مولوی صاحب اور مثال خان کے والدین۔ تمام کردار اپنی اپنی جگہ مکمل بھی ہے اور زندگی کی قریب بھی۔ انسان خیر و شر کا مجموعہ ہے اور یہی چیز ان کرداروں میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ مثال خان اس افسانے کا مرکزی کردار ہے۔ بچپن سے لے کر جوانی تک کا سارا کردار فطرتی خوبیوں اور خامیوں کا حامل ہے۔ بڑا معصوم اور فطری کردار ہے۔

افسانہ "زبان بے زبان" اپنے موضوع اور فنی ترتیب کی رو سے نہ صرف طاہر کے نمائندہ افسانوں میں شمار کیا جا سکتا ہے بلکہ اپنی انفرادیت کے حوالے سے اردو کے بڑے افسانوں میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح کے افسانوں کو پڑھ کر قاری سوچنے لگتا ہے کہ ایک ایسا فن کار جس نے کسی سکول یا کالج سے نہیں پڑھا ہے ایسی فنی اور فکری پختگی کے ساتھ اس قدر مکمل افسانے کیسے لکھ سکتا ہے ؟۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ بعض لوگ فطری افسانہ نگار ہوتے ہیں انہی میں سے ایک طاہر بھی ہے۔

طاہر آفریدی کے مندرجہ بالا افسانوں کے تجزیے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس خطے میں آباد غریب اور مفلوک الحال طبقے کے مسائل کا احاطہ اور مقتدر جاگیر دار طبقے کے جبر واستحصال کا تجزیہ، انہوں نے بھرپور انداز میں جزئیات کے ساتھ کیاہے اور علاقائی رسم ورواج کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ یہ خوبی سونے پر سہاگے کا کام دے رہاہے۔طاہر آفریدی کے افسانوں میں موجود موضوعات کا تذکرہ کرتے ہوئے محمد رفیق ان کی ذاتی زندگی اور مشاہدے کا ان الفاظ میں تذکرہ کرتا ہے:

> "طاہر آفریدی نے اس (قبائلی)ماحول میں آنکھ کھولی ہے۔ بچپن گزارا ہے۔۔۔۔۔۔غربت و افلاس سے مملو ماحول میں ،انھوں نے لوگوں کی زندگی سسکتی اور دم توڑتی ہوئی دیکھی تھی ۔اُنھوں نے خود گاؤں کے بے تاج بادشاہ (خان ،ملک)کا جبر لوگوں پر ہوتے ہوئے دیکھا تھا ۔۔۔۔۔۔طاہر نے غریبوں کی وہ جھونپڑیاں دیکھی ہیں جن میں تیل کا چراغ سرِشام ہی سے بجھا یا جاتاہے۔جن کی معصوم آرزوئیں غربت اور افلاس کی گود میں دم توڑتی ہیں۔۔۔۔۔اور اسی چیز نے ان کے افسانوں میں وہ شدت تاثیر پیدا کی ہے۔جو فہمیدہ اختر یا کسی اور افسانہ نگار کے ہاں نہیں ملتی۔دوسرے افسانہ نگار اس کرب کو محسوس کرسکتے ہیں جبکہ طاہر خود اس کرب سے گزر چکے ہیں"۔(۱۲)

یوں یہ کہنا بجاہے کہ موضوعاتی اعتبار سے طاہر آفریدی نے اردو افسانہ کو کئی نئے ذائقوں اور رنگوں سے متعارف کیا۔خیبر پختون خوا کا معاشرتی ماحول، یہاں کے رسم ورواج کے ساتھ ان کے افسانوں میں پوری آن بان کے ساتھ جلوہ گرہے۔طبقاتی تفریق اور خان خوانین کے ظلم واستبداد کا احاطہ کرنا ان کا خصوصی موضوع قرار دیا جاسکتاہے۔

مشرف ربانی نے اگرچہ اپنے افسانوں میں تخیلاتی ماحول کی عکاسی کی۔اتفاقات اور من موجی کرداروں کی بہتات ان کے افسانوں کی منفرد خوبی ہے۔تاہم افسانہ " تہی دامن 'میں انہوں نے جاگیر دارانہ نظام اور گھرانوں میں موجود اس خامی کا تجزیہ کیا کہ مذکورہ گھرانوں کے والدین بچوں کی پرورش نوکروں اور آیاؤں کی سپرد کرکے خود روپے پیسے کمانے، دعوتوں اور کلبوں کے مصنوعی ماحول میں اپنا سارا وقت صرف کرتے ہیں۔یوں ان بچوں میں احساس محرومی پیدا ہوتی ہے۔افسانے کے مرکزی کردار "میں " کے خیالات کو فن پارے میں یوں پیش کیا گیاہے:

> "میرا دل چاہتاہے کہ میں ڈیڈی کی ٹانگوں سے لپٹ جاؤں اور وہ مجھے بازوں میں اٹھالیں ۔ممی کے سینے میں گھس جاؤں اور وہ میرے بالوں اور چہرے کو چوم لیں ۔بالکل اسی طرح جیسے سرونٹ

کواٹر میں رہنے والے خانساما، مالی، چوکیدار کے بچے اپنے میلے کچیلے وجود کے ساتھ اپنے ماں باپ کی آغوش محبت میں دن بھر پناہ لیتے رہتے ہیں۔"(۱۴)

احساسِ محرومی کا شکار یہ بچہ جوان ہوتا ہے تو اُس کا رویہ لوگوں کے ساتھ انتہائی منفی ہوتا ہے۔شائد وہ اپنی محرومی کا انتقال معاشرے سے لینا چاہتا ہے۔والدین بڑھاپے میں اپنے بیٹے کیلئے ترستے رہتے ہیں لیکن بیٹا ذاتی محرومیاں مٹانے کے لیے منفی رستوں کا مسافر بن چکا ہے۔ مشرف ربانی کا یہ افسانہ جاگیر دار ماحول کھلوکھلے پن کا زبردست عکاسی ہے۔ یہ سیاہ حروف ہی کا اثر ہے کہ رفتہ رفتہ جاگیر دارانہ نظام اس خطے میں نفرت کا نشان بن چکا ہے۔اس کھوکھلے نظام کو یہ لوگ لاکھوں کوششوں کے باوجود گرنے سے نہیں بچا سکتے۔

مشرف نے قدم قدم پر بکھری زندگی کی حقیقتوں کو سمیٹا ہے۔ان کے کردار ماورائی اور تخیلاتی نہیں ہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو اس معاشرے کا حصہ ہیں۔ جنہیں معاشرتی زندگی میں کئی پل صراطوں سے گزرنا پڑتا ہے۔انہوں نے سماج کی دکھتی رگوں پر ہاتھ رکھ کر نہ ڈرف موذی امراض کی تشخیص کی ہے بلکہ ان کا علاج اور مداوا بھی ڈھونڈا ہے۔ان کے معاشرتی رویوں کے عکاس افسانوں میں نہ صرف سوچ کی پختگی ملتی ہے بلکہ ان کی ذہانت، تخلیقی صلاحیت،مشاہداتی قوت اور اظہار خیال پر قدرت کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے۔ان کا افسانہ "اک ہم کہ پچھتائے بہت" ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جو اپنی چاہنے والی بیوی صفیہ اور بچی زیبا کو چھوڑ کر یورپ میں ایک نئی دنیا بسا لیتا ہے۔ بڑھاپے میں جب اس کی یورپی بیوی الزبتھ اور دونوں بیٹے جان اور پال اسے بے سہارا چھوڑ دیتے ہیں تو پھر اسے مشرقی بیوی کے خلوص و محبت اور بے پناہ چاہت کا اندازہ ہوتا ہے اور وہ سب کچھ چھوڑ کر اپنی بیٹی کی خاطر مشرق کی پُر خلوص فضاؤں میں لوٹ آتا ہے۔انھوں نے اپنی کہانیوں کو بے جا طوالت دینے کی کوشش نہیں کی جو قاری کے اعصاب شل کر کے اس کے صبر کا امتحان لے۔ ہر کہانی کے اختتام پر ہر کردار خود اپنے انجام کو پہنچ جاتا ہے۔" تہی دامن " کا ہر کردار تہی دامن ہے۔ عمر کے آخری حصے میں والدین اپنے بیٹے کی جدائی میں اس کی قربت کے لیے ترستے رہتے ہیں اور ایک حادثے کا شکار ہو کر مر جاتے ہیں۔

مشرف کے ہاں رومانوی رجحان نمایاں ہے۔ زندگی کے طویل سفر پر چلتے چلتے جن واقعات وحاثات پر ان کی نظر پڑتی ہے انھیں بڑے خلوص سے اپنے قاری کے سامنے پیش کر دیتی ہیں۔ وہ کہانی سادہ اور بیانیہ انداز میں یوں بیان کرتی ہیں کہ زندگی کی جیتی جاگتی تصویر بن جاتی ہے۔ بکھری بکھری بے رنگ زندگی ان کے افسانوں میں سمٹ کر کہانی بن جاتی ہے۔

طاہر آفریدی کا جاگیر دار طبقے کے جبر و استحصال پر مبنی ایک اور افسانہ "دعائے مغفرت" ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار میرو نامی لڑکا ہے میرو کے والد جب ماضی میں بیمار پڑ گئے تھے تو علاقے کے خان دلبر خان نے اس کے علاج معالجے کا خرچہ اٹھایا تھا اور بعد کے حالات یوں درج ہیں:

"زمین تو اس کی دلبر خان نے اس کی باپ کی بیماری پر خرچ کئے ہوئے روپوں کے عوض ہتھیالی تھی۔ اور جب اس کے باپ کا انتقال ہوا تو دلبر خان کچھ عرصہ بعد اس کی ماں سے نکاح کرنے کے بعد مال مویشی اور چھوٹے سے گھر پر بھی قبضہ جما چکا تھا"۔(۱۴)

دلبر خان نے سب کچھ قبضہ میں لے کر کے میرو کو پاگل اور دیوانہ مشہور کر دیا۔ یوں میرو ماں کے مرنے کے بعد ایک ایک نوالے کے لیے ترستا رہا۔ مکافات عمل کے نتیجے میں دلبر خان کا اکلوتا بیٹا مر گیا۔ میرو صرف اُس دن پیٹ بھر کر کھانا کھالیتا ہے۔ دیگر افراد اس حجرے میں بیٹھ کر دعائے مغفرت میں مصروف ہیں تاہم میرو کی زبان پر یہ الفاظ ہیں کہ 'یا اللہ! یہ دن! ایسا دن ہر روز آیا کرے"۔ بھوک، افلاس، غربت اور جائیداد کی ہوس پر مبنی یہ ایک متاثر کن افسانہ ہے۔

انور خواجہ کے اولین افسانوی مجموعے "بوزنے بندر" کا افسانہ "بوزنے بندر" میں مرکزی کردار عبدل گلیات کے جنگل میں بے سرو سامانی کی حالت میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ وہ بندروں کے درمیان غربت زدہ زندگی گزارنے کے باوجود جنگلی حیات کا ہمدرد ہے۔ وہ جنگلات کا بے دردی سے کٹائی کرنے والوں اور بندروں کی غیر قانونی سمگلنگ کرنے والوں کے خلاف مزاحمت کرتا ہے۔ سلیم خان اور سیٹ ہاشم اس کہانی کے جاگیر دار کردار ہیں جو اپنی لالچ اور ہوس کو پورا کرنے کے لیے علاقائی وسائل کو تباہ و برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ عبدل سیٹ ہاشم اور سلیم خان کے درمیان مکالمہ بڑا جاندار اور پر معانی ہے:

"اس برس ایک پارٹی نے بندروں کی ایکسپورٹ کا آرڈر دیا ہے۔ ہم نے سوچا، انکار کر دے، پھر سوچا، مال اچھا ملیں گا۔ اور نارتھ کے جنگل میں بہت بندر ہے ہم بھی پیسہ کمائیں گا"۔۔۔۔۔۔۔۔۔

"میرا خیال ہے۔ دس روپے فی بندر کافی ہو گا"۔

سلیم خان نے کہا"۔ کیوں عبدل ایک بندر پکڑنے کے کتنے پیسے لوگے"؟

عبدل چند لمحوں تک عجیب نظروں سے باری باری انہیں گھورتا رہا۔ پھر بھاری آواز میں بولا۔"میں بندر نہیں پکڑوں گا اور تم لوگوں کو بھی نہیں پکڑنے دوں گا"۔"(۱۵)

عبدل ایک غریب لیکن ساتھ ساتھ خوددار انسان ہے۔ وہ ٹارزن کی مانند جنگلی حیوانات کا محافظ اور دوست ہے۔ جاگیر دار طبقہ اس کو مارنے کی بھی کوشش کرتا ہے لیکن وہ بچ جاتا ہے۔ انور خواجہ کا یہ دلکش اور انوکھا کردار اردو ادب میں اب تک گمنامی کا شکار ہے۔

انور خواجہ نے افسانے "بوزنے بندر" میں انسانوں اور جانوروں کے محبت اور دوستی کو بڑے فعال طریقے سے بیان کیا ہے اور اس کے تناظر میں صاحب حیثیت لوگوں کی ظلم و جبر اور ناانصافیوں کو آشکار کیا ہے۔ "بوزنے بندر" دو مرکزی کرداروں پر مشتمل واقعاتی تسلسل کا افسانہ ہے ایک کردار عبدل کا ہے اور دوسرا کردار عبدل کے دوست "موٹے بندر" کا ہے باقی کردار چند لمحوں کے لیے نمودار ہوتے ہیں جن میں زینوں کا کردار کسی حد تک واضح ہوتا ہے لیکن ٹھیکیدار کا کردار تضاد کا شکار ہے جبکہ مزدوروں کے کردار کو مسخ کیا گیا ہے۔ یہ افسانہ مووی کیمرہ میکنگ کی بہترین مثال ہے یعنی جو کچھ افسانہ نگار کی آنکھ نے دیکھا وہی کچھ قاری کو دکھانے کی کوشش بھی کی۔ اس کے ساتھ ہی جانوروں کی نفسیات کو موٹے بندر اور اس کے ساتھیوں اور بھیڑیوں کے رویے کے ذریعے سے ابھارنے کی کامیاب کوشش بھی کی ۔اس فسانے مین انور خواجہ نے انسان اور حیوان کے بھوک اور جنس کو ایک مشترکہ فطری ضرورت کے طور پر پیش کیا ہے جو حقیقت ہے۔ بوزنے بندر میں انسانوں اور جانوروں کی آپس میں محبت ایک فطری جذبہ ہے۔ جب ایک انسان کسی جانور سے محبت اور پیار کرتا ہے تو پھر وہ جانور بھی اس کے ساتھ محبت کرنا اور اس کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ جس طرح بندر کے اس کردار سے واضح ہوتا ہے۔

افسانہ "سفید پتھر" کا موضوع بھی جاگیر دار طبقہ ہے۔ اسلم اور پروین دونوں ایک دوسرے کو چاہنے والے فارغ البال افراد ہیں۔ دونوں گلیات میں ہنی مون منانے میں مصروف ہیں۔ پھر ڈونگا گلی میں شدید دھند کی وجہ سے اسلم کا پاؤں پھسل جاتا ہے اور وہ نیچے کھائی میں گر کر مر جاتا ہے۔ پولیس انسپیکٹر کی تفتیش سے یہ موت قتل ثابت ہوجاتا ہے۔ اسلم کو اس کے رشتہ دار راشد نے پروین کو حاصل کرنے کے لیے قتل کیا تھا۔ راشد نے اسلم اور پروین کے راستے میں پڑے ہوئے سفید پتھروں کا رخ کھائی کی طرف کیا تھا اور یوں اسلم راستے سے بٹھک کر کھائی میں گر کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ مصنف یہ نکتا واضح کرنا چاہتے ہے کہ راشد جیسے جاگیر دار پروین جیسی حسینہ کو حاصل کرنے کے لیے اسلم جیسے شوہروں کو مارنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔

انور خواجہ کا دوسرا افسانوی مجموعہ "ناشناس" کے نام سے شائع ہوا۔ مذکورہ مجموعے میں شامل افسانہ "گریز" موضوع جاگیر دارنہ نظام کا انحطاط اور چیلنجز کا احاطہ ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار گل رخ نامی نوجوان حسین لڑکی ہے۔ یہ جاگیر دار خاندان سے تعلق رکھنے والی ہے لیکن مقامی روایات سے بغاوت کرکے جیون ساتھی کی تلاش میں

خود سر گرداں ہے۔ منصور ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتا ہے ور معمولی ملازمت کی وجہ سے شادی اوراخراجات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔اس لیے آوارہ گردی کرکے وقت گزار رہا ہے۔گل رخ نامی لڑکی کو وہ دل وجان سے چاہتا ہے لیکن معاشی مسائل نے منصور کو تلخ حقیقت پسند بنادیا ہے۔اب وہ منفی سوچ رکھنے والا، معاشرے سے انتقام لینے والا بن گیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب گل رخ اس کو شادی کی پیشکش کرتی ہے تواس کاجواب نرالا ہوتا ہے:

"''یعنی تمہارا صاف صاف جواب یہ ہے کہ تم مجھ سے کسی حالت میں شادی کرنے پر رضامند نہیں ہو"۔

"مجھے اس فیصلے میں تمھاری اور اپنی عافیت نظر آتی ہے"۔

"اس کامطلب یہ ہے کہ آج سے ہمارے راستے جدا ہیں"۔

"کیوں؟۔۔۔۔۔ہم دوستانہ تعلقات قائم رکھ سکتے ہیں"۔

"وہ کیسے ؟"

"ہم عارضی شادی کرسکتے ہیں"۔

"بکومت ""(۱۶)

اس موڑ پر دونوں کے راستے الگ ہو جاتے ہیں۔تاہم افسانے کے آخری حصے میں جب اتفاقاً دونوں کی ملاقات ہو جاتی ہے تو گل رخ شادی شدہ ہونے کے باوجود یہ کہتی ہے:

"''کل صبح پشاور جو رہاہوں"

"کل کے لیے رک جاؤ۔۔۔۔۔۔۔۔آج رات تومیرے غریب خانہ کو رونق بخشو"۔

"شکریہ"

"میرا شوہر گھر پر نہیں"۔

"تم نے شادی بھی کرلی۔۔۔۔۔۔مبارک ہو"۔

"شکریہ"

"مجھے افسوس ہے میں نہیں آسکتا۔ویسے تم ماشاءاللہ بڑی بے باک ہوگئی ہو"۔

"اور تم کمینے کے کمینے ہی رہے"۔

"مجبور ہوں"۔

"بدمعاشی۔۔۔۔۔لوفر۔۔۔۔۔۔ہرجائی۔۔۔۔۔دور ہوجا میری آنکھوں سے"۔(۱۷)

مصنف نے جاگیر دار طبقے میں موجود اس خامی کو اجاگر کیا ہے کہ اس طبقے میں بعض جنسی خواہشات کی تکمیل کے لیے کسی حد تک بھی جاسکتے ہیں۔انور خوجہ نے اپنی تحریروں میں تخلیقی زبان اور اپنے دل کش اسلوب میں نہایت چابکدستی سے کام لیاہے ا۔وہ شدید سے شدید جذبوں کے اظہار کے لیے بھی آسان سے آسان الفاظ کا ذخیرہ رکھتاہے۔وہ ان لفظوں کو ایک ایسی ترتیب دیتاہے کہ جملے کی ظاہری حیثیت خواہ کتنی ہی سادہ اور حقیر ہو جائے مگر اس کی معنویت کئی گنا زیادہ ہو جائے گی۔انھوں نے فن افسانہ نگاری کے تمام اصولوں کو بہترین انداز میں نبھانے کی کوشش کی ہے۔انھوں نے کردار نگاری کے حوالے سے اردو ادب کو چند خوب صورت اور دل کش کرداروں سے نوازاہے انکے مکالموں میں بے ساختگی اور فطری پن کی کیفیت پائی جاتی ہے۔جزیات کی خوب صورت تصویر کشی اور مناظر فطرت کی منظر کشی کر کے انور خواجہ نے قاری کی دل چسپی اور توجہ افسانے کی طرف مائل رکھنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔افسانوں کا پلاٹ مربوط اور رواں ہونے کی وجہ سے کہانی میں کسی قسم کا جھول اور خلاء محسوس نہیں ہوتا۔یوں ان کے افسانوں میں موجود تجسس و جستجو کی کیفیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جس کی مدد سے قاری پر ہر افسانے کی گرفت مضبوط رہتی ہے۔اور قاری مکمل انہماک اور دلچسپی سے آنے والے واقعات کی رو میں بہتا چلا جاتا ہے۔خوبصورت تشبیہات،استعارات اور محاورات بھی انور خواجہ کے افسانوں ماخاصہ ہے۔ان کی اسلوب میں موجود خوب صورتی اور دل کشی بیان میں ندرت اور انفرادیت پیدا کرتی ہے۔

سید معصوم شاہ ثاقب کا افسانوی مجموعہ "بند مٹھی" کئی اصلاحی کہانیوں پر مبنی ہے۔افسانہ "ناکام کامیابی" میں حاجی شیر دل اور ملک حیات کے درمیان الیکشن کا مقابلہ دکھایا گیاہے۔نتیجہ آنے پر ملک حیات جیت جاتاہے تاہم حاجی شیر دل کے ساتھی ملک حیات کے ساتھیوں پر فائرنگ کرتے ہیں۔ملک حیات زخمی ہو کر وفات پاجاتا ہے۔مصنف نے جاگیر دار طبقے کے درمیان ایلکشن میں ہونے والے پر تشدد واقعات کی زبردست عکاسی کی ہے۔

افسانہ "بند مٹھی" میں ایک عظیم الشان بنگلے کو دکھایا گیاہے۔بنگلے کا مالک سیٹھ باقر ایک جاگیر دار شخص ہے ۔اس کے گھر میں ایک ملازمہ کنیز نامی عورت ہے جس کا شوہر وفات پاچکاہے اور ایک چھوٹا بچہ راجو اس کا اکلوتا بیٹا ہے۔ایک دن سیٹھ باقر کھانے کے کمرے میں گھڑی بھول آیا۔تب انہوں نے اپنے بیٹے ماجد کا کھانے کے کمرے سے گھڑی لانے کے لیے کہا۔ماجد نے راجو کو دیکھ کر اندازہ لگایا کہ اس کے ہاتھ میں گھڑی ہے اس لیے وہ راجو کی طرف لپکا ۔راجو ڈر کر بھاگنے لگا اور گیٹ سے باہر نکل کر تیز رفتار گاڑی کے نیچے آکر مر گیا۔کنیز اس کے پیچھے دوڑی لیکن راجو مر گیا تھا اُس کی بند مٹھی میں بسکٹ کے چند ٹکڑے تھے۔مصنف کا پیغام یہ ہے کہ جاگیر دار طبقے کو تمام غرباء چور نظر آتے ہیں۔

یہ اصلاحی رجحان مصنف کے دوسرے افسانوی مجموعے "ٹوٹی کہاں کمند" میں بھی نمایاں ہے افسانہ "توہین" میں نئے سال کی آمد پر جاگیر دار طبقے کے جشن کی عکاسی کی گئی ہے۔ مون لائٹ کلب میں مغرب زدہ نوجوان نیو ائیر نائٹ میں مصروف تھے۔ کلب کے گیٹ پر شکیل کی کار آکر رُکی۔ امجد نے دیر سے پہنچنے کی وجہ دریافت کی تو شکیل جوابایوں گویا ہوتا ہے:

"شکیل نے شراب کے نشے میں جومتے ہوئے کہا" وہ راستے میں خانہ بدشوں کی جھگیاں پڑتی ہیں نا۔ میں پوھتاہوں انہیں نئے سال کا جشن منانے کی کیا ضرورت ہے۔ گندے غلیظ بچے پٹاخے چھوڑ رہے ہیں۔ خواہ مخواہ روڈ بلاک کیا ہوا تھا۔ ہارن دیا تو ہیڈ لائٹس کی روشنی میں ناچنے لگے "پھر وہ قدرے توقف کے بعد بولا۔

"اگر میں ٹائروں کے نیچے سے اٹھنے والی چیخوں کے لیے رک جاتا تو مزید دیر ہو جاتی"۔(۱۸)

شکیل کردار کے توسط سے مصنف یہ پیغام دینا چاہتا ہے کہ بعض جاگیر دار ہر مذہبی و اخلاقی قیود سے ماوراء زندگی بسر کر رہے ہیں اور ان کی نظر میں غرباء کی کوئی اہمیت نہیں بلکہ وہ تو ان کو انسان بھی نہیں مانتے۔

ثاقب کا انداز تحریر سادہ سبک اور رواں ہے۔ چند لائنوں کے افسانچے مین قاری زندگی کی سمٹی سمٹائی حقیقتوں اور نظریات کی جھلک پاکر زندگی کی صداقتوں کو پالیتا ہے۔ وہ اس قدر واضح اور صاف پیرایۂ اظہار اپناتے ہیں کہ کم علم اور سطحی ذہن کا قاری بھی ان کے افسانوں کی تہہ تک پہنچنے اور اپنا مطلب پانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ان کی تحریر مختصر لیکن پر تاثیر ہے۔ وہ دریا کو کوزے میں بند کر کے اپنی بات قاری تک پہنچاتے ہیں۔ چند سطور پر مشتمل پلاٹ کو وہ اس طرح سادہ الفاظ میں سمو دیتے ہیں کہ قاری لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہانی بڑی سلاست اور روانی سے آگے بڑھتی ہے اور آخر میں ڈرامائی انداز میں کہانی کو ایک نیا موڑ دیکر وہ قاری کو چونکا دیتے ہیں۔ یہی ان کی فنی مہارت ہے۔

احمد پراچہ کا افسانوی مجموعہ "سوتی جاگتی کلیاں" بنیادی طور پر محبت کی موضوع کا احاطہ کرتا ہے۔ تاہم ایک افسانہ "کیچڑ کا پھول" میں جاگیر دار کردار موجود ہے۔ فضل دین ایک غریب کسان، گاؤں کے چودھری کے آگے بیٹھا ہے۔ چودھری اس کی حسین بیٹی گلنار سے شادی کا خواہش مند ہے۔ لیکن خود دار فضل دین اپنی بیٹی کو چودھری کے ہاتھوں فروخت کرنے کیلئے بھی راضی نہیں۔ بیٹی فروخت کرنے کی قبیح رسم اس خطے کے بعض علاقوں میں موجود ہے۔ اس حوالے سے اعجاز احمد یوسفزئی لکھتے ہیں:

"پختون معاشرے کو کیانام دیا جائے گا جہاں اگر ایک طرف عورت کو قابل عزت قرار دیا گیا ہے
تو دوسرے جانب بعض علاقوں میں رواج کے مطابق خواتین کی شادیاں پیسوں کی عوض بھی کی
جاتی ہیں "۔(۱۹)

فضل دین رات کی تاریکی میں گاؤں سے شہر آ کر اپنی بیٹی اور بیوی کے ساتھ رہنے لگتا ہے۔ایک پڑوسن حد سے زیادہ مہربان بن کر فضل دین اور اس کی بیوی کی ہمدردی حاصل کر لیتی ہے۔پھر اپنے بیٹے کے لیے گلنار کا رشتہ مانگتی ہے۔فضل دین بخوشی رشتہ دینے کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے۔تاہم شادی کے بعد وہ بوڑھی عورت،اوراس کا بیٹا گلنار کو لے کر لاہور چلے جاتے ہیں۔اور پھر کئی مہینوں تک رابطہ منقطع رہتا ہے۔گاؤں سے چودھری آ کر فضل دین کو اندوہناک خبر سناتا ہے کہ:

"فضل دین !تم تو بڑے غیرت مند باپ بن رہے تھے۔لیکن جانتے ہو تم نے گلنار کا ہاتھ ایک بردہ
فروش کے ہاتھ میں دے دیا ہے اور اب گلنار ہر شام کو دلہن بنتی ہے اور تاش کے پتوں کی طرح ہر
گاہک کے ہاتھوں میں جاتی ہے "۔(۲۰)

یہ سن کر فضل دین غصہ ہو کر گھر میں بیوی کا گلا گھونٹ کر قتل کا مرتکب ہو جاتا ہے۔مصنف نے چودھری کے توسط سے یہ حقیقت بھی بیان کی ہے۔کہ جاگیر دار لوگ جنسی تسکین کے لیے لاہور تک بھی رسائی رکھتے ہیں۔دوسری طرف خود دار فضل دین اگرچہ گاؤں کے خان کے شکنجے سے تو محفوظ رہا لیکن شہر کے منجھے ہوئے ٹھگوں کے ہتھے چڑھ کر بیٹی اور بیوی دونوں سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔

احمد پراچہ کی کہانیاں زندگی کی کہانیاں ہیں۔زندگی ان کی افسانوں کی رگ رگ میں خون بن کر دوڑ رہی ہے۔رومانیت بھی حقیقت سے ہم آہنگ نظر آتی ہے۔ان کے کردار روزمرہ زندگی کے چلتے پھرتے ہنستے بولتے کردار ہیں جو رومانی ہوتے ہوئے بھی حقیقت کے ایئنہ دار ہیں۔انسانی دکھ درد اور کرب وبلا سے دوچار ہوتے ہیں۔ان کی کہانیاں تصوراتی اور تخیلاتی ہونے کے باوجود حقیقت کے قریب معلوم ہوتی ہیں۔محبت کا ایک معقول تصور ان کی کہانیوں میں ملتا ہے۔اچھے افسانہ نگار کی طرح احمد کا رساذہن ہر لمحہ نئی دنیا کی تلاش میں رہتا ہے ہر افسانے میں نکھری سوچ سامنے آتی ہے۔ان کی افسانوں میں زندگی گونا گوں مظاہر کا حسین امتزاج پیش کرتی ہے جو کبھی احساس کے کرب سے دکھی کر دیتا ہے اور کبھی نشاط وانبساط سے مسرور کرتا ہے۔ہر چند ان کے خیالات میں وہ بلندی اور طرفگی نہیں جو دوسرے بڑے افسانہ نگاروں کے ہاں ملتی ہے لیکن زندگی کے بارے میں ایک صحت مند رجحان ان کے ہاں ملتا ہے۔وہ زندگی کے نشیب وفراز کو قریب سے دیکھ کر اس کی خیالی تصویر بناتے ہیں۔

"فصیلیں" نامی افسانہ میں بھی بنیادی طور پر اس خطہ میں رائج جاگیر دارانہ نظام کے نتیجے میں پرولتاریہ طبقے پر ڈھائے جانے والے مظالم ہیں۔راوی کا کردار جب گاؤں جاتا ہے تو اسے خبر ملتی ہے کہ کرمے نامی جوان لاپتا ہو گیا ہے۔شائد اس جوان کا نام کریم الدین تھا لیکن غربت کی وجہ سے لوگ نام بگاڑتے ہیں۔سو راوی اپنے تجسس ختم کرنے کے لیے ضوطہ خان نامی لڑکے کے پاس جاتا ہے۔ضوطہ خان کا نام بھی لوگوں نے بگاڑ کر کخنے بنایا تھا۔ کخنے اپنے دوست کے غم میں اداس کھیتوں میں پھر رہا تھا۔ کخنے سے بات چیت کے بعد راوی پر کئی راز کھل جاتے ہیں۔ کخنے بتاتا ہے کہ کرمے کو خان نے قتل کیا ہے کیوں کہ خان کی کنواری بیٹی زروبی بی حاملہ ہو چکی تھی۔اور خان کو کرمے پر شک تھا۔اس لیے پہلے اپنی بیٹی کو ایک لیڈی ڈاکٹر کے ذریعے زہریلے انجکشن کے ذریعے مار ڈالا اور پھر کرمے کو بھی قتل کر دیا:

"خان کاکا ایک غیرت مند پٹھان باپ ہے سانپ کے بل کو بند کر دیا اور سانپ کو بھی مار ڈالا اور بوری میں بند کر کے ٹانگے میں ڈالا۔خان کاکا نے باگیں خود سنبھالیں اور مجھے ساتھ لے ہوئے نیچے دریا پر لے گیا۔بوٹی بوٹی کیا اور پھر ایک ایک بوٹی اپنے ہاتھ سے پانی میں بہادی۔"(۲۱)

خان کا کردار یقیناً بڑا سفاک اور درندہ صفت ہے۔کیوں کہ ایک انسان کو محض شک کی بنیاد پر اس طرح قتل کر کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا درندگی کی انتہا ہے۔جب کے آگے چل کر کخنے مزید بتاتا ہے کہ اس کی بیٹی میری وجہ سے حاملہ ہو چکی تھی۔ کخنے یہ بھی بتاتا ہے۔کہ خان نے گاؤں کی ایک غریب لڑکی کو بار بار نفسانی ہوس کا نشانہ بناتا رہا اور جب وہ حاملہ ہو گئی تو چولھا پٹنے کا بہانا تراش کر اس معصوم کو جلا کر مار دیا۔لوگ اس لیے خاموش ہے کہ وہ خان سے ڈرتے ہیں۔زیتون بانو کا یہ جاگیر دار کردار بڑا خونخوار اور سفاک ہے۔تاہم " کخنے" بھی مظلوم اور مجہول کے لبادلے میں ظالم شخص ہے اس کردار کے حوالے سے سائرہ ہاشمی لکھتی ہے:

"زیتون بانو نے کخنے کے کردار کو بڑی فن کاری سے بُنا ہے۔بڑی محنت سے اُبھارا ہے اور وہ اس کے لیے مبارک باد کی مستحق ہیں۔"(۲۲)

مذکورہ شاہکار افسانے کو ناقدین نے بہت سراہا ہے۔کردار نگاری کے اعتبار سے بھی یہ افسانہ کافی بلند معیار کا ہے۔اس کہانی پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے اباسین یوسف زئی نے بھی کردار نگاری کی تعریف کی ہے:

"بانو آپنی ساری کہانیاں اپنے ماحول سے اکٹھا کرتی ہے۔وہ انسانی دکھوں کو سمجھتی ہیں اور ان کی نباض ہیں اور اپنے اس خصوصیت کو انہوں نے اپنے ایک شاہکار افسانے "فصیلے" میں بڑی کامیابی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔اس افسانے کے تمام کردار اپنے ماحول کی گہری چھاپ لئے ہوئے ہیں۔خان کاکا، کرمے، کخنے، سجاد، سجاد کا دوست، نیلی، زرو۔سب ایسے ہی تو کردار ہیں۔خان کاکا

پہاڑوں جیسا سخت دل اور بے رحم۔ زرو بی بی، تمام انسانی کمزوریوں کا مرقع اور مجبور دل کی مالک۔ " گخے "کا بدصورت مردانہ جذب۔ " کرمے "کا نا کردہ گناہ ویسے اس افسانے کا بامعنی کردار گخے ہے۔ میر من بانو اس کردار کو بڑی فن کاری سے تراشا اور پیش کیا ہے "۔ (۲۳)

مندرجہ بالا افسانوں کے تجزیئے سے یہ بات ثبوت تک پہنچتی ہے کہ زیتون بانو نے اس خطے میں موجود جاگیر دار کو بطور موضوع اپنی کہانیوں میں بروئے کار لا کر تخلیقی اُپج کا ثبوت دیا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں اس خطے میں موجود جاگیر دار طبقے کی نفسیات سے بھی اردو دان طبقے کو روشناس کیا ہے۔ الغرض یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ زیتون بانو کے تذکرے کے بغیر خیبر پختون خوا کے اردو افسانہ نگاروں کی فہرست ادھوری رہے گی۔

بانو کے اکثر افسانے طبقاتی معاشرہ کے کوتاہ دست بے بضاعت انسان کا احوال نامہ ہیں جو طبقات کے درمیان تضاد و کشمکش کے مرحلے میں محض تیلیوں کی طرح ان دیکھی انگلیوں کے ساتھ حرکت کرتا ہے۔ اس کے چاروں طرف تضاد اور کشمکش کی پرتیں ہیں ایک کے بعد ایک کھلتا چلا جاتا ہے۔ بانو جو کچھ دیکھتی ہے اور جس طرح اسے محسوس کرتی ہے اسے وہ افسانوں کے ذریعے قاری تک پہنچانے کی کوشش کرتی ہے۔ خصوصی طور پر دیہاتی زندگی، متوسط طبقہ کے مسائل اور ان کی معاشرتی اُلجھنیں بانو کا خاص موضوع ہے۔ بانوں کے افسانوں میں بظاہر یکسانیت نظر آتی ہے۔ تقریباً تمام مجموعے عورت کی ذات اور اس کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کے متعلق ہیں۔ بانو کے افسانوں میں فطری مناظر کی عکاسی میں زیادہ تر گاؤں نظر آتا ہے۔ اور اس عکاسی کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں گاؤں کی معاشرتی زندگی کا عکس بھی نمایاں ہے۔ ساتھ ہی جاگیر دارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کی خامیاں بھی بیان کی گئی ہیں۔ اور خاص کر جنسی رجحان جو منٹو اور عصمت کے افسانوں کا خاصہ تھا وہی بانو کے ہاں بھی نظر آتا ہے۔

خیبر پختونخوا کے اردو افسانہ نگاروں نے جہاں اپنے افسانوں میں خان خوانین اور جاگیر داروں کی ظلم و ستم کو بیان کیا ہے وہاں پختون معاشرے میں موجود ایسے فرشتہ صفت خوانین کے تذکرے بھی کیے ہیں جو کہ نہ صرف اپنے مزارعین کے لیے بلکہ علاقہ بھر کے عوام کے لیے رحمت خداوندی ہوتے ہیں جو کہ جرگوں کے ذریعے فریقین میں مصالحت اور اپنے اموال کے ذریعے غریب و مساکین کی مدد کرتے ہیں۔

سیدہ حسینہ گل کا افسانہ "مات کس کی؟" ایک دلچسپ اور کفایت لفظی کی خوبی سے متصف ہے۔ پشتون معاشرے میں جب کسی کو ایسا مسئلہ درپیش ہو تو وہ ڈاکٹر اور حکیم کے ساتھ ساتھ پیر، فقیر، زیارات، تعویذ گونڈے غرض جہاں بھی اُمید کی کوئی کرن نظر آتی ہو وہاں پہنچ جاتا ہے۔ ہستم خان کا خاندان بھی جائیداد کا وارث پیدا کرنے کے لیے ہر قسم کا حربہ استعمال کرتا ہے۔ مسلسل ناکامی پر سارا نزلہ بیچاری بیوی گل اندام پر گرتا ہے۔ روزروز تیز و تند باتیں اور طنز و طعنے

سنتا اس کی زندگی کا حصّہ بن جاتی ہے۔افسانہ کا مرکزی کردار ملک ہستم خان اپنے علاقے کا بڑا جاگیر دار ہے۔دنیا کی ہر آسائش اس کو میسر ہے تاہم اولاد کی نعمت سے محروم ہے۔وہ اپنی بیوی گل اندام کا علاج مختلف ڈاکٹروں، حکیموں ،پیر، فقیروں ،زیارات اور تعویزات کے ذریعے سے کرتا ہے لیکن ناکام ہو کر اپنا چیک اپ کرتا ہے تو یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ملک ہستم خان جنسی طور پر اولاد پیدا کرنے سے قاصر ہے۔تب ملک صاحب گاؤں کے مزارع کی بیٹی بختو کا رشتہ مانگنے کیلئے جاتا ہے۔شادی کے بعد بچے کے آثار بختو میں پیدا ہو جاتے ہیں۔مصنفہ نے اس بات کا تذکرہ یوں کیا ہے:

> دوسری ڈولی لانے کے ساتھ ہی ہستم خان نے اپنے ننگ وناموس کا جنازہ بھی اپنی ہی کاندھوں پر اٹھالیا۔وہ دو ماہ بعد ملک کے گھر میں بچے کے آثار کی خوش خبری سنی گئی۔۔۔۔لیکن یہ بھلا کسے معلوم تھا۔۔۔۔۔بلکہ اس کا علم تو بس خدا ہی کو تھا کہ بختو کا بستر ملک ہستم خان نہیں بلکہ کرم داد منشی ہی گرم رکھتا۔۔(۲۴)

یوں ملک ہستم خان اپنی جائیداد کیلئے وارث پیدا کرنے کے تگ و دو میں انسانیت کے درجے سے گر کر حیوانیت پر اُتر آتا ہے۔کہانی کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ جاگیر دار طبقہ ذاتی مفادات کے حصول کیلئے تمام تر اخلاقیات اور مذہبی تعلیمات کو بلائے طاق رکھ کر کوششوں میں مصروف ہے۔ان کی نظر صرف دنیا میں موجود آسائشات اور وسائل پر ہیں۔

افسانہ ''شادی کی لکیر'' ایک جاگیر دار غلام بخش رئیسانی کی کہانی ہے۔غلام بخش تمام نعمتوں میں صرف اولاد کی نعمت سے ایک طویل عرصے تک محروم رہا۔تاہم پھر دو جڑواں بچوں کی پیدائش سے وہ انتہائی خوش ہوا۔ایک لڑکا اور ایک لڑکی اس پیدائش کی خوشی میں کئی دن تک خیرات وصدقات کا سلسلہ جاری رہا۔غلام بخش بیٹے سے شدید محبت جبکہ بیٹی سے شدید نفرت کرتا تھا۔کیونکہ بیٹی کی شادی سے اس کی جائیداد کے بٹوارے کا خدشہ لاحق تھا۔جب دونوں جوان ہو گئے تو بی بی سکینہ کیلئے کئی رشتے آگئے لیکن غلام بخش نے بڑے طریقے سے سب کو انکار کر دیا۔بی بی سکینہ پر اب دماغی دورے پڑنے لگے۔کئی ماہر عالموں سے علاج کرایا گیا لیکن اس کی حالت ابتر ہی رہی۔تب ایک ڈاکٹر نے نواب صاحب کو شادی کا مشورہ دیا لیکن وہ اس مشورے کی وجہ سے ڈاکٹر سے ناراض ہو کر اس سے لڑنے لگے۔جب باپ بیٹی گھر آگئے تو نواب صاحب نے بیٹی کو شادی کرنے کی خبر سنائی۔بی بی سکینہ اب خوش وخرم رہنے لگی تب ایک دن نواب صاحب اپنی بیٹی کے پاس آگئے:۔

"تب ایک روز بی بی سکینہ کے کمرے میں گیااس وقت اس کے ہاتھ میں قرآن تھا۔اس نے بی بی سکینہ سے کہا،''سن آج میں نے تیری شادی قرآن سے کر دی ہے۔''بی بی سکینہ نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا ۔جائیداد نے اس کے جذبات قتل کر دیئے۔"(۲۵)

اب بی بی سکینہ پر پھر دورے پڑنے لگے لیکن غلام بخش اس چیز سے بے پرواہ اپنی جائیداد میں مگن رہا۔مصنف نے اس کہانی کے توسط سے جاگیر دارانہ نظام میں عورتوں کو در پیش اس اہم مسئلے کا احاطہ کیا ہے۔افسانے کا مجموعی تاثر بہت خوب ہے۔منجھے ہوئے کہانی نویس نے بہت سلیقے اور کمال مہارت سے کہانی کا پلاٹ تخلیق کیا ہے اور پھر اس تنے ہوئے پلاٹ پر کرداروں کی جاندار شبیہیں نقش کیں۔افسانے کے فن پر مصنف کا کامل عبور اور افسانے کے اسرار و رموز سے آگاہی نے اس کہانی کے تاثر کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔شاندار زبان،خوب صورت جدت نگاری اور حقیقی کردار نگاری نے اس افسانے کی کہانی اور حسن دوام بخش دیا ہے۔

(ب)۔قتل وغارت وانتقام:

جہالت، کم علمی، جنگجویانہ ماحول اور دوسرے ایسے بہت سے وجوہات کے بنا خیبر پختون خوااور اس کے دیہی علاقا جات میں دشمنی و قتل وغارت کا سلسلہ عرصہ دراز سے چلا آرہا ہے۔غربت اور جہالت کے ساتھ ساتھ مزاج کا کڑواپن اور اکثر و بیشتر باہر سے مسلط کردہ جنگیں ہی یہاں قتل وغارت اور کلاشن کوف کلچر کے فروغ کی بڑی وجوہات ہیں۔

پشتون روایت کے مطابق انتقام یا بدلہ لینے کے رواج نے ان کے کندھوں پر بندوق کو جمائے رکھا اور بدقسمتی سے پختون قوم دنیا کے ہم پلہ ہونے سے قاصر رہی۔دنیا روزافزوں ترقی کی دوڑ میں یہ قوم اپنے فرسودہ روایات۔کم علمی اور ذہنی پسماندگی کے بدولت بہت پیچھے رہ گئی۔خاندانی جھگڑوں،اور مسلط کردہ جنگوں کے بنا یہاں کے نوجوانوں نے اپنا بہت سارا وقت گنوا دیا خیبر پختون خوا کے افسانہ نگاروں نے اپنے تخلیقات میں دیہی معاشرت کی عکاسی کرتے ہوئے یہاں رواج پذیر رسومات اور قدیم روایات پر کاربند پختونوں کو بندوق سے محبت اور روایات کی پاسداری کرتے ہوئے خاندانی دشمنیوں کو سال ہا سال نبھاتے دکھایا ہے۔چنانچہ یہاں کے افسانہ نگارون نے یہاں بندوق تھامے کردار، قتل و مقاتلے کے واقعات اور انتقام و یلغار کے کیفات عام نظر آتے ہیں انہوں نے اس معاشرت کی عکاسی کرتے ہوئے یہاں کے معاشرتی حسن و قبیح کو اپنے تخلیقات میں پیش کیا ہے۔

افسانہ نگاروں نے یہاں کی دیہی معاشرت اور قبائل میں رواج پزیر رسم "بدلہ" یا انتقام کے اس روایت کو نشانہ تنقید بنایا ہے کہ جس کے تحت یہ نہیں دیکھا جاتا کہ قاتل کون ہے یا گناہ کس سے سرزد ہوا ہے لیکن مخالف کے کسی بھی آدمی کو دیکھ کر مارا جاتا اور سر کے بدلے سر پورا کر کے معاشرے میں جھوٹے شان بناتا ہے افسانہ نگار معاشرتی اصلاح کی

پیش نظر اپنے افسانوں میں ایسے معاشرتی برائیوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ جس کو مہذب دنیا میں نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور انسانیت کے مزاج کے مطابق بھی نہیں کہ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ گناہ کوئی اور کرے اور سزا کسی اور کو دیا جائے۔ ایسا کرنا فخر وافتخار نہیں بلکہ قابل نفرت اور وہشت وبربریت ہے۔

خیبر پختون خوا کے افسانہ نگار اپنے پیشہ ورانہ ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے اسی معاشرت کی حسن و قبیح کو اپنے افسانوں میں منظر عام پر لاتے ہیں بلکہ اپنے تئی اس معاشرت میں رواج پذیر قابل نفریں روایات ورسومات کی بیخ کنی اور حوصلہ شکنی کی کوشش بھی کرتے ہیں افسانہ "بدلہ" میں سحر یوسف زئی نے ایک ایسے تعلیم یافتہ شخص کے کہانی بیان کی ہے جو کہ نہ صرف ماہر نفسیات بلکہ امریکہ جیسے ملک میں کئی سال گزار کر واپس آتا ہے۔ ان کے قیام امریکہ کے دوران ان کی چچازاد بھائیوں نے ان کے والد کو قتل کر کے ان کے بہنوں سے زبردستی شادی کرلی اور جائیداد پر قابض ہوگئے تھے۔ کچھ عرصہ بعد ان کی چھوٹی بہن والد کا بدلہ لینے کے لیے اپنے شوہر کو مار کر بھاگ جاتی ہے جبکہ ان کی دوسری بہن پر سوتن لا کر اس کو علیحدہ گھر میں قید کیا جاتا ہے دیار غیر سے واپسی پر گلاب خان اپنے دوسرے چچیرے کو بھی قتل کر کے والد کا بدلہ لیتا ہے۔

> "بس میں نے اپنے باپ کی موت بہنوں سے زبردستی شادی اور ان پر ظلم کے واقعات اس کے سامنے بیان کئے اور پھر یہ بتایا کہ میں تمہارا تربور گلاب ہوں یہ سب کچھ جس طرح میں نے اس کو بتایا اس سے وہ اتنا خوف زدہ ہوا کہ اس سے قبل میں خود اسے قتل کروں اس نے مارے دہشت چھلانگ لگائی اور میرے ہاتھ خون سے رنگنے سے بچ گئے۔"(۲۶)

افسانہ نگار نے چچا زاد بھائیوں کی روایتی دشمنی جیسے (یہاں کے روایات کے مطابق تربور جو کہ ایک قسم کی پیدائشی دشمن ہوتے ہیں) دکھایا جنہوں نے گلاب خان کی غیر موجودگی میں گھناونے جرم کا ارتکاب کرتے ہوئے اپنے چچا کو قتل کیا اور روایات کے مطابق ان دونوں بیٹیوں کی جائیداد سمیت قبضہ کر لیا تو دوسری طرف افسانہ نگار نے یہ بھی دکھانے کی کوشش کی، پختون خوا کتنا ہی پڑھا لکھا کیوں نہ بن جائے وہ اپنے روایات کا پاسدار ہی رہے گا ورنہ زندگی بھر طعنے سہتا رہے گا۔ یوں گلاب خان ماہر نفسیات ہوتے ہوئے بھی اپنے والد کے قتل کا بدلہ لے لیتا ہے۔ روایات کی پاسداری اور پشتونولی کی قانون کے مطابق زندگی گزارنا ایک پختون کی مجبوری ہوتی ہے۔

سحر یوسفزئی کے افسانہ "ایک بالشت زمین" میں انہوں نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ پختون اپنی جان تو دے سکتا ہے مگر اپنی آبائی زمین پر پرائے قدم رکھنا بھی برداشت نہیں کرتا اس افسانے میں افسانہ نگار نے گجروں کے ایک قبیلے کا ذکر کیا ہے جو کہ شیخ ملی کی تقسیم ملکیت زمین کی مطابق علاقے میں نا ہونے کے بنا زمین کی حصہ داری سے محروم

رہ گئے تھے اب وہی قبیلہ در در کے ٹھوکرے کھاتا پھر رہا تھا غربت اور اشیاءِ ضرورت کی کمیابی کی وجہ سے بچے، بوڑھے اور خواتین نہایت کمزور اور بیمار رہنے لگے بھوک، پیاس اور موسم کے شدت برداشت نہ کرتے ہوئے ضعیف العمر اور بچے مرنے کے قریب تھے۔ قبیلے کے سردار نے جوانوں کو جمع کرکے ایک حتمی فیصلہ کیا کہ چاہے کچھ بھی ہو، جہاں بھی ہو، جس سے بھی ہو ہم اپنے لیے زمین کا ایک قطعہ حاصل کرکے رہیں گے۔ کہتے ہیں کہ جب غربت اور بہادری اکٹھے ہو جائے تو خطرناک صورت اختیار کر لیتی ہے اور ایسا ہی ہوا قبیلہ کے نوجوانوں نے "اب یا کبھی نہیں"۔ فیصلہ کرکے جانیں قربان کرنے اور اس لاچارگی ور سسکتی زندگی سے چھٹکارہ حاصل کرنے کی ٹھانی۔ قبیلے کا سردار احمد ایک مقامی قبیلے کے خان سے ایک بالشت زمین کا مطالبہ کرتا ہے تو انکار پر ایک ایسا منظر افسانہ نگار نے پیش کیا ہے جو کے ایسے ہی روایت پرست قوم کا خاصہ ہو سکتا ہے۔

> "تھوڑے ہی دیر میں لڑائی شروع ہوگئی انسانوں کا خون جا جا کر چشمے کے پانی میں جمتا رہا۔ مردے اور زخمی چاروں طرف بکھر گئے عورتیں چھتوں پر سے تماشے کو دیکھتی رہی اور آخر کار وہ سردار صرف دو ساتھیوں سمیت رہ گیا اور گرفتار ہو گیا۔" (۲۷)

"ایک بالشت زمین" میں بھی کہانی ایسے موڑ پر اختتام پذیر ہوتی ہے جس کی قاری کو قطعی توقع نہیں۔ احمد جھک کر اپنے جانی دشمن کے خون سے رنگے ہوئے ماتھے کو چوم لیتا ہے۔ سحر جہاں سادہ بیانیہ انداز میں تلخ حقائق سے پردہ اٹھاتے ہوئے معاشرتی پیچیدگیوں اور سماجی الجھنوں کو بیان کرتے ہیں۔ وہاں تخیل کی گلکاری سے یہ حقیقت نگاری رومانی حقیقت نگاری بن کر ابھرتی ہے اور یہ تاثر ان کے افسانوں میں شروع سے آخر تک قائم رہتا ہے۔ مختلف حیثیتوں میں معنویت و افادیت کے لحاظ سے موقع محل کے مطابق لفظ رومانیت کا مفہوم بدلتا رہتا ہے۔ سحر کے افسانے انقلابی رجحان کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ حسن و عشق کے کشمکش کے حامل بھی ہیں۔ ان کے کردار جذباتی وفور سے سرشار بحر زیست میں تلاش حسن میں سرگرداں ہیں۔ اس لیے ان کے افسانے رومانیت اور حقیقت کا اشتراک بن کر سامنے آتے ہیں۔

فہمیدہ اختر کے افسانہ "اپنے دیس میں" یہاں کے دیہی معاشرت کے اس رواج کو نشانہ تنقید بنایا ہے جہاں قتل کا بدلہ لینے کے لیے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ گناہ کس سے سرزد ہوئی ہے بلکہ سر کے بدلے سر اور یوں اپنے انتقام کا بڑھاس نکال لیتے ہیں۔ دشمنوں سے چھپتے چھپاتے شاس خان کب تک گھر اور حجرے میں بیٹھا رہتا اُن سے رہا نہ گیا اور گاؤں کے گلیوں اور کھیتوں کھلیانوں میں نتائج سے بے پرواہو کر گھومنے کا قصد کر لیا ان کے جذبات اور اس کے نتائج کو افسانہ نگار نے یوں قلمبند کیا ہیں۔

"نڈر اور غیّور شماس کی آنکھیں سُرخ ہو گئیں اور وہ جوش سے بولا۔بزدلوں جیسی زندگی سے مجھے بہادرانہ موت لاکھ درجے زیادہ پسند ہے۔ اور اسکے جوان قدم باہر کو اُٹھ گئے ۔ ۔۔۔۔۔۔۔ٹھائیں ،ٹھائیں ۔۔۔قریب کے گندم کے کھیتوں سے بندوق گونج پڑی۔بہار کے ہواؤں نے سانس روک لیے۔سبز پریوں کا رقص تھم گیااور اُن کا پُر جلال اور مہربان شہزادہ زمین پر آرہا۔"(۲۸)

نسل در نسل چلنے والی دشمنیاں یہاں کی دیہی معاشرت اور قبائلی نظام میں کوئی انہونی بات نہیں لیکن ستم ظریفی کہ ان دشمنیوں میں اصل قاتل کے بجائے مخالف خاندان کے سر کردہ شخص کو نشانہ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔افسانہ نگار نے اس روایت کو حدف تنقید بنایا ہے ۔قبائلی زندگی کی نسل در نسل دشمنیاں ،جذبہ انتقام ،توہم پرستی ،اخلاقی اقدار،رہن سہن،قدیم روایات غرض یہ کہ پشتون معاشرے کے تمام خدوخال فہمیدہ کے افسانوں میں واضح نظر آتے ہیں۔"اپنے دیس میں"وہ قبائلی معاشرے کی روایتی دشمنداری پر ماتم کناں ہیں۔

منور رؤف کا افسانہ 'دُروند پختون"(باکردار پختون)کا موضوع جاگیردار طبقے کی باہمی دشمنی اور جاگیر کے لیے خون ریزی ہے۔افسانہ کا مرکزی کردار بہادر خان نامی لڑکا ہے۔نقص امن کی خاطر بچپن ہی میں والدہ بہادر خان کو گاؤں سے شہر لے آتی ہے۔کیوں کہ بہادر خان کے باپ مراد خان کو جائیداد پر تنازعے کی وجہ سے ملک شہزاد خان قتل کر چکا ہے۔اب ماں اپنی اکلوتی بیٹے کو شہر میں اعلیٰ تعلیم دلواتی ہے تاکہ وہ جوان ہو کر دشمن سے انتقام لے سکے۔بہادر خان ایک سلجھا ہوا نوجوان اور قابل ڈاکٹر بن جاتا ہے۔باپ کے قتل کا انتقام لینے کے لیے والدہ ان کو گاؤں منتقل ہونے کو کہتی ہے۔تو وہ والدہ کو کچھ اس طرح سمجھانے کی کوشش کرتا ہے:

"ماں سوچو تو سہی حضور ﷺ نے ہندہ جیسی۔حمزہ کا کلیجہ چبانے والی شقی القلب عورت کو بھی معاف کر دیا تھا۔اور ہم ہے کہ ایک طرف اسی نبی ﷺ کی امت میں ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور دوسری طرف بائیس برس بعد بھی اپنے باپ کے قاتل کو معاف نہیں کرسکتے۔۔۔۔۔ماں!ڈاکٹر زندگی دیتا ہے ۔لیتا نہیں۔میرے پیاری ماں کو میں کس طرح سمجھاؤں میرے پیشے کا تقدس اور میرے نام کا تقدس اسی میں ہے کہ ہم پشتون کے راستے کو درست کریں اور اسے وہ غلط مفہوم نہ پہنایا جائے جو ہماری نسلوں کو ہمیشہ تباہ کرتا رہے"۔(۲۹)

ماں بہادر خان کے سمجھانے پر اپنے شوہر کا خون معاف کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہے ۔یوں جمعہ کے دن گاؤں جا کر بہادر خان جمعہ کی نماز کے بعد تمام لوگوں کے سامنے ملک شہزاد خان کو اپنے والد کا خون معاف کرنے کا اعلان کرتا ہے۔اہلِ علاقہ اور شہزاد خان اس فیصلے سے خوش ہیں۔اور پھر ایک جرگہ کے ذریعے بہادر خان اور ملک شاہزاد خان کی

حَسین و جمیل بیٹی پلوشہ کی شادی ہو جاتی ہے۔اہل علاقہ کی طرف سے بہادر خان کو درند پختون (باکردار پختون) کے خطاب سے نوازا جاتا ہے۔بہادر خان مصنفہ کا ایک مثالی کردار ہے جو پشتون ولی کو درست اور مثبت خطوط پر استوار کرنا چاہتا ہے۔ڈاکٹر رختاج امین نے موضوعاتی تنوع کے ساتھ منور رؤف کے افسانوں کے حوالے سے یوں اظہارِ خیال کیا ہے:

"در اصل پروفیسر صاحبہ کے افسانوں میں فن اور مقصدیت کا توازن ہی ان کے افسانوں کی قدر و قیمت بڑھاتا ہے۔۔۔۔۔وہ معاشرے کو صحت مند اور تمام برائیوں سے پاک دیکھنا چاہتی ہیں جو معاشرے میں ناسور کی طرح پھیل رہی ہیں۔۔۔۔۔انہوں نے مثبت اور تعمیری اندازِ فکر بھی اپنایا ہے۔اور فن افسانہ نگاری کے تقاضے بھی پورے کیے ہیں"۔(۳۰)

مسز منور رؤف کے مندرجہ بالا افسانوں کے تجزیے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ مصنفہ کی نظر اس خطے میں موجود طبقاتی تقسیم پر گہری ہے اور اس خوبی سے متصف افسانوں کا فکری مقام قابلِ ستائش ہے۔مکالمہ نگاری کے اعتبار سے مزکورہ افسانے مکمل اور بھرپور فنی شاہ کار ہیں ۔افسانے کے اکثر کرداروں کی گفتگو سے مقامیت یعنی پشتون معاشرے کی عکاسی ہوتی ہے۔گل رُخ کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پشتون روایات اور رسم و رواج کی دلدادہ ہے ۔اسلوبیاتی حوالے سے "دروند پختون" ایک اچھوتا افسانہ ہے ۔جس میں مقامی الفاظ کا خوب صورت اور بے ساختہ استعمال ہوا ہے مثلاً "تربور"، "دروند پختان" اس کے علاوہ پشتو کے فقرے بھی موجود ہیں جیسے "ٹوپک زما قانون دے"، "غیرت زما قانون دے"۔اس کے علاوہ کرداروں کے نام بھی پشتو زبان پر مبنی ہیں مثلاً گل رخ ،شاہ بانو ،پلوشہ وغیرہ۔افسانے کا انداز تحریر سادہ، بے ساختہ، برجستہ اور رواں ہے اور موضوع کے عین مطابق زبان و بیان کا انتخاب کیا گیا ہے۔جس نے اسلوبیاتی اعتبار سے افسانے کو چار چاند لگا دیے ہیں۔

افسانہ "بیری کا درخت" میں جاگیر دارانہ طبقے کا جائیداد کے لئے ایک دوسرے کو قتل کرنے کے علاقائی رواج کا احاطہ کیا گیا ہے۔افسانے کا مرکزی کردار نصیر خان نامی لڑکا ہے۔جائیداد کے لئے ماضی قریب میں اس کے والد کو رشتہ دار ایوب اور اس کے بیٹے نے مل کر قتل کیا تھا۔تاہم شاطر قاتلوں نے قتل کو طبی موت قرار دیا۔پھر ایوب اور اس کے بیٹے نصیر خان کو مارنے کی کوشش میں خود نصیر خان کی گولیوں کا شکار ہو کر مر جاتے ہیں۔اس منظر کو افسانہ نگار نے کچھ یوں پیش کیا ہیں:

"نصیر خان کے بیل کھیت کے آخری سرے پر جب پہنچے تو اس وقت دو فائر ہوئے اور دونوں گولیاں دونوں بیلوں کے کولہوں میں پیوست ہو گئیں۔بیل اُچھل کر اور ہل کو توڑتے ہوئے بھاگے اسی لمحے نصیر خان نے

ایک طرف چھلانگ لگادی اور جب دوسری مرتبہ فائر ہوئی تو وہ اپنی رائفل تک پہنچ چکا تھا۔ فوری طور پر اس نے بھی جواباً گولی چلائی۔۔۔۔۔۔بس دو گولیاں چلائیں اور دو زندگیاں ختم ہو گئیں اور تیسری مستقبل کے اندھیروں میں دھکیل دی گئی اور دو گھر تباہ ہو گئے۔"(۳۱)

نصیر خان علاقہ غیر (پہاڑی علاقہ جہاں حکومتی رٹ کمزور ہوتا ہے) میں پناہ حاصل کرتا ہے۔ پندرہ برس بعد اپنی محبت ریشمینہ کو دیکھنے کے لیے گاؤں واپس آتا ہے اور ایوب خان کے بیٹے دونوں کو قتل کر کے تمام جائیداد پر قابض ہو جاتے ہیں۔ کہانی کا مرکزی نکتہ جاگیر کے لیے ایک دوسرے کو قتل کرنے کا پشت در پشت سلسلہ ہے۔
اس افسانے میں یہاں کے قتل وغارت اور انتقام کے رویے کو دکھا کر افسانہ نگار یہاں کے باسیوں کو یہ پیغام دیناچاہتا ہے۔ کہ کب تک وہ دشمنی کی بھینٹ چڑھتے رہیں گے اور پیاسی مٹی کو اپنے بھائیوں کے خون سے سینچتے رہیں گے اور کب ان کانٹوں کو ہٹا کر پھول پھل کاشت کرنا شروع کرینگے۔ اگر ان کو مہذب اقوام کے بیچ جگہ حاصل کرنے کی خواہش ہو تو انہیں لازمی طور پر ان نفرتوں کو محبتوں میں بدل دینا ہو گا۔ ان کو جائیداد کی حرص اور دولت کے لالچ سے باہر نکلنا ہو گا جبکہ حسد اور تعصب کے رویے کو بھی بدلنا ہو گا۔

خیبر پختون خوا کے افسانہ نگاروں نے اپنے معاشرت کی عکاسی کرتے ہوئے ان کے مختلف انداز اور معاشرے میں موجود رویوں کو اپنے کاوشوں میں منفرد انداز میں پیش کیا ہیں۔ ایک ہی تہذیب و معاشرت کو زیر بحث لاتے ہوئے اس میں موجود محاسن و معائب کو اپنے اپنے اسالیب وفکری طریق کو بروئے کار لا کر قاری کے لیے آشکار کیا ہیں۔ کسی نے یہاں کے اسلامی اصول پرستی کو اجاگر کرتے روایت کو بیان کیا ہے کہ جس کے تحت جنگ و دشمنی میں ادھیڑ عمر افراد، بچوں اور خواتین کو حفاظت حاصل ہوتی ہیں، تو کوئی اس معاشرے میں موجود اُن نفرت انگیز کرداروں کو آشکار کرتے دکھائی دیتا ہے کہ جہاں بعض روایت شکن کردار بچوں، بوڑھوں حتیٰ کہ خواتین کو بھی انتقام کا نشانہ بنا کر دشمنی کی بڑھاس نکال لیتیں ہیں "متاعِ جان" نامی افسانے میں مرکزی کردار نوری اور اکبر ایک دوسرے کو چاہنے والے نوجوان ہیں۔ تاہم نوری حسین ہونے کی وجہ سے، گاؤں کے جاگیر دار کا رشتہ ان کے لیے آتا ہے۔ مصنف لکھتے ہیں:

"دولت یہاں بھی جیت گئی ارمان بھرے دل دولت کی چکی میں گیہوں کی طرح پس گئے۔ نوری کی آرزوؤں بھری زندگی روپے کی آگ کی نذر ہو گئی"۔(۳۲)

ضمیر گل خان نے نوری کے ساتھ شادی وارث پیدا کرنے کیلئے کی تھی تاہم بچے نہ ہونے کے غم میں ضمیر گل مر جاتا ہے۔ اب نوری کی جوانی موت سے بدتر حالت میں گزر رہی ہے۔ کیونکہ شوہر کی جائیداد پر دیور قابض ہو چکے ہیں اور معمولی جائیداد کے سہارے زندگی اور جوانی گزارنا نوری کے لیے کڑا امتحان ہے۔

افسانہ ''آئینہ چہرہ'' میں بھی افسانہ نگار نے یہاں کے دیہی معاشرت کے اس پہلوں کو اجاگر کیا ہے۔ کہ یہاں دشمن سے بدلہ نہ لینا بزدلی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سیال خان کے بیٹے کے جنازے پر حسب روایت اس کی پگڑی رکھ کر اس کا بدلہ لینے کی قسم اُٹھائی جاتی ہے

"سیال خان نے اس دن دل پر جبر کا پتھر رکھا تھا جس دن اس کے جوان بیٹے جمال خان کا جنازہ قبر میں اُتارا جا رہا تھا۔ وہ تو اپنے بیٹے کے خون کا بدلہ اسی دن اور اسی وقت لے سکتا تھا لیکن یہ تو صرف قرض وصول ہوتا اور سیال خان قرض کے ساتھ ساتھ جانی کو سبق بھی دینا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جانی کو بھی اس درد سے آشنا کر دے جس سے وہ خود دوچار تھا۔"(۳۳)

اس اقتباس سے یہ اندازہ بھی ہو جاتا ہے کہ دشمن سے بدلہ لینے والے لمحات کو پشتو اور غیرت کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ گویا پشتو یا غیرت جہاں مثبت کردار نبھاتی ہے وہاں اس کا منفی رُخ بھی موجود ہے جو انتقام اور خون خرابے پر منتج ہوتا ہے۔ اگرچہ سیال خان کو جو ایک روایتی قبائلی اور انتقامی ذہن کا کردار ہے اسے اپنے کردار کی مناسبت سے عین موقع پر گولی چلا کر جمال خان کے قتل کا بدلہ لینا چاہئے لیکن قبائلی ہوتے ہوئے وہ ایک انسان بھی ہے۔ انسان کتنا ہی ظالم کیوں نہ ہو اپنے دل میں ایک نرم گوشہ ضرور رکھتا ہے۔ جب سیال خان اپنے دشمن کے بیٹے کی شست لیتا ہے تو اس کے چہرے میں اپنے مقتول بیٹے کا چہرہ دیکھ لیتا ہے اور بندوق نیچے کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہاں افسانہ نگار افسانے کا رخ انتقام لینے کی بجائے درگزر کی طرف موڑ دیتا ہے اور قاری کو یہ پیغام دینے کی کوشش کرتا ہے کہ انتقام کی بجائے درگزر سے کام لینا بہت بہتر ہے۔ افسانہ نگار روایتی جذباتی رجحان اور انتقامی سوچ کو سامنے رکھتے ہوئے ایک ایسا رویہ پیش کرنا چاہتا ہے جو پشتو اور پشتونولی کے چہرے کو خوبصورت بناتا ہے۔ ان کی بلواسطہ کوشش ہے کہ قتل و غارت و انتقام کو عفو و درگزر کے جذبے میں منتقل کیا جائے اور یہاں اصلی اسلامی و قبائلی روایات کو پروان چڑھایا جائے۔ اسی طرح باپ کے گناہ میں بیٹے کو مار ڈالنا بھی کسی معاشرے کے لیے اچھا تاثر نہیں دیتا۔ انصاف کا اوّلین تقاضا تو یہ ہے کہ درگزر سے کام لیا جائے اور اگر ایسا نہ ہو سکے تو پھر قانونی چارہ جوئی سے کام لیا جائے اور اگر ایسا بھی نہ ہو سکے تو پھر کم از کم اصل قاتل ہی سے انتقام لیا جائے نہ کہ اس کے بیٹے، بھائی یا بھتیجے وغیرہ کو قتل کر کے اپنے انتقام کی پیاس بجھائی جائے۔

طاہر آفریدی کے ان افسانوں میں انسان کو خیر و شر کا مجموعہ دکھایا گیا ہے۔ دیہی قبائلی معاشرت کو دکھاتے ہوئے انہوں نے نہ صرف اس معاشرت کی خوبیوں کو پیش کیا ہے بلکہ معاشرتی برائیوں کو بھی حدفِ تنقید بنایا ہے۔ ان کے افسانوں کے کردار اگر ایک طرف قاتل اور قابل نفرت ہیں تو دوسری طرف عفو اور درگزر کے پیکر ہیں۔ وہ انتقامی

جذبے سے اندھے انسان کے اندر خیر کی چنگاری کی تلاش بھی کرتا ہے اورانسانیت کا لبادہ اوڑھے ہوئے بھیڑیوں کے اندر کی درندگی کو بھی باہر لانے کی کوشش کرتا ہے۔

طاہر دیہی معاشرے کے کرداروں کے ذریعے انتقام کا وہ رویہ بھی پیش کرتا ہے جس کے تحت کوئی شخص مٹ بھی جاتا ہے اور مٹا بھی دیتا ہے۔ اسی طرح وہ اس معاشرے کے خوبصورت اور بدصورت دونوں رُخ دکھاتا ہے تا کہ یہاں کے باسیوں کو یہ اندازہ ہو کہ اگر وہ چاہیں تو اپنے معاشرے کو مصائب کا جہنم بھی بنا سکتے ہیں اوراپنے معاشرے کو امن کا گہوارہ بنانا بھی ان کے اپنے ہاتھ میں ہے۔وہ خیبر پختون خوا کے باسیوں اور بطور خاص قبائلیوں کی بہادری اور دلیری، حیاوپاکبازی اور مہمان نوازی وایفائے عہد جیسی قدروں کو پیش کر کے ان کے اندر اخلاقی عظمت پیدا کرنا چاہتا ہے اور عظمت کے اسی سائے میں ان کی انتقامی جذبوں کو سرد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔وہ پشتون قوم کو یہ درس بھی دیناچا ہتا ہے کہ وہ پہلے مسلمان اور بعد میں پشتون ہیں۔

افسانہ ''برف پہاڑوں کا آدمی'' میں بھی افسانہ نگار نے اصلاحی انداز اپناتے ہوئے اپنے کردار گل شیر کو قبائلی روایات کے خلاف اپنے دشمن پر گولی چلانے سے باز رکھا۔اگرچہ گل شیر اس بات پر قادر تھا کہ اپنے دشمن کو ٹھکانے لگاتے لیکن انھوں نے عین موقع پر اپنا فیصلہ واپس لیااور اپنے محبوبہ زلفانہ کو بیوہ ہونے سے بچایا۔

"ویسے میرا ارادہ تھا کہ اس شخص کو گولی ضرور ماروں گا مگر جب وہ میرے نشانے پر آیا تو میں نے اس کے پیچھے ایک نغمہ ریز آواز سنی جو زلفانہ کی چوڑیوں کی جھنکار تھی جو اس کے سہاگ کی نشانی تھی جس کی پیشانی پر ابھی سہاگ کا جھومر ہچکولے کھا رہا تھا۔اس کے ہاتھوں پر ابھی تک رنگ حنا باقی تھا۔اس کی کالی زلفوں میں گلاب کے سُرخ پھول مسکرا رہے تھے۔اس نے سرخ رنگ کا جوڑا پہن رکھا تھااور وہ بہت خوش تھی۔میں اس کی خوشی چھیننا نہیں چاہتا تھا۔وہ ایک پھول تھی میری محبت کا پھول۔۔۔۔۔۔اور میں اپنے ہاتھوں اس پھول کو مسل نہیں سکتا تھا۔ میں زلفانہ کی خوش وخرم اور مطمئن دنیا کو اجاڑنا نہیں چاہتا تھا۔میں اس کو اگر اور کچھ نہیں دے سکتا تھا تو اس کی خوشیاں اُجاڑنے کا بھی مجھے کوئی حق نہیں تھا۔میں نے زلفانہ کی خاطر اپنے بدترین دشمن کو معاف کر دیا۔۔۔۔"(۳۴)

اگرچہ یہ رویہ قبائلی روایت کے خلاف ہے لیکن طاہر آفریدی نے قاری کو یہ درس دینے کی کوشش کی ہے کہ ابھی بھی اس معاشرے میں ایسے لوگ موجود ہیں جو کہ انسانیت پر یقین رکھتے ہیں اور دوسروں کے لیے قربانی دینے کا جذبہ رکھتے ہیں۔اور اسی کو ہی انسانیت کے معراج تصور کرتے ہیں۔ افسانہ نگار صرف کرداروں کے ظاہری عمل ہی کو بیان نہیں کرتے بلکہ ایک ماہر نفسیات کی طرح کرداروں کے عوامل کا نفسیاتی تجزیہ بھی کرتے ہیں۔ اگرچہ ماحول کا اثر

تا دیر قائم رہتا ہے لیکن ایسا بھی نہیں کہ انسان کے فطرت کو نہ بدلا جاسکیں۔ فرسودہ روایات کے خاتمے اور انسان دوستی کا خواہاں طاہر اپنے تخلیقات میں یہی درس لیے ہوئے ہیں۔ ''آئینہ چہرہ''، ''برف پہاڑوں کا آدمی''، ''بیری کا درخت''، ''ٹھنڈک''، ''وہ جو گاؤں تھا'' ان کے اسی روایتی انتقام کے مختلف روپ پیش کرتے ہیں۔

معصوم شاہ ثاقب کا افسانہ "انگارے" میں علامتی و تمثیلی انداز میں یہاں کی روایتی انداز انتقام کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اور شعوری طور پر یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ کسی سے انتقام لینا فقط قتل مقاتلہ یا گولی بندوق کے ذریعے ہی نہیں بلکہ اخلاقی شکست دے کر بھی یہ بدلہ لیا جاسکتا ہے۔

"جہنم کے شعلے میرے اندر اُٹھنے والے انتقام کے شعلوں کے آگے ماند پڑ گئے۔ اصل جہنم تو اندر کا ہوتا ہے۔ باہر کے شعلے تو بے معنی ہوتے ہیں۔ روح کو جلانے اور راکھ کرنے والے شعلے انسان کے اندر پلتے ہیں۔ انتقام کے شعلوں نے میرے اندر کے انسان کو مسخ کر کے رکھ دیا تھا۔"(۳۵)

ثاقب نے اس معاشرے کے وہ پہلوں بھی قاری کے سامنے وا کر دیے ہیں جو کہ عام طور پر قاری کے نظروں سے اُجھل ہوتے ہیں۔ دھوکہ دہی، فراڈ اور قتل مقاتلے کے بعد ہتھیائے گئے جائداد کو اس معاشرت میں کوئی معیوب نہیں سمجھا جاتا بلکہ لاولد یا اولاد نرینہ سے محروم شخص کے جائداد کو اس کے بھتیجوں کا حق تصور کیا جات ہے اور اکثر و بیشتر جائداد جلد ہتھیانے کے لیے اس کو رستے سے ہٹانے کے لیے نت نئے منصوبے بنائے جاتے ہیں۔

عبد الکافی ادیب کے افسانہ ''میں بے غیرت نہیں ہوں'' میں خان زرین نام کے ایک کردار کو پیش کیا گیا ہے۔ وہ ایک فوجی سپاہی ہے۔ اس کا رشتہ بچپن ہی میں اپنی ماموں زاد گلشن کے ساتھ ٹھہرایا جاتا ہے۔ جب اس کے ماموں شاہ سید کا انتقال ہو جاتا ہے تو اس کی بیوی اس رشتے سے مکر جاتی ہے۔ دراصل وہ اپنے بھتیجے گل ولی کے ساتھ گلشن کا رشتہ کرانا چاہتی ہے۔ ایک دن جب خان زرین کی ماں مہتابہ گلشن کے ماموں کے گھر اس غرض سے جاتی ہے کہ وہ اس رشتے میں روڑے نہ اٹکائے۔ اس وقت گل ولی بھی گھر پر ہی ہوتا ہے۔ وہ غصّے میں آکر خان زرین کی ماں مہتابہ کو پوری قوت سے دھکا دیتا ہے۔ اس کا سر ایک بڑے نوکیلے پتھر سے لگ جانے پر وہ مر جاتی ہے۔ جب خان زرین کو اصل بات کا علم ہو جاتا ہے تو اپنی ماں کی قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر کہتا ہے:

''ماں مجھے تمہارے سر کی قسم، میں تمہارا بدلہ ضرور لوں گا۔ میں بے غیرت نہیں ہوں۔''(۳۶)

فوج میں ہونے اور قانون سے باخبر ہونے کے باوجود وہ ماں کا بدلہ لینے کی قسم کھاتا ہے۔ جس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اس معاشرے میں نہ صرف ان پڑھ اور جاہل لوگ بلکہ سرکاری عہدوں پر فائز اور قانون سے باخبر لوگ بھی پختون ولی کا ساتھ دے کر قانون کو ہاتھ میں لیتے ہیں اور اس وقت تک ان کی انا کو تسکین نہیں ملتی جب تک کہ وہ اپنا انتقام خود نہ

لیں۔یہی وجہ ہے کہ ایک دن خان زرین بھی اپنی قسم پوری کر کے گل ولی کو موت کے گھاٹ اُتار دیتا ہے۔زمانہ قدیم سے یہ سر زمین جنگ وجدل اور قتل وغارت کا میدان بنتی چلی آرہی ہے۔یہاں کے باسیوں کو کسی وقت بھی چھین سے نہیں بیٹھنے دیا گیا ہے۔اسی وجہ سے یہاں کے لوگ جنگجو،بہادراور دلیر ہوتے ہیں۔اگلے وقتوں میں ان کے اسلاف کو اپنے گھر بار سے زیادہ اپنی قوم کا فکر لاحق رہتا تھا۔اُس دور میں اپنی ساری خانگی دشمنیوں کو چھوڑ کر سب قبیلے ایک ہو جاتے اور باہر سے آنے والے دشمن کے مقابلے کے لیے متحد ہو کر میدان جنگ میں اُتر آتے۔ان جنگوں کے دوران اکثر خاندانی دشمن بھی ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے اور دشمن کے ساتھ لڑتے مرتے اور ایک دوسرے پر آنچ نہ آنے دیتے۔یہ لوگ بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ خودداراور دیانت دار بھی ہوا کرتے تھے۔وہ باہر کی دشمن پر کھڑی نظر رکھتے اوران کی سازشوں کے خلاف متحد ہو جاتے تھے کیونکہ اسی میں پوری قوم کی بقا کا راز مضمر تھا۔اب حالات بدل چکے ہیں، باہر کے دشمن کو خود راستہ اور موقع دے کر اپنے اوپر مسلط کیا گیا ہے۔اب ماحول یہاں تک بدل چکا ہے کہ باہر کے دشمن سے زیادہ خود اپنے گھر سے ڈر محسوس کیا جاتا ہے۔کیونکہ دشمن کی چال اب بدل چکی ہے،اس نے ہر گھر میں چوہے پکڑنے کے لیے بلیلاں چھوڑ رکھی ہیں۔روایتی طور پر اس معاشرے میں دشمن بھی کسی پر پیچھے سے وار نہیں کرتا تھا۔اب بھائی اپنے بھائی سے خوف کھاتا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ دشمنوں کے عزائم کی تکمیل کے لیے میرا گلہ گھونٹ نہ ڈالیں۔

محمد جمیل کاچوخیل کا افسانہ ''پگلی'' علاقہ سوات میں دہشت گرد کاروائیوں اور اس کے وجہ سے در بدر ہونے والے اہل علاقہ پر بیتنے والے تکالیف و مصائب کا تذکرہ ہے۔ زرمینہ کو بہت آرمانوں کے بعد شادی کی پانچویں سال اللہ تعالیٰ ایک بیٹے سے نوازتا ہے۔ لیکن اس جنگ کے دوران ایک طرف طالبان کے ہاتھوں اس کا پولیس شوہر اس وقت زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے جب وہ بیٹے کی پیدائش کے موقع پر اپنی بیوی کے آپریشن کے دوران دوائی لینے میڈیکل سٹور جاتا ہے وہاں مقامی طالبان کی نشاندہی پر دوسرے طالبان اس کو پکڑ کر موت کے گھاٹ اُتار دیتے ہیں۔اب وہ صرف اپنے بیٹے کے سہارے جینے کا عزم کر لیتی ہے لیکن فوج کی بمباری کے دوران اس کا بیٹا اور ساس بھی لقمۂ اجل بن جاتے ہیں۔خوف و دہشت کے ان مناظر کو افسانہ نگار نے یوں پیش کیا ہے:

> "وہ ایک پوٹلی سینے سے چمٹائے بھاگ رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ وحشتناک نظروں سے پیچھے مُڑ کر دیکھتی تو اُسے اپنے گھر اور گاؤں سے آگ کے شعلے اور دھواں اُٹھتا نظر آتا اُسے مسلسل دھماکے سنائے دے رہے تھے ۔اس میں بعض دھماکے اتنی طاقت کے تھے جس سے اُچھل اُچھل کر وہ دوور جا گرتی اور پھر بھاگنے لگتی اور بھی تیز۔"(۳۷)

اس افسانے میں ایک زرینہ کی کہانی بیان کی گئی ہے لیکن زرینہ کی روپ میں یہ ہزار لڑکیوں اور عورتوں کی داستان ہے۔اس کی طرح دوسری عورتیں اور لڑکیاں بھی اپنے شوہروں ،والدین، بھائی بہنوں اور بچوں سے محروم ہو گئیں۔

اس افسانے میں یہ تاثر بھی پوشیدہ ہے کہ اس معاشرے کے بچے جب ازل سے اس قسم کے جنگوں اور تصادم کے درمیان پیدا ہوں گے اور جب ان کی پرورش ایسے ماحول میں ہو گی تو ان کے مزاج میں جذباتیت، انتہا پسندی اور اس قسم کے دوسرے جذبے ضرور پیدا ہوں گے۔ عرصہ دراز سے یہاں کے باسیوں نے جنگ وجدل کے ماحول میں آنکھیں کھولیں ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے اندر جذباتیت اور انتقام کا جذبہ دوسرے قوموں کی بہ نسبت زیادہ ہے۔

محمد جمیل کا چو خیل کا افسانہ ''ٹوٹا ہوا بازو'' بھی اسی موضوع پر لکھا گیا افسانہ ہے۔طالبان کی طرف سے لوگوں کے قتل کرنے اور ان بعض لوگوں کے پورے خاندان کو تباہ کرنے کے واقعات اس میں بیان کیے گئے ہیں جبکہ دوسری طرف فوج کی طرف سے بمباری کے نتیجے میں بھی وہی لوگ مرتے رہے جو طالبان کے ستائے ہوئے ہوتے تھے۔اس افسانے میں سوات پر طالبان کی یلغار اس کے بعد فوج کی بمباری اور شیلنگ میں ہونے والے قتل اور بھرے پڑے گھروں کی تباہی اور اس کے نتیجے میں ہجرت کرنے پر مجبوری تک کے سارے واقعات کو پیش کیا گیا ہے۔اس کے بعد ریلیف کیمپوں میں لوگوں کو کن صورتحال کا سامنا رہا اور ان کی عزت، وقار اور خودی کس طرح مجروح ہو گئی ان سارے حالات کا اس افسانے میں حقیقی تصویر کشی کی گئی ہے۔اس افسانے میں افسانہ نگار نے نہ صرف اس تاریک اور وحشی دور کا المناک منظر نامہ پیش کیا ہے بلکہ اس افسانے میں اس دور کے سوات کی پوری تاریخ بھی محفوظ کی ہے۔

(پ)۔نچلے طبقوں کا استحصال:

دولت کی غیر منصفانہ تقسیم نے اس معاشرے کو کئی طبقات میں تقسیم کر دیا ہے یہاں پر کم لوگوں کے پاس زیادہ دولت اور زیادہ لوگوں کے پاس روزمرہ زندگی کے سہولیات کا فقدان ہے۔ خیبر پختونخوا کے دیہی معاشرے میں بھی یہ طبقاتی کشمکش قابل نفرت حد تک موجود ہے۔ نسل پرستی کا ایک عجیب تصور چلا آرہا ہے۔ دہائیوں سے یہاں کے وسائل اور زمینوں پر قابض اپنے آپ کو پشتون کہلانے والے دوسرے پیشہ ور اور کسب گر ہنر مندو کو کمتر نظر سے دیکھتے ہیں۔یہ معاشرہ پختون، غیر پختون، خان، ملک، سردار سید، گجر اور اس طرح کے دوسرے نسلوں اور قام قبیلوں میں تقسیم در تقسیم ہو تا چلا آرہا ہے۔ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ پختون راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کے بنا پیغمبر خدا ﷺ کے تعلیمات پر عمل پیرا ہوتے اور ان کے فرمان کے مطابق عربی کو عجمی پر اور کالے کو گورے پر کوئی فوقیت حاصل نہیں۔ اور اگر کسی کو فوقیت حاصل ہے تو وہ ہے اس کا تقویٰ، ان کا کردار اور اعمال۔ اگر ہم پشتونولی کی بات کریں تو اس کے مطابق برتری کا

معیار بہادری اور پشتونولی کے اصولوں اور روایات پر کاربند رہنا اور اس کی پاسداری کرنا تھا۔ لیکن دور حاضر میں ان آصولوں کو بھی فراموش کر دیا گیا ہے دریں زمانہ برتری کا معیار اعلیٰ نسبی اور دولت ٹھرایا گیا ہے۔ یہاں کی لکھاریوں نے اسی معاشرت کا باریک بینی سے مشاہدہ کر کے اس کے قابل اصلاح روایات ور سوم رواج، یہاں روار کھے گئے معاشرتی رویوں، طبقاتی کشمکش، اور معاشی ناانصافیوں کو اپنے اپنے اسلوب میں پیش کیا ہے۔

مظہر گیلانی نے اپنے افسانہ ''فاحشہ''میں معاشرے کا وہ دوغلہ پن دکھایا ہے کہ یہاں اگر چہ لوگ فن سے محبت کرتے ہیں بڑے فراخدلی سے ان کو سراہتے ہیں لیکن عملی زندگی میں ان کو داخل کرنے ،رشتہ ناطہ نبھانے کی قطعی اجازت نہیں دیتا۔ اس افسانے کا زبیدہ جو کہ حسن وزیبائش اور دولت کی فراوانی سے معمور ہے لیکن کیا ان کا یہ گناہ کم ہے کہ وہ ایک طوائف ہے۔ اور نیاز اگر چہ ان کو دل وجان سے چاہتا ہے لیکن اپنانے کی جراءت نہیں کر سکتا۔

> " زار وقطار روتی زبیدہ اس گھٹن زدہ ماحول سے نکالنے کی نیاز کی منتیں کر رہی ہے۔ لیکن نیاز ایک کسبی کو اس جہنم سے صرف اس لیے نہیں نکالنا چاہتا کیونکہ اس کے ایسا کرنے سے اس کی خاندانی شرافت تباہ ہو جائے گی۔ وہ شریف زادی جسے اسی معاشرے کے کسی خاندانی فرد نے ہی کسبی بنایا تھا لیکن ایک شریف النسل آدمی پھر سے اُسے اس کا مقام نہیں دلا سکتا۔ کیونکہ وہ سوچتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اُس کی نسل خراب ہو جائے۔"(۳۸)

مظہر یہ واضح کرنے کی کوشش کر رہا ہے کہ یہ معاشرہ اس قدر اخلاقی پسماندگی کا شکار ہے کہ اس میں اتنی لچک ہی نہیں کہ وہ ایک ایسے انسان کو پنپنے کا موقع دے جو کہ اس معاشرے کا مسترد کردہ ہو۔ نیاز اگر چہ زبیدہ سے بہت پیار کرتا ہے لیکن اس میں اتنی اخلاقی جراءت ہی نہیں ہوتی کی وہ اپنے روایات سے روگردانی کر کے زبیدہ کو جیون ساتھی بنالیں حتیٰ کہ وہ ایسی زندگی پر موت کو ترجیح دیتا ہے اور خودکشی کر کے زندگی کا خاتمہ کر دیتا ہے۔

جاگیردارانہ نظام کے نتیجے میں معاشرے میں بڑھتی ہوئی غربت کا احاطہ منور رؤف نے افسانہ "زندگی پر موت کا احسان ہے" میں بڑی فن کاری سے کیا ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار ریشماں نامی لڑکی ہے۔ یہ کم نصیب لڑکی سترہ برس کی عمر میں تین بچوں کی ماں ہے۔ اس کا شوہر محنت مزدوری کے لیے گھر سے باہر گیا ہے۔ ریشماں کے بچے بھوک اور سردی سے نڈھال ہو چکے ہیں لیکن سر درات گئے گھر نہیں پہنچے۔ ریشماں تمام رات آنکھوں میں کاٹ کر شوہر کا انتظار کرتی رہتی ہے۔ شوہر کی تلاش میں نکل کر بچوں کو گھر میں بند کر کے چلی جاتی ہے۔ شہر پہنچ کر کئی بنگلوں پر ایک روٹی مانگنے کے لیے دست سوال دراز کرتی ہے لیکن سوائے جھڑکیوں کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ بطور ملازمہ بھی اس کو کوئی رکھنے کے لیے تیار

نہیں۔امراء کے بچے اپنی مستی میں مست اس پر برف پھینکنے لگتے ہیں۔خالی ہاتھ گھر آتے ہوئے سرور کی لاش دیکھ اسے کوئی دکھ نہیں ہوتا۔بلکہ خود بھی وہ خودکشی کا مصمم ارادہ کر لیتی ہے۔پھر بچوں کا خیال ذہن میں آکر وہ سوچتی ہے:

"انہیں بھی ماردے۔ان کے لیے ہی دنیا میں کیا رکھا ہے۔کھانے کو روٹی نہ پہننے کو کپڑا۔یہ دنیا ان جیسے مفلس و بدحال لوگوں کے لیے نہیں ہے۔یہ امیروں کی دنیا ہے۔۔۔۔۔ہاں امیروں کی۔انہیں کو اس میں رہنے کا حق حاصل ہے۔کیوں کے اس کے پاس کھانے کو روٹی اور پہننے کو کپڑا ہے۔۔۔۔۔ان کو دنیا کی تمام آسائشیں میسر ہیں۔۔۔۔دنیا ایسے ہی لوگوں کے لیے ہے"۔(۳۹)

ریشماں اسی سوچ کے ساتھ گھر پہنچ کر روٹی کے لیے چیختے چلاتے بچوں کو پہاڑ کی چوٹی تک لے جاتے ہیں اور اپنے تینوں بچوں کے ساتھ پہاڑ سے کود کر خودکشی کرتی ہے۔مصنفہ کا نکتہ نظر یہ ہے کہ جب تک یہی جاگیردارانہ نظام موجود ہے تب تک ریشماں جیسی عورتوں کی خودسوزی کے واقعات ہوتے رہیں گے۔ملکی معاشی حالات پر زبردست کاری طنز اس فن پارے میں موجود ہے۔

منور رؤف کے دوسرے افسانوی مجموعے "طرفہ تماشا" کے چند افسانوں کا موضوع بھی،طبقاتی مسائل کا تجزیہ ہے۔افسانہ "شناخت کا بحران" میں جدید مادیت پسند دور کا نوحہ بیان کیا گیا ہے۔جاگیردارانہ اور یورپی تہذیب کے اثرات اس قدر لوگوں کے ذہنوں میں رچ بس چکے ہیں کہ زندگی صرف روپے جمع کرنے کی ایک دوڑ کا نام رہ گیا ہے۔جاگیردار،سرمایہ دار طبقے نے الگ کالونیاں،ہاؤسنگ سوسائٹیاں بنا کر پوش علاقے قائم کر کے خود کو دیگر لوگوں سے برتر ثابت کرنے کی کوشش کی اور پھر اس پوش علاقے میں روپے پیسے کی نمائش بنگلوں،کوٹھیوں،چمکتی دمکتی کاروں،غیر ملکی کپڑوں،برآمد شدہ فرنیچر اور برتنوں کی صورت میں ہوتا ہے۔بچے قیمتی کھلونے ساتھ رکھتے ہیں۔مہنگے سکولوں میں پڑھتے ہیں۔بڑی تقاریب منعقد کر کے دوسروں پر اپنے مال و دولت اور عہدوں کی دھاک بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔اس ماحول میں پہنچ کر افسانے کا مرکزی کردار اُلجھن میں گرفتار ہے:

"بڑی عجیب باتیں تھیں جو روز بروز ہم دونوں کی آنکھیں کھول رہی تھیں۔۔۔۔۔بچپن سے ہی یہ سنتے آئے تھے کہ تعلیم انسان کو انسان بناتی ہے پھر وہ انسان اپنی شناخت آپ بن جاتا ہے۔لیکن یہاں آکر تو ہمیں یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے زر پرستی کے اس بے تحاشا بڑھتے ہوئے رجحان نے ہم سے ہماری شناخت ہی چھین لی ہو"۔(۴۰)

کہانی کا بنیادی نکتا بورژوا اور جاگیر دارنہ طبقہ کی وجہ سے معاشرے میں نمود و نمائش کے بڑھتے ہوئے رجحان پر تنقید ہے۔ کیوں کہ مزکورہ طبقہ میں نمود و زیبائش کا جزبہ زندگی کے ہر موڑ پر موجود ہے اور اس جزبہ کو پائے تکمیل تک پہنچانے کے لیے لوگ حلال و حرام کی تفریق کو بھول چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرے میں غربت کی شرح میں ہوش ربا اضافہ دیکھنے کو ملتا ہے۔

"احسان کا بوجھ" نامی افسانہ میں مصنفہ نے طبقاتی تفریق کو موضوع بنایا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار شہزادی نامی ایک نادار لیکن ساتھ ساتھ خوددار لڑکی ہے ۔عادل شاہ ایک جاگیر دار گھرانے کا فرد ہے لیکن کم ہمت ہے۔ دونوں بچپن سے ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ لیکن جب بات رشتہ جوڑنے کی آتی ہے تو عادل شاہ کہتا ہے:

> "شہزادی میری ماں نے تجھے بیٹی مانا لیکن بہو ماننے کیلئے آمادہ نہیں۔ میں اپنی مرضی سے تمھارے ساتھ شادی کا فیصلہ کروں تو نہ صرف تمھارا بلکہ میرا مستقبل بھی تاریک ہو جائے گا۔ مجھے ممی کے حکم پر دکھ ضرور ہوا لیکن ڈاکٹر ریحان کا رشتہ بھی تو برا نہیں۔ وہ میرا اچھا دوست بھی ہے۔ میری مانو تو یہ رشتہ قبول کر لو"۔(۴۱)

اس مرحلے پر شہزادی عزمِ صمیم کا پتلا بن کر ریحان جیسے امیر زادے کا رشتہ بھی ٹھکرا دیتی ہے۔ شہزادی، شاہدہ اور ملکہ کی صورت میں متحرک اور خوددار سامنے آتے ہیں۔ طبقاتی تفریق پر مبنی ایک اچھی کاوش ہے۔ مصنفہ نے نرالی انداز میں اپنی معاشرتی المیے کو آشکار کیا ہے۔ منور روف کے افسانوی مجموعوں میں "انمول رتن" کے افسانوں کا انداز بیانیہ ہے جبکہ "طرف تماشہ" کے افسانوں میں انتظار حسین کے افسانوں کی طرح قدیم اساطیری رنگ نمایاں ہے۔ افسانہ نگارنے جو افسانے سپرد قلم کئے ہیں ان میں "شناخت کا بحران" فنی لحاظ سے ایک اچھا افسانہ ہے۔ وحدت تاثر جو افسانے کا بنیادی جز ہے اس افسانے میں پوری طرح موجود ہئ۔ دولت کی غیر مساویانہ تقسیم سے جو معاشی بحران جنم لیتے ہیں اس افسانے میں ان کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ مجموعی طور پر مسز منور روف کے افسانے اس اندرونی کرب کی غمازی کرتے ہیں جس سے بیسوی صدی کے اکثر لوگ اور خصوصاً اہل وطن دوچار ہیں۔ یہی مسائل اور یہی دکھ ان کے افسانوں کی روح میں تازگی اور خون میں حرارت بھر دیتے ہیں۔

انور خواجہ کے اولین افسانوی مجموعے "بوزنے بندر" کا افسانہ "بوزنے بندر" میں مرکزی کردار عبدل گلیات کے جنگل میں بے سرو سامانی کی حالت میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ وہ بندروں کے درمیان غربت زدہ زندگی گزارنے کے باوجود جنگلی حیات کا ہمدرد ہے۔ وہ جنگلات کا بے دردی سے کٹائی کرنے والوں اور بندروں کی غیر قانونی سمگلنگ کرنے والوں کے خلاف مزاحمت کرتا ہے سلیم خان اور سیٹھ ہاشم اس کہانی کے جاگیر دار کردار ہیں جو اپنی لالچ اور

ہوس کو پورا کرنے کے لیے علاقائی وسائل کو تباہ وبرباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ عبدل، سیٹھ ہاشم اور سلیم خان کے درمیان مکالمہ بڑا جاندار اور پُر معنی ہے:

"اس برس ایک پارٹی نے بندروں کی ایکسپورٹ کا آرڈر دیا ہے۔ ہم نے سوچا، انکار کر دے، پھر سوچا ،مال اچھا ملیں گا۔اور نارتھ کے جنگل میں بہت بندر ہے ہم بھی پیسہ کمائیں گا"۔۔۔۔۔۔۔۔۔

"میرا خیال ہے۔ دس روپے فی بندر کافی ہو گا"۔

سلیم خان نے کہا"۔ کیوں عبدل ایک بندر پکڑنے کے کتنے پیسے لوگے"؟

عبدل چند لمحوں تک عجیب نظروں سے باری باری انہیں گھور تا رہا۔ پھر بھاری آواز میں بولا۔" میں بندر نہیں پکڑوں گا اور تم لوگوں کو بھی نہیں پکڑنے دوں گا"۔"(۴۲)

عبدل ایک غریب لیکن ساتھ ساتھ خوددار انسان ہے۔ وہ ٹارزن کی مانند جنگلی حیوانات کا محافظ اور دوست ہے۔ جاگیر دار طبقہ اس کو مارنے کی بھی کوشش کرتا ہے لیکن وہ بچ جاتا ہے۔ انور خواجہ کا یہ دلکش اور انوکھا کردار اردو ادب میں اب تک گمنامی کا شکار ہے۔

افسانہ ''پچھتاوا'' میں عاشہ کی عصمت وعفت زر بخت نامی شخص کے ہاتھوں نیلام ہو جاتی ہے۔ عاشہ کے والدین کے انتقال کے بعد وہ بھابیوں کے خود غرضانہ برتاؤ اور بھائی بھاوجوں کی نظر اندازی کے بعد اپنے ایک چاہنے والے زر بخت کے جھانسے میں آکر گھر سے بھاگ نکلنے پر آمادہ ہو جاتی ہے مگر زر بخت عاشہ کی محبت کی قدر نہیں کرتا بلکہ اُسے باعزت زندگی مہیا کرنے کی بجائے اُلٹا گناہ کی دلدل میں دھکیل دیتا ہے۔ اسی طرح ایک ایسی لڑکی جو اپنی ماں کے ساتھ میلاد کی محفلوں میں شریک ہوتی تھی اور محفلوں میں اگربتیاں سلگا سلگا کر عقیدت واحترام سے اپنا سر دوپٹے سے ڈھانپ کر دعائیں مانگا کرتی تھی۔ اب اس کے پاؤں میں گھنگھرو ڈلوا کر سرعام نچوایا گیا۔ عاشہ اگرچہ اب ایک طوائف ہے مگر اس کے دل میں نیکیوں کا اثر ہنوز باقی ہے۔ وہ چوری چھپے رات کی تاریکی میں اپنے گاؤں آتی ہے۔ یہاں وہ اپنے ماضی کے خیالوں میں ایسی گم ہو جاتی ہے کہ راستے ہی میں اس کا پاؤں کسی سخت چیز سے ٹکرا جاتا ہے اور وہ تلملا اُٹھتی ہے۔ اس وقت اس کے جذبات کچھ اس طرح کے ہوتے ہیں:

"جیسے اپنے گھر کے بند کواڑوں کے سامنے بیٹھی ہوئی سر کو جھکائے اپنے پیروں میں بندھے ہوئے گھنگرو کھولنے کی کوشش کر رہی ہے جو گاؤں سے شہر لے جاکر زر بخت نے اس کے پیروں میں بندھوائے

تھے۔۔۔۔۔شرم کے شعلوں سے اس کے گال تمتما اُٹھے،داغدار ماضی کی بدبودار چادر میں منہ چھپا کر رونے لگی، مکروہ خیالوں کی بدصورت چھپکلیاں اس کے ذہن میں اُچھل کر رونے لگیں۔
جیسے گاؤں کی عورتیں اور بچے چھتوں پر چڑھ کر اسے پتھر مارنے لگے ہوں۔ ننگ دھڑنگ بچے اس کے گرد جمع ہو کر ناچنے لگے ہوں۔ غلیظ مکھیاں اس کے چاروں طرف بھنبھنانے لگی ہوں اور غلاظت کی سڑاند ہر طرف پھیل گئی ہو۔۔۔۔!!"(۴۳)

یہی وہ حقیقت ہے جس سے آنکھیں بند نہیں کی جاسکتیں۔ پاکباز عاشہ کو معاشرے کے نظروں میں کمتر بنانے والا اس معاشرے کے اشرافیوں میں سے تھا۔ ان کو اس میدان میں اُتار لانے والا بھی تو اسی معاشرے کا ایک فرد تھا جس کی عاشہ ایک بیٹی ہے۔ زربخت کے بیٹوں کو بڑا ہو کر قابل فخر پشتون کہلانے کا زعم ہے اور اپنی صلاحیتوں کی داد پانے کا استحقاق بھی رکھتے ہیں اور معاشرے میں بلند مقام ملنے کی آرزوئیں ان کے سینوں میں جاگتی ہیں جبکہ عاشہ کے بچوں کو ماں کے نام کا طعنہ ملے گا چاہے وہ لاکھ صلاحیتوں کے حامل ہوں۔ یہ وہی تضاد ہے جسے کھلا تضاد ہی تو کہا جاتا ہے۔ یہ وہ تضاد ہے جس نے معاشرے کی آنکھوں پر تعصب کی پٹی باندھ رکھی ہے۔ افسانہ نگار اسی تضاد اور تعصب کے شکار معاشرے کی آنکھیں کھولنا چاہتا ہے اور یہ واضح کرنا چاہتا ہے کہ جس معاشرے میں کسی کو اس کی صلاحیتوں کی بجائے اس کے حسب و نسب کے حوالے سے عزت دی جائے گی اس معاشرے کی ترقی کے امکانات بہت کم ہوں گے۔ ایسے معاشرے کو ترقی کرنے کی بجائے جمود کا شکار ہونا پڑتا ہے۔

پشتون معاشرے میں بھی اکثر دیگر مشرقی معاشروں کی طرح نسلی تعصب بہت زیادہ ہے۔اس معاشرے میں لوگ کسی کے کمال ہنر مندی اور علمی صلاحیتوں کو نہیں دیکھتے بلکہ خاندان کی نسلی برتری کو دیکھا جاتا ہے اور لوگ زندگی کے کسی میدان میں کمال حاصل کرنے کی بجائے نام نہاد حسب و نسب اور پدرم سلطان بود کے کھوکھلے تصوّرات یا کسی پیرولی کے شجرۂ نسب میں اپنے باپ دادا کے نام کی تکلی لگا کر اپنا ایک الگ نام و مقام بنانے کی موہوم سعی کے پیچھے وقت ضائع کرتے ہیں۔ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی بجائے ان لایعنی باتوں میں زندگی کھپاتے ہیں۔ یہاں اس مرد کو جو ناچ گانے کا پیشہ اختیار کرلیتا ہے لختئی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ جس طرح کہ غربت کی چکی میں پسی ہوئی عورت ناچ گانے اور اسی قسم کے دوسرے پیشوں کے ساتھ وابستہ رہتی ہے یا کوئی شخص کسی لڑکی کو اغوا کرنے کے بعد اسے ایسے اڈوں پر بیچتا ہے جہاں اس سے اس قسم کا پیشہ کیا جاتا ہے غربت اور لاچاری کے ہو تھوں شہر کا رخ کرنے والے سادہ لوح بچے اسی طرح کے لفنگوں کے ہتھے چڑھ کر زندگی بھر نحوست کا جامہ پہن لیتے ہیں۔ اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ خود اسی

ماحول میں ایسا ڈھل جاتا ہے کہ اس کے پاس سوائے اس کام کے اور کوئی چارہ نہیں رہتا۔ اغوا کر کے بھی بچوں کو اس پیشہ میں جھونک دیا جاتا ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ لوگ انہیں جنسی فروخت پر بھی مجبور کر دیتے ہیں۔

وحیدہ فرحت کے افسانہ ''گونگا کلچر'' میں نسلی امتیاز اور زبان و ثقافت کے اختلاف کے بنا رشتوں میں دراڑ پڑنے کے وجوہات بتائے گئے ہیں۔ رافع اپنی یونیورسٹی کی کلاس فیلو کو چاہتا ہے۔ اگرچہ وہ صورت سے اتنا خوبصورت بھی نہیں ہوتا لیکن اس کی شرافت اور خوش اخلاقی سے لیلیٰ اتنی متاثر ہو جاتی ہے کہ اس کے گرد پھیلے رسم و رواج، زندگی کا جدا رہن سہن، زبان، ثقافتی تفرق کے سارے حصار لیلیٰ کی نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح رافع بھی لیلا کی محبت میں اتنا دیوانہ ہو جاتا ہے کہ وہ بھی اپنی ماں کے سخت گیر اصولوں کو بھلا بیٹھا جو ذات برادری کی لاج کی سختی سے قائل تھی اور جو شہر سے دور ایک گاؤں میں اپنے کنبے کی بلا شرکتِ غیرے حکمران تھی۔ جب شہر کی پروردہ لیلیٰ کو رافع اپنی زندگی میں داخل کرانا چاہتا ہے تو اماں جی ایک آہنی دیوار بن جاتی ہے:

"ایک غیر قوم، غیر برادری کی غیر زبان بولنے والی لڑکی ان کے چہیتے ۔۔۔ اتنے لائق فائق بیٹے کو ان سے چھین لے۔ ''نہیں ایسا ہرگز نہیں ہوگا رافع!۔۔۔ اپنی آئندہ نسل کی رگوں میں دوڑتے خون میں ایک غیر قوم، غیر برادری کا کھوٹ شامل کر دوں، نہیں۔۔۔ کبھی نہیں۔'' اماں جی کا فیصلہ اٹل تھا۔"(۴۴)

ایسی سخت گیر اصول رکھنے والی ماں سے الجھنا مشکل تھا کیونکہ پشتون معاشرے میں باپ کے مرنے کے بعد گھر کا سارا اختیار ماں کے ہاتھ میں آجاتا ہے اور وہ جو فیصلہ کرتی ہے اکثر اسے ٹالنا ناممکن بن جاتا ہے۔ لیکن رافع نے بھی ہٹ دھرمی دکھانا اور بغاوت پر اُتر آنا اپنی رگوں میں دوڑنے والے خون سے اخذ کیا ہے۔ وہ اس سلسلے میں ماں کی ایک بھی نہیں سنتا۔ پھر کچھ مصلحتوں کی زنجیریں بھی اماں جی کے سخت گیر اصولوں میں دراڑیں ڈال دیتی ہیں کیونکہ ایک تو سب سے بڑا بیٹا ہونے کے ناطے اور اچھی ملازمت پہ فائز ہونے کی بدولت وہ اب خاندان بھر کا کفیل ہے۔ گاؤں میں اس کی چھوٹی موٹی موروثی جاگیر بھی ہے لیکن اب تو وہ اس خاندان کے بڑھتے ہوئے اخراجات کے لیے ناکافی ہوتی ہے۔ اسی لیے اماں جی کچھ ردوکد کے بعد دل پہ بھاری پتھر رکھ لیتی ہے اور بڑی نیم دلی سے لیلیٰ کو بیاہ کے گھر لے آتی ہے۔ شادی ہونے کے بعد جب اماں جی اپنی بہو کو دیکھتی ہے تو اس کا انداز بدل جاتا ہے۔ یہاں سے لسانی اور ثقافتی اختلاف کے باعث ایک نیا جھگڑا شروع ہو جاتا ہے۔ شادی سے قبل لیلیٰ کو یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ روایت کی پاسداری کرنے والا اور اپنی اقدار کی برتری کے احساس کے حامل معاشرے میں اس کو کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس نے کبھی اس تناظر میں سوچا نہیں تھا کہ زبان، برادری، رسم و رواج کے فرق کا ایک ریلا ہی کبھی ان دونوں کے درمیان اتنی اونچی اور نہ پاٹنے والی فصیل کھڑی کر دے گا۔ اماں جی کو تو وہ شروع دن سے ہی پسند نہیں آئی تھی۔ لیلیٰ بہت چاہتی ہے کہ ساس کے دل میں

اپنی جگہ بنالے لیکن سب کچھ بے سود ہوتا ہے۔اماں جی اپنے ہاتھوں اُسے بھی تعصّب اور نفرت کی صلیب پر چڑھادیتی ہے۔

اسی وجہ سے اماں جی کی ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ لیلیٰ بھی ان کے سارے رنگ اپنالے لیکن لیلیٰ کے لیے یہ سب کچھ بہت مشکل ہوتا ہے۔کیونکہ وہ جدید شہری ماحول میں پلی بڑھی اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی ہوتی ہے اس لیے رسم ورواج ،روایات اور جہالتوں کے پنجرے میں مقیدرہنا اس کو گوارانہیں آتا۔وہ ان روایات کو کھوکھلا، پیسے کا ضیاع اوروقت کافضول مصرف سمجھتی ہے۔وہ سوچتی ہے کہ اتنی تعلیم اس نے اس لیے توحاصل نہیں کی ہے کہ پھرسے جہالتوں کواپنائے۔اس لیے بغاوت کی لہریں اس کے ذہن میں شوریدہ ہونے لگتیں ہیں۔دوسری طرف اماں جی نے بھی توانہیں روایات اور انہی رسومات میں آنکھ کھولی ہوتی ہے اوران ہی کے درمیان جی رہی ہوتی ہے اس لیے اس کو بھی یہ گوارانہیں کہ ایک پرائی ،غیر قوم اور غیر برادری کی عورت آکے اس کی برسوں سے قائم شدہ حکومت میں دخیل بن جائے اور پرکھوں سے آئی روایات کو یکسر بدل کے رکھ دے۔اسی طرح ساس اور بہو کے درمیان یہ رنجشیں، نفرتیں اور تعصّبات شروع ہوجاتی ہیں جوایک سرد جنگ کی بنیادرکھ دیتی ہے۔اماں جی ایسے ایسے احکامات صادر کرتی ہے کہ لیلیٰ جل بھن کے رہ جاتی ہے اور لیلیٰ ضد میں آکروہی کام کرتی ہے جو اماں کو سخت ناپسند ہوتے ہیں۔اماں جی کی شروع دن سے یہ کوشش ہوتی ہے کہ لیلیٰ شہری رنگ ڈھنگ ،طوراطوار چھوڑکے بالکل گاؤں کی سیدھی سادی عورت کاروپ دھارلے۔لباس اوردوسری وضع قطع پراختلاف سے ہٹ کراماں جی یہ بھی چاہتی تھی کہ وہ مکمل طورپراپنی ثقافت اپنائے۔اپنے تہذیب وثقافت کوبالاتراور دوسروں کو بھی اسی پر کاربندرہنے اوراسی کونبھانے کی توقع رکھنے کے بنا رشتوں میں تناؤاور دوری کے کیفیات پیدا ہوجاتی ہے۔۔یہی وجہ ہے کہ رافع بھی اپنی ماں کوکچھ نہیں کہہ پاتا بلکہ اب تواس کو بھی اپنی روایات اوراپنی ثقافت عزیزہونے لگی تھیں۔

نسلی برتری کااحساس اس کے اندر بھی درآیاتھا۔وہ بھی اپنے بیٹے کو بغیرکسی کھوٹ کے اپنے رنگ میں رنگناچاہتاتھا۔جب اسے اندازہ ہوجاتاہے کہ اب اس گھرمیں اس کاساتھ دینے والا کوئی نہیں ۔اوروہ ان ثقافتی اور معاشرتی جکڑبندیوں اورروزروز کے جھگڑوں سے تنگ آنے لگتی ہے اوراسے اندازہ ہوجاتاہے کہ اب ان لوگوں کے ساتھ وہ مزید وقت نہیں گزارسکے گی توایک دن وہ صبح کی نمازادا کرنے کے بعد دعامانگتی ہے اوراس کے بعد اپنابریف کیس اُٹھاکرانتہائی دکھ کے عالم میں گھرسے روانہ ہوجانے کاپروگرام بنالیتی ہے۔ایسے میں رافع بھی جاگ جاتاہے۔وہ رافع سے غمزدہ انداز میں کہنے لگتی ہے کہ اب یہ گھرسب کے لیے جہنم بن چکاہے۔ محبتیں مرگئی ہیں اور نفرتیں پھن پھیلائے کھڑی ہیں اگروہ چاہے بھی توایک دوسرے تک نہیں پہنچ سکیں گے۔اوراب یہ آگ اس کے بیٹے کو بھی نگلنے لگی

ہے۔ اس افسانے میں افسانہ نگار یہ تاثر بھی دینا چاہتا ہے کہ تعصّب کی بنا پر اپنی ثقافت اور اپنی اقدار دوسروں کے سر نہیں تھوپنے چاہئیں۔

غزالہ نگار اور کزئی کا افسانہ "حلقہ تیری زنجیر کا" خیبر پختونخوا کی دیہی معاشرت میں نسلی تفاوت و امتیاز پر مبنی رویوں کے پس منظر میں لکھا گیا افسانہ ہے جس مین افسانہ نگار نے ہم نسب نہ ہونے کے بنا یا سید گھرانے کا بر نہ ملنے بنا بیٹیوں کو گھر بٹھائے رکھتے ہیں۔ اس افسانے میں ہمت و جراءت کا مظاہرہ کرنی والی فرحت ان فرسودہ روایات کو توڑنے میں کامیاب ہو جاتی ہے جبکہ ان کی بہنیں رویات کے بھینٹ چڑھ کر جوانی کھو دیتی ہیں۔ اس معاشرے میں اس حوالے سے بہت سے توہمات پائے جاتے ہیں جس کی وجہ سے نہ تو سید گھرانے کی لڑکی غیر سید و میں بیاہی جاتی ہے اور نہ ہی کوئی اور نہ سید لڑکے کے لیے غیر سید لڑکی لائی جاتی ہے۔ افسانہ نگار اس حوالے سے لکھتی ہیں۔

> "ہمارے بزرگوں نے عجیب کمال کیا تھا۔ علم کی روشنی فراخ دلی سے بخش کر پھر وہی صدیوں پرانے رسم ورواج ہم پر لاگو کر دیتے تھے۔ نئے وقتوں کی تازہ ہوا بھی لگنے دی تھی اور پھر ان پرانی حویلی کے اونچے اونچے در و دیوار ہماری اونچی پرواز کی راہ میں حائل کر دیے تھے۔" (۴۵)

ثقافت طرزِ زندگی کا نام ہے اور ہر علاقے کی اپنی طرز زندگی ہوتی ہے۔ ہر علاقے کی آب وہوا، وہاں کے حالات اور ماحول کے مطابق ان لوگوں کا لباس اور رنگ ڈھنگ اور طور طریقے بن گئے ہوں گے۔ ثقافت ہر قوم رکھتی ہے اور ہر قوم کی ثقافتوں میں خوبیاں اور خامیاں دونوں ہوں گی اس لیے دوسروں کی ثقافتوں کی خوبیوں کا اثر لینا اچھی بات ہے جہاں تک اپنی ثقافت کی خرابیوں کا تعلق ہے تو ان کو اسی حالت میں اپنے سینے سے چمٹا لینے کی بجائے اس کی اصلاح کرنی چاہیے۔ "حلقہ تیرے زنجیر کا" میں روایات کی زنجیر کے کبھی نہ ٹوٹنے والے بندھن کو بیان کیا گیا ہے جس کی بھینٹ کئی لڑکیاں چڑھادی جاتی ہیں۔ سید لڑکیوں کی شادی غیر سیدوں میں نہیں ہو سکتی۔ کہیں خاندانی وقار اور انا آڑے آتی ہے تو کہیں توہم پرستی قدم پکڑ لیتی ہے اور روایات کا شکار کئی جوان لڑکیاں والدین کی دھلیز پر بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ اس افسانے کے تمام نسوانی کردار روایات سے مجبور ہیں سوائے فرحت کے جو روایات کی زنجیروں کو توڑ کر جینے کا حق حاصل کر لیتی ہے۔ غزالہ نے زیادہ تر نسوانی کرداروں کو پیش کیا ہے۔ ان کے کردار بڑے بے تکلف اور برجستہ گفتگو کرتے ہیں جس سے موقع محل کی نزاکت اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔ ماحول کی نقش گری میں غزالہ کو کمال حاصل ہے۔ وہ الفاظ کا ایسا تانا بانا تیار کرتی ہیں جس سے کردار کی شخصیت کے ساتھ ساتھ ماحول کی عکاسی بھی بھرپور انداز میں ہو جاتی ہے اور قاری افسانے کی فضا سے نہ صرف بخوبی واقف ہو جاتا ہے بلکہ معاشرتی رویے بھی نکھر کر سامنے آجاتے ہیں۔

(ت)۔مذہبی جنونیت:

خیبر پختون خوا کی آبادی تقریباً اکیس ملین ہے۔سب سے بڑا نسلی گروہ پشتونوں کا ہے جن کی آبادی صوبے کے کل آبادی کا تقریباً ۷۲ فیصد ہے۔اس کے علاوہ صوبہ خیبر پختون خوا میں اندازاً پچیس لاکھ افغان مہاجرین بھی قیام پذیر ہیں جن میں اکثریت پشتونوں کی ہے ۔ یہاں کے ادیبوں اور افسانہ نگاروں نے بکثرت اپنے تخلیقات میں انہی پشتونوں کاذکر کیاہے اور یہاں کے تہذیب و ثقافت کو انہی سے جوڑ کر پشتون تہذیب و ثقافت کانام دیاہے۔اسلام اور پشتونولی کی مشترکہ خصوصیات ہی کے بنا شائد سب پختون من حیث القوم مذہب اسلام میں داخل ہو گئے۔ان خصوصیات میں راست بازی ،مہمان نوازی، شجاعت و بہادری، ظالم کی مخالفت اور مظلوم کی حمایت،اور سخاوت وغیرہ شامل ہیں۔پشتون پیدائشی طور پر مسلمان ہوتے ہیں جبکہ کوئی غیر مسلم پشتون کو اپنے اندر نہ سما سکیں مولانا عبد القادر اس حوالے سے لکھتے ہیں۔

"اسلام کے سوا کسی دوسری مذہب کا تصور پختونوں کے یہاں نہیں ملتا۔جو پشتون پیدا ہوا ہے وہ پشتون خواہ مخواہ مسلمان ہو گا۔دین اسلام کے اخلاق وعقائد سے روگردانی گویا پشتو سے روگردانی ہے۔اس لیے آج بھی اگر کوئی دین اسلام ترک کر دیتاہے تو اس کو پشتون ولی سے یکسر نکال دیاجاتاہے۔اس کے بعد وہ ایک عیسائی،ہندو یا سکھ کی طرح تو رہ سکتاہے مگر پشتون کی حیثیت سے معاشرے میں جگہ نہیں پاسکتا۔پشتون ہندو، پشتون سکھ ،پشتون عیسائی یا پشتون یہودی کا تصوّر بھی نہیں کیا جاسکتا۔"(۴۶)

اسی طرح پشتونولی کے اصول وضوابط پر بھی اگر غور کیا جائے تو وہ بھی اسلامی ضابطہ حیات سے بڑی حد تک ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔پشتون چونکہ بہت پہلے اسلام قبول کر چکے ہیں اس لیے پشتونولی کے ضابطے اسلامی ضابطے کے تحت پروان چڑھتے رہے ہیں۔پختونوں کے یہاں مذہب کو خاص اہمیت حاصل ہے۔کسی بھی معاملے میں اسلام کو مد نظر رکھنا پختونوں کے یہاں اور کسی بھی اقدام سے پہلے مذہب سے پرکھنا ان کی روایت ہے۔یہی وجہ ہے کہ دیں داری اوراسلامی احکام کی پیروی کو پختون معاشرے میں اولیت کا درجہ حاصل ہے ۔پشتون معاشرے میں جو شخص جتنا زیادہ باعمل اور دیندار ہو گا اسے اتنا ہی بلند مقام دیاجاتاہے اور لوگ اس کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

فارغ بخاری اور رضا ہمدانی کی مرتبہ کتاب "اٹک کے اس پار"میں شامل افسانہ "خوبانیاں"کے مصنف قتیل شفائی ہے۔اس افسانے کا مرکزی نکتہ پختون قبائل میں موجود توہم پرستی کو سامنے لانا ہے۔مذکورہ افسانے کا مرکزی کردار نوروز نامی ایک نیک فرد ہے۔یہ کردار اس خطے کا ایک نمائندہ، جامد اور روایتی کردار بن کر سامنے آتاہے۔افسانے کے ابتدائی حصے میں مصنف نے نوروز کا تعارف یوں کیاہے:

"نوروز پرانی وضع کا ایک متوکل اور با اخلاق انسان تھا جسے شروع شروع میں گاؤں کے بڑے مولوی صاحب کے تعلیمات نے متاثر کیا اور وہ مسجد کا تنکا بن کے رہ گیا۔ گرمی ہو یا سردی، طوفان ہو یا بھونچال، اسے مسجد کی سیڑھیاں پانچ وقت باقاعدگی سے آتے جاتے دیکھا کرتیں، وہ منہ اندھیرے گھر سے نکلتا، اڑوس پڑوس کے نمازیوں کو ساتھ لیتا"۔(۴۷)

نوروز کلام الٰہی سے آفاقی سماوی پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہے اور لوگوں کو ان عملیات کے بارے میں ترغیب دیتا ہے کہ لوگ بھی اس کار خیر میں شریک ہو سکیں۔ وہ وگوں کو خدارسیدہ لوگوں کی کرامات بیان کرتا رہتا ہے۔ مثلاًوہ لوگوں کو بتاتا ہے کہ:

"جب پیر بابا چترال پہنچے تو معلوم ہوا کہ بادشاہ کے اچانک غائب ہو جانے کی خبر سن کر کافرستان کے لال کافروں نے چترال پہ ہلہ بول دیا ہے ۔۔۔۔۔۔ جب پیر بابا نے یہ حال دیکھا تو ان کے غصے کی انتہا ہو گئی۔ انہوں نے آسمان کی طرف دیکھا اور صرف اتنا کہا "میرے پرستاروں سے یہ سلوک"۔ اتنا کہنا تھا کہ آسمان سے کالے کالے اژدہوں کی بارش ہو گئی جن کو دیکھ کر مخلوق خدا اوسان خطا ہو گئے۔ لیکن پیر بابا کی کرامات تھی کہ اژدھوں نے چترال کے کسی بھی باشندے کو کچھ نہ کہا اور لال کافروں کے ایک ایک فرد کو چن کر نگل گئے"۔(۴۸)

ان واقعات کو سن کر گاؤں کے سادہ لوح لوگ مرعوب ہوتے رہتے ہیں۔ نوروز کے گھر ربانی نامی ایک تعلیم یافتہ لڑکا مہمان بن کر آتا ہے۔ یہ کردار جدید سائنسی دور کے پروردہ نسل کی نمائندگی کر رہا ہے۔ ربانی نوروز کی باتوں کو سن کر منتقی دلیل مانگنے لگتے ہیں۔ یوں قدیم و جدید افکار کا ٹکراؤں ہو جاتا ہے۔ ربانی جدید علوم کی تناظر میں دلائل لاتا ہے جبکہ نوروز توہم پرستی سے بر پھور دلائل لا کر ربانی کو مطمئن نہیں کر سکتا۔ خوبانیون کا موسم جوبن پر ہوتا ہے۔ اچانک اندھی کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں۔ نوروز خوبانیوں کو تباہ ہونے سے بچانے کی لیے پیر بابا کو پکارنے لگتا ہے۔ بعد از دعا طوفان کے اثرات ختم ہو جاتے ہیں۔ نوروز اس فتح پر انتہائی خوش ہے۔ نوروز ربانی سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

"کیوں بیٹا دیکھ لیا نا پیر بابا کے دعاؤں کا اثر، اندھی کو پانی کر دیا ہے ۔۔۔۔۔۔ خدارسیدہ بزرگ کیا کچھ نہیں کر سکتے۔ اگر وہ چاہے تو دریاؤں کے بہاؤں کا رخ بدل دے۔ اگر وہ حکم دے تو پہاڑ اپنی جگہ سے سرک جائے"۔ ربانی کے دماغ پر نوروز کی باتیں ہتھوڑے بن بن کر برس رہی تھیں "۔(۴۹)

جبکہ ربانی کا ذہن ان سب کو ماننے سے انکاری ہے۔ صبح صادق کے وقت دوبارہ آندھی کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں تب آندھی نے تمام درختوں سے پھلوں کا صفایاں کر دیا۔ اب ربانی خوش و خرم اور پرجوش ہے۔ افسانے میں علاقائی

توہم پرستی وضعیف الاعتقادی کا بہترین انداز میں احاطہ کیا گیا ہے۔ جبکہ ربانی کے توسط سے مصنف کا پیغام یہ ہے کہ جدید علوم سے مرصع نئی نسل توہم پرست طبقے کی باتوں میں آنے والا نہیں۔ مربوط پلاٹ، بر محل مکالموں اور فکری خوبیوں سے مزین یہ ایک اچھا افسانہ ہے۔

قتیل نے اوہام پرستی اور پیروں فقیروں کے کردار پر کاری ضربیں لگائی ہیں اور ان لوگوں کو جو ضعیف الاعتقادی کا شکار ہو کر حقائق سے روگردانی کرتے ہیں اور اپنے ایمان اور یقین کو ایسی جھوٹی کہانیوں اور ایسے جھوٹے پیروں پر قربان کر دیتے ہیں درس دیا ہے کہ وہ ان سے گریز کریں۔ خوبانیوں کے باغات سے ایسی عمدہ کہانی کو جنم دینا قتیل کی ذہنی اپچ کا نتیجہ ہے افسانہ ان تمام ترفنی لوازمات کا حامل ہے جو ایک اچھے اور معیاری افسانے کی بنت کے لیے ضروری تصور کئے جاتے ہیں۔ یہی وہ اوصاف ہیں جن سے قتیل کو افسانوی ادب میں اس کے پورے ادبی قد کے ساتھ کھڑا کیا جا سکتا ہے۔

فارغ بخاری اور رضا ہمدانی کی مشترکہ کاوش "اٹک کے اس پار" میں چند اور بھی عمدہ افسانے موجود ہے۔ عبدالودود قمر نے غنی خان (نامی گرامی پشتو شاعر) کی ایک افسانے کا ترجمہ "پور" کے نام سے کیا ہے۔ یہ ترجمہ بھی اس مجموعے میں شامل کیا ہے۔ مذکورہ افسانے میں شیر خان کے والد اپنے علاقے کا جاگیر دار ہے لیکن چچازاد بھائیوں کے ڈر سے دنیا تیاگ کر گوشہ نشین ہو چکا ہے۔ مولوی بن کر دوسروں کو مسجد میں دعوت دین دے رہا ہے۔ تاہم اس کے اس فعل سے شیر خان اور شیر خان کی ماں کو نفرت ہے۔ مصنف لکھتے ہیں کہ:

> "شیر خان کا باپ اپنے گاؤں کا خان تھا بڑا نیک اور پرہیزگار مگر کمزور۔۔۔۔۔ گاؤں کے ملکیت میں خان کے طاقتور تربور (چچازاد بھائی) برابر کے شریک تھے۔ زیادہ اثر ور سوخ اور طاقت حاصل کرنے کے لیے ان کے آپس میں بڑی کشمکش رہتی۔ لیکن شیر خان کا والد کوئی پرواہ نہ کرتا اس دنیا کی کمزوری کی تلافی آخرت کے حسین خوابوں سے کی جاتی ہے۔ شیر خان کے والد کا بھی یہی حال تھا۔۔۔۔۔ ریوالور کی بدلے تسبیح خرید لی اور حجرہ چھوڑ کر مسجد کا ہو رہا۔ وہ دن رات خوف خدا سے کانپ کانپ جاتا۔ پر سچ پوچھئے تو اس خوف کے پردے میں زیادہ تر تربوروں (چچازاد بھائیوں) کا ڈر تھا۔۔۔۔۔ وہ تمباکو اور نسوار کی برائیاں بیان کرتا اور وعظ کے دوران میں اپنی دھاڑی سے کھیلتے جاتا"۔(۵۰)

اس ظاہر داری اور کم ہمتی کی وجہ سے بیوی اور بیٹا دونوں ان سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ شیر خان چچا کے بہکاوے میں آکر جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ اس کہانی کے توسط سے مصنف نے جاگیر دار طبقے کے دین کی طرف رغبت

کا تذکرہ کیا ہے۔ شیر خان کا باپ مسجد میں حالت کی وجہ سے مولوی بننے پر مجبور ہے۔ کیوں کہ اس طرح وہ خود کو چچاذاد بھائیوں کی قہر سے خود کو محفوظ سمجھتا ہے۔

پشتونوں میں انتقام اور دشمن داریاں زندگی بھر چلتی رہتی ہیں بلکہ نسل در نسل منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ پشتون کا جذباتی شدت کا نسلی رجحان قتل و غارت گری مین معاملے کی تحقیق کئے بغیر جلد بازی کر کے اپنی ائندہ آنے والی نسلوں کے لیے انتقام کی راہیں کھول دیتا ہے۔ خاندان تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔ کڑیل جوان پیوند خاک ہو جاتے ہیں لیکن انتقام کی آگ سرد نہیں ہوتی۔ معاف کرنا تو پشتون ولی میں بے غیرتی کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ معاشرے میں اپنا شملہ انچا رکھنے کے لیے کئی جانوں کا زیاں ہوتا رہتا ہے۔ ناک کٹنے کے خوف سے کئی گلے کٹتے رہتے ہیں اور یہ سلسلہ نسل در نسل جاری رہتا ہے۔ اسی معاشرتی المیے کو افسانہ نگار نے اپنے تخلیق میں بھرپور انداز میں اجاگر کیا ہے۔

مجموعے میں شامل رضا ہمدانی کا افسانہ "غوبل" میں مولوی حضرات کی دنیاداری اور لالچ کا تذکرہ موجود ہے۔ مصنف لکھتے ہیں:

> "کسان کھیت میں موم کی طرح پگھلتا رہا اور بچے کھری چارپائی پر دم توڑتے رہے۔ ان کی آنکھیں باپ کے انتظار میں دروازے کی طرف دیکھتے دیکھتے کھلی رہ گئیں۔ جن کے جنازے کے ساتھ مسجد کے امام نے بھی بے اعتنائی برتی اور "جنازہ نماز" کے لیے چنڑیں (مولوی کے شاگرد) ہی کو بھیجنا کافی سمجھا"۔(۵۱)

مولوی حضرات علاقے کے خان اور ملک کے جنازے مین تو خود بھی شریک ہوتے ہیں بلکہ تمام شاگردوں اور عزیزوں کو بھی ساتھ لاتے ہیں کیوں کہ اُن سے کچھ ملنے کی اُمید ہوتی ہے لیکن جب علاقے کا کوئی غریب مر جاتا ہے تو مولوی صاحب اپنے کسی شاگرد کو بھیج کر جنازہ پڑھوا لیتے ہیں۔ افسانہ نگار نے مولوی حضرات کے اس دوغلے پن پر گرفت کی ہے۔

مکالماتی انداز میں لکھا گیا یہ افسانہ فنکاری اور ادبی حسن کا حامل ہے۔ جس میں بھرپور افسانویت ہے۔ انھون نے کسان کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھ کر اس کی مشکلات اور تقاضوں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اسے اپنے حق کے حصول پر ابھارا ہے۔ مصنف نے مزدور کی زندگی کے تلخ اور اٹل حقیقتوں کو افسانے میں اس طرح سمویا ہے کہ اس کے بھیانک پہلوؤں کے ساتھ ماحول اور ثقافت کے نقوش بھی افسانے کے حریری لباس میں بڑے جمالیاتی حسن کے ساتھ سامنے آتی ہیں جس میں ماحول کی تلخی کسی حد تک کم ہو گئی ہے۔

افسانہ 'خشک چٹانیں" کا مرکزی کردار گاؤں کے امامِ مسجد مولوی محمد افضل ہے۔ مولوی صاحب گاؤں کے جاگیردار کی بیٹی گل سانگہ پر عاشق ہو جاتا ہے۔ گل سانگہ کو بھی مولوی صاحب سے محبت ہو جاتی ہے۔ یوں دونوں چھپ چھپ کر ملتے ہیں۔ مولوی صاحب عبد الجید خان صف میں بہترین جگہ دیتے ہیں۔ اس عمل کو عبدالمجید خان پسند کی نظر سے دیکھتا ہے۔ بیوی کے سامنے بھی وہ اس عمل پر خوشی ظاہر کرتا ہے لیکن جب مولوی صاحب عبدالمجید خان سے گل سانگہ کا رشتہ مانگتا ہے تو عبدالمجید خان کا ردِ عمل بڑا شدید ہے۔ وہ اپنی بیوی سے کہہ رہا ہے کہ:

"یہ مسجد کے امام نے مجھے کیا سمجھا ہے"۔ وہ غصے میں بولا
"کیوں کیا بات ہو گئی" اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ "وہ گل سانگہ کا رشتہ مانگتا ہے۔" وہ پھٹ پڑا۔ "اپنی حیثیت کو نہیں دیکھتا کہاں میں پختون (علاقے کا خان) اور کہاں وہ آستانہ دار "۔ "ہوں"۔ (۵۲)

مندرجہ بالا مکالمہ سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ جہاں جاگیردار کا فائدہ وہاں جاگیردار مولوی صاحب کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے لیکن جہالت جہاں ذات پات اور رشتے کی بات آتی ہے تو یہ خان، ملک اور نواب دیگر لوگوں سے اپنے آپ کو برتر نسل خیال کرتے ہیں۔ اگرچہ اسلام سراسر اس طرح کی اونچ نیچ سے دور رہنے کا درس دے رہا ہے۔
گل سانگہ کی محبت میں مولوی محمد افضل کو سنگسار کر دیا جاتا ہے۔ بڑے پتھر کے ساتھ باندھ کر دریا برد کر دیا جاتا ہے۔ گل سانگہ بھی پہاڑ سے چلانگ لگا کر مر جاتی ہے۔ مصنف کا پیغام یہ ہے کہ اس معاشرے میں یہ ایک غلط تصور موجود ہے کہ مذہبی راہنما مطلق سینے میں دل نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا انجام بڑا دردناک ہوتا ہے:

"مولوی افضل جب پتھروں سے نہ مرا تو لوگوں نے مشورہ کیا اور پھر اس کے پاؤں میں رسی ڈال دی گئی۔۔۔۔۔ مولوی افضل کا سر ایک چٹان سے دوسری چٹان پر جا گرتا۔ وہ اُٹھنے کی کوشش کرتا مگر ہاتھ بھی پیچھے بندھے ہوئے تھے۔۔۔۔۔ اس کے بعد اس کے جسم سے ایک بھاری پتھر باندھ دیا گیا۔ اس پتھر سمیت اسے دوبارہ دریا میں ڈال دیا گیا۔ ایک لہر نے اس کو دریا کی تہہ والی چٹان سے جا ٹکرا دیا چند بلبلے سطح آب پر آئے اور پانے دور تک گلابی ہوتا چلا گیا"۔ (۵۳)

یوں ایک جاگیردر کی جھوٹی انا اور احساس برتری پر مولوی صاحب اور گل سانگہ دونوں قربان ہو گئے۔ مولوی صاحب کا کردار اس کہانی میں ایک مظلوم انسان کے روپ میں نظر آتا ہے۔

اس افسانے میں پشتون معاشرت کی روایات کی بھرپور عکاسی کرتے ہوئے "تور" کی رسم کو موضوع بنایا گیا ہے ۔ لڑکا اور لڑکی میں اگر ناجائز تعلقات ہو تو قبائلی رواج کے مطابق دونوں کو سنگسار کر دیا جاتا ہے اور لڑکے کو لڑکی کے بھائی

مارتے ہیں تا کہ اپنی بے عزتی کا بدلہ لے سکیں۔ مسجد کے نوجوان امام کو گل سانگہ سے محبت کے جرم کی پاداش میں سنگسار کر دیا جاتا ہے جبکہ گل سانگہ پہاڑ سے چھلانگ لگا کر جان دے دیتی ہے۔ اکلوتی بیٹی گل سانگہ کی موت پر عبدالمجید کا دل خون کے آنسو روتا ہے لیکن وہ رو نہیں سکتا کیونکہ (تور) سنگسار کئے جانے والے کی موت پر رونا قبائلی رواج کے مطابق بے غیرتی سمجھی جاتی ہے۔

سحر کے افسانے زندگی کے گہرے تجربات اور عمیق مشاہدہ کا نچوڑ ہیں۔ معمولی جزئیات کو بھی کمال فنکاری سے پیش کرتے ہیں جو ان کی انتہائی ذہانت کا ثبوت ہیں۔ معاشرے کی بے حسی کا شکار مجبور انسانوں کی زندگی اور ان کے احساسات کی مصوری ان کے ہاں بڑی خوبی سے کی گئی ہے وہ انسانی دکھوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بناتے ہیں۔وہ معاشرتی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے زندگی کے چند پہلوؤں کو پیش کرنے کی شعوری کوشش کرتے ہیں۔ فنی لحاظ سے بھی ان کی کہانیاں معیاری ہیں۔

رضا ہمدانی نے اپنی کتاب "پشتو افسانے" میں اس خطے کے بہترین افسانوں کا ترجمہ اُردو زبان میں پیش کیا۔ مراد شینواری کے افسانہ "نجب خان" میں ایک حریت پسند نجب خان کی کہانی بیان ہوئی ہے۔ نجب خان بڑی جانبازی سے انگریزوں سے گوریلا جنگ لڑ رہا ہوتا ہے۔ لیکن علاقے کا ضمیر فروش ملک اور کچھ ہوس پرست مولوی انگریزوں کا ساتھ دے کر نجب خان کو علاقہ چھوڑنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ نجب خان نے جب انگریز عورت کی جنگ بندی کا شرط منوانے کے لیے اغوا کیا تو مولوی حضرات نے اس عمل کو غیر شرعی قرار دیا۔ مصنف لکھتے ہیں:

> "جب ہمارے جاسوس نے یہ خبر سنائی تو ہمیں یقین ہو گیا کہ قبیلوی غیرت مر رہی ہے اور پھر سب کے منہ حیرت سے کھلے رہ گئے جب ہم نے یہ سنا کہ خربوخے کے ملّا کا لڑکا کھلم کھلا یہ کہہ رہا ہے کہ "نجب خان نے انگریز عورت کو اغوا کر کے خلافِ شرع کام کیا ہے وہ گنہگار ہے کیوں کہ اس نے پرائی عورت پر بُری نظر ڈالی ہے"۔ ہمیں سخت غصہ آیا کہ ملّا صاحب اس وقت کہاں تھا جب انگریزوں نے ہماری بہوں بیٹیوں کی بے عزتی کی تھی۔ کیا اُس وقت اسے شریعت یاد نہیں تھی۔"(۵۴)

ان ایمان فروش ملاؤں میں ایک حق گو اور حق پرست ملا کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ مصنف لکھتے ہیں:

> "تیراہ کے سارے ملاؤں میں صرف ایک ملا صاحب اخونزادہ ہی ایسا تھا جو انگریزوں کا سخت دشمن تھا اور کسی قیمت پر کبھی ان کے ساتھ سمجھوتے کے لیے تیار نہ تھا"۔(۵۵)

ایک انگریز ایجنٹ نے نیک اور پرہیز گار بندے کا روپ دھار کر مولوی اخونزادہ کو اس بات پر قائل کر لیا کہ انگریز عورت نجب خان سے لے کر فرنگیوں کو واپس کر دی جائے اور یوں گوروں نے اپنا مقصد پورا ہوتی ہی تمام وادی تیرا پر چڑھائی کر دی۔ مصنف نے اس جنگ میں مولوی حضرات کی خود غرضی کا تذکرہ بحسن وخوبی کیا ہے۔ تاہم یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلّم ہے کہ ایمان فروش مولویوں کے درمیان حق پرست مولوی بھی ہر دور اور ہر جگہ اس خطے میں موجود ہوتے ہیں۔

فہمیدہ اختر کے افسانوی مجموعہ "اپنے دیس میں" خیبر پختون خوا کے علاقائی مسائل اور سماجی رویوں کا کماحقہ احاطہ کیا گیا ہے۔ افسانہ "نشانہ" میں وٹہ سٹہ (کسی لڑکی سے اس شرط پر شادی کرنا کہ اُس لڑکی کا بھائی بھی دولہے کی بہن سے شادی کرے) شادیوں کے نقصانات کو اجاگر کیا گیا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار ساز گل اپنے دوستوں کے ساتھ شکار پر پہاری علاقہ میں کئی پرندے مار گراتا ہے۔ کچھ پرندے بھون کر کھانے کے بعد واپس آ رہے ہوتے ہیں۔ وہ اپنی بیوی رومانہ کے لیے بھی چند پرندے ساتھ لے آتا ہے۔ تاہم گاؤں میں داخل ہونے کے بعد ساز گل کو راستے میں بہن خور شائے مل جاتی ہے۔ خور شائے کا کہنا ہے کہ مجھے میرے شوہر میدا خان نے گھر سے دھکے مار کر نکالا ہے۔ خور شائے کو وہ دلا سا دے کر اپنے گھر لے آتا ہے لیکن وہ اُلجھن میں گرفتار ہے کہ کس طرح اپنی پیاری اور چہیتی بیوی رومانہ کو گھر سے نکال دے۔ خور شائے اس بات پر سخت غصہ ہے کہ رومانہ کو ساز گل انتقاماً بھائی کے گھر کیوں نہیں بھیج دیتا؟ بہن اُس کو مخاطب ہو کر کہتی ہے:

"تم بے غیرت ہو، نہیں تو میدا خان کی بے عزتی کا جواب دو۔"(۵۶)

ساز گل کا دوست زیارت گل میدا خان کو اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کا مشورہ دیتا ہے۔ تاہم علاقے کے مولوی کا یہ کہنا انتہائی قابلِ افسوس ہے:

""ساز گل" یہ قریب کی مسجد سے مُلا رحیم کی آواز تھی۔

"کیا ہے"۔

"سنا ہے خور شائے کو میدان خان نے مار کر کھر سے نکال دیا ہے؟"

وہ جھنجلا کر بولا۔ "ہاں تم نے ٹھیک سنا ہے۔"

"تو تماب کیا کروگے؟ تمہارے باپ تو بڑا غیرت مند تھا۔"

جو میرا جی چاہے وہ میں کروں گا" یہ کہہ کر ساز گل آگے چل دیا"۔(۵۷)

ان تمام مشوروں اور طعنوں کو ذہن میں رکھ کر ساز گل اپنی بیوی کو میداخان کے گھر نہ چاہتے ہوئے بھی بھیج دیتا ہے۔ کہانی میں مولوی کا کردار بھی انتہائی منفی ذہنیت رکھنے والے شخص کی ہے۔ اس افسانے میں تجسس کا بے پناہ مادہ موجود ہے۔ قاری آخر تک اس تجسس میں رہتا ہے کہ آیا ساز گل لوگوں کے دباؤ میں آکر فیصلہ کرے گا یا وہ اس جاہلانہ رسم کو توڑ دے گا۔ مگر ساز گل انحراف کے بجائے ارتکاب کر دیتا ہے اور ان فرسودہ روایات کو قائم رکھتے ہوئے بیوی کو ناکردہ گناہ کی سزا دیتا ہے۔ اس افسانے میں بدلے کی شادیوں کے نقصانات کو اجاگر کیا گیا ہے۔ جہاں ظلم کا نشانہ ہر حال میں عورت ہی کو بننا پڑتا ہے۔

فہمیدہ نے صرف کھاتے پیتے لوگوں اور ان سے وابستہ معاملات کو ہی اپنے افسانوں کا موضوع نہیں بنایا بلکہ بھوکی انسانیت اور سسکتی زندگی معاشرتی جبر، فرسودہ روایات اور پشتون قبائلی خواتین پر روا رکھے گئے مظالم کو بھی اپنے موضوعات میں شامل کیا ہے۔ انہوں نے عام رومانی انداز سے ہٹ کر روز مرہ زندگی کے معمولی واقعات میں اپنے سحر کار قلم سے اتنی شدت اور جاذبیت بھر دی ہے کہ قاری بے اختیار حسن اسلوب کا قائل ہو جاتا ہے وہ سادہ رواں اور سلیس انداز میں درد انگیز حقائق بیان کر دیتی ہیں۔ الفاظ کی بندش جذب اور دل کش ہے۔ الفاظ کی دروبست اور مکالمے موضوع سے ہم آہنگ ہیں۔

مسز منور رؤف نے اپنے افسانے میں خیبر پختون خوا کے ماحول کی خوب عکاسی کی ہے۔ "رڑاں (روشنی)" نامی افسانے میں ایک عورت خود کلامی کی انداز میں ماضی کی واقعات دہرا رہی ہے۔ یہ عورت ایک سی ایس پی افسر کی بیوی ہے۔ کئی ملازمین میں سے ایک رڑاں نامی عورت نے بھی ان گھر ملازمت کی۔ رڑاں ایک دیانت دار اور مخلص عورت ہے۔ دورانِ گفتگوں رڑاں کے حالات راوی کردار پر یوں ظاہر ہوتے ہیں:

"میں نے اس کی حالات مختصر طور پر معلوم کئے اور جب پتہ چلا کہ وہ مسجد کے مُلّا کی بیٹی ہے"۔(۵۸)

ان واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ مولوی صاحب نے رڑاں کی تربیت بہترین انداز میں کی ہے۔ رڑاں ایک باشعور اور انسانیت کا درد دل میں رکھنے والی ہے۔ وہ مالکن کے گھر کو اپنا گھر سمجھتی ہے۔ اس کے کچھ جملے راوی کردار کے لیے متاثر کن ہیں۔ مثلاً:

"آج کل لوگ تن کی صفائی پر بہت وقت لگاتے ہیں اور من کا بالکل خیال نہیں کرتے۔ حالانکہ من کا اجلا ہونا زیادہ ضروری ہے"۔(۵۹)

"بی بی انسان کب رہا ہے ۔انسانیت توکب کی مرچکی ہے یہ اس کا جنازہ ہے جسے ہم خوبصورت کفن پہنائے خوشبیوں سے مہیا پھرتے ہیں۔ آپ دیکھتی ہے لوگ کتنے اعلیٰ کپڑے پہنتے ہیں ۔پاوڈر کریمیں لگاتے ہیں ۔ایسے خوشبویں لگاتے ہیں کہ دماغ مہک جاتا ہے لیکن یہ اوپری مہک ہے ۔سوچ بھی ایسے مہکے توبات ہے نا۔"(۶۰)

رڑاں میں موجود خوبیاں تودراصل اس کی ایماندار اور دیانت دار والد کی تربیت کا عکس ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ مالکن کے دل میں اس کا مقام و مرتبہ انتہائی بلند ہے۔

مصنفہ کا ایک اور افسانہ 'فاعتبر وایااولی الابصار"کا مرکزی کردار ایک حق گو مولوی ہے ۔بستی پر مختلف آفاتِ سماوی کا نزول ہورہاہوتا ہے۔ابتداء میں مرغیوں کی گردن مروڑ کر خون پینے کے واقعات رونما ہوتے رہے۔ پھر محلے کے تین بچے لاپتہ ہوگئے اور ڈھونڈنے پر مردہ پائے گئے۔ مردہ لاشوں کے کلیجے اور گردے غائب تھے ۔پھر جو مصیبت آئی اس کا تذکرہ یوں کیا گیاہے:

"پھر اچانک ہی بستی میں کہی سے لال بیگ اُڑتے اُڑتے آگئے اتنے لال بیگ کے لوگ دیکھ دیکھ کر بدحواس ہوئے جاتے تھے۔روک تھام کے بہتری تدابیر کئے گئے مگر ان پر کچھ اثر نہ ہوا۔بالاخر بستی والوں نے شہر کے محکمہ صحت سے رجوع کیا۔ڈاکٹروں کی ٹیمیں پہنچیں ۔ادویات لائے گئے ،اسپرے اور چھڑکاؤں کا بندوبست کیا گیا۔۔۔۔ مگر یہ کیا؟ان ادویات سے تو پوری بستی کی فضاء مک در ہوگئ۔نہ کھانا کھانے کا مزا رہانہ پانی پینے کا۔ ہروقت کسی نہ کسی گیس کی بو اور ہر چیز میں کسی نہ کسی دوا کا اثر محسوس ہونے لگا"۔(۶۱)

ادویات کی چھڑکاؤں کے نتیجے میں انسان اور جانور بیمار ہوکر مرنے لگتے ہیں۔ پھر بستی پر بڑے بڑے چوہے یلغار کردیتے ہیں۔ بستی کی لوگ طرح طرح کی ادویات استعمال کرکے ان چوہوں کو ختم کرنے میں بھی ناکام ہوجاتے ہیں۔ان حالات میں لوگوں کا ردِ عمل ملاحضہ ہو:

"اب بستی والے بے حد خائف ہوگئے تھے۔انہوں نے اُپر تلے کے ان واقعات کوعذابِ الٰہی سے تعبیر کیا اور مسجدوں کا رُخ کیا۔بستی کی بڑی مسجد "مسجد تقویٰ" تھی۔امام صاحب نے حکم دیا کہ جمعہ کے روز تمام بستی والے مسجد کے بڑے میدان میں جمع ہوکر صدق دل سے توبہ استغفار کرے ۔پروگرام کے مطابق جمعہ کے روز تمام بستی مسجد کے بڑے صحن میں جمع ہوگئے"۔(۶۲)

مندرجہ بالا پیراگراف سے معاشرے میں مولوی کے اہمیت کا پتہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔کیوں کہ تمام لوگ اس کے کہنے پر ایک جگہ جمع ہوجاتے ہیں۔ مولوی صاحب بعد از نماز جمعہ تمام لوگوں کو مخاطب کرکے کہتے ہیں کہ یہ تمام

آفات سماوی قہر خداوندی ہیں۔ اسلئے دعا کے لیے کوئی مومن ممبر پر بیٹھنے کے لیے آجائے۔ جب لوگ حیران ہوتے ہیں تو مولانا صاحب فرماتے ہیں:

"بھائیوں! مومن وہ شخص ہے جس کے ہاتھ یا زبان سے کسی کو کوئی آزار نہ پہنچا ہو پوری دلی صداقتوں کے ساتھ اپنا محاصبہ کیجئے اور جو شخص اس معیار پر پورا اترتا ہو وہ ممبر پر دعا کے لیے آجائے" (۶۳)

کوئی بھی فرد اُٹھنے کے لیے تیار نہیں تھا کیوں کہ ہر فرد اپنے آپ کو اس کسوٹی پر پورا اُترنے میں ناکام ہے۔ پھر مولوی صاحب فرماتے ہیں:

"اگر بستی میں کوئی ایسا شخص موجود ہو جس نے ہمیشہ رزق، حلال کمایا اور رزق حلال کھایا ہو تو اس کی دعا بھی مستجاب ہو سکتی ہے"۔ (۶۴)

اب بھی تمام لوگ خاموش ہیں۔ تو مولوی صاحب بول پڑتے ہیں:

" آپ سوچتے ہوں گے میں خود کیوں دعا نہیں کرتا؟ میرا منشا آپ کو شرمندہ کرنا نہیں تھا۔ میں تو خود بھی شرمندہ ہوں۔ میں بھی تو آپ ہی مقتدیوں کا امام ہوں۔" (۶۵)

مولوی صاحب کا اتنا کھرا سچ بولنا یقیناً حق گو ہونے کی نشانی ہے۔ مولوی کا کردار نہ خوشامدی ہے اور نہ ریاکاری کا مادہ ان میں موجود ہے۔ برسرِ ممبر سچ بولنے کا ہنر جانتے ہیں۔ مسز منور رؤف کا یہ کردار بھی ایک مثالی کردار بن کر سامنے آتا ہے اور قاری کو جذباتی طور پر متاثر کرتا ہے۔ ڈاکٹر رختاج امین نے مذکورہ افسانہ کے حوالے سے اجمالی تذکرہ کچھ یوں کیا ہے:

"'فاعتبر وایا اولی الابصار" میں انسانی بداعمالیوں اور بد عنوانیوں سے پیدا ہونے والے معاشرتی عذاب کے حقیقت کو علامتی انداز میں پیش کیا ہے"۔ (۶۶)

پروفیسر منور روف کے باقی افسانوں کی بہ نسبت اس افسانے مین تجسس کا عنصر زیادہ ہے۔ لہٰذا ابتداء سے لے کر اختتام تک قاری واقعات و کیفیات کے جادو کا اسیر رہتا ہے۔ سارے واقعات نہایت تیزی کے ساتھ یکے بعد دیگرے وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ واقعات کی اسی تیزی، تسلسل اور روانی نے پلاٹ کو منطقی اور مربوط بنا دیا ہے جو مصنفہ کی کامیابی کی دلیل ہے۔ افسانہ یوں تو مکمل طور پر بیانیہ اسلوب میں لکھا گیا ہے لیکن ایک جگہ امام صاحب کے خطبے کی صورت میں مکالمہ نگاری بھی کی گئی ہے جو حد درجہ فطری اور فکر انگیز ہے۔ اس مختصر افسانے میں بیان کردہ وہ منظر اپنی نوعیت کے اعتبار سے بے مثال ہے جہاں مسجد کا امام نمازیوں کو خطبہ دیتے ہیں اور دعا کے لیے مواوں شخص کی خصوصیات بتاتے ہیں

۔یہ منظر پڑھ کر قاری اپنے آپ کو اس کا حصہ محسوس کرتا ہے اور نمازی جس احساس شرمندگی کا شکار ہوتے ہیں قاری بھی اسی حساس کا شکار ہو جاتا ہے۔بطور افسانہ نگار یہ منور صاحبہ کی کامیابی ہے کہ انھوں نے پڑھنے والے کو افسانے کے ماحول اور فضامیں ملوث کر دیا ہے۔مذکورہ افسانے اور اس کی مرکزی کردار پر سیر حاصل تبصرہ فرحانہ قاضی نے ان الفاظ میں کیاہے:

"افسانے کا واحد کردار مسجد کا امام ہے۔یہ ایسا حقیقی کردار ہے جو ہمارے معاشرے میں ہر جگہ موجود ہے۔اس کردار کے ذریعے مصنفہ نے یہ بتانے کی کعشش کی ہے کہ عوام ناس تو ایک طرف ،مذہبت رہنماء اور امام صاحبان بھی حقیقی معنوں میں مومن نہیں۔۔۔۔۔مگر دوسرت طرف ایک خوش آمیند بات سامنے آتی ہے کہ کم آز کم آج بھی ایسے لوگ موجود ہے جو سچ بول سکتے ہیں اور اپنی نااہلی کا اعتراف کرنے میں عار محسوس نہیں کرتے جیسا کہ امام صاحب نے اپنی نااہلی اور گناہگاری کا اقرار علی الاعلان کرتے ہیں"۔(٦٧)

الغرض ہم کہہ سکتے ہیں کہ منور رؤف نے اپنے افسانوں میں مولوی حضرات کو بطور موضوع پیش کر کے اظہار خیال کیاہے۔تاہم اس طبقے کے حوالے سے مذہبی اعتقاد اور عقیدت کا جذبہ زیادہ نمایا نظر آتا ہے۔جس سے افسانے کے فنی لوازمات کو نقصان پہنچاہے کیونکہ مقصدیت کا یوں چھلکنا فنی اعتبار سے خامی ہی تصور ہوتی ہے۔

مولوی صاحب کے کردار کو افسانہ "انصاف" میں بھی زیر بحث لایا گیاہے۔ڈاکٹر شیر زمان طائزئی نے معاشرے میں مولوی کے کردار کو واضح کیاہے۔کہ جس میں مولوی مظہر الحق ان لوگوں کو جو انگریزی تعلیم حاصل کر رہے ہیں بلکہ ان کے سات پشتوں کو بھی دوزخ کا ایندھن بننے کے تنبیہہ کر رہے ہیں۔افسانہ نگار یہ بھی بتاتا ہے کہ جو لوگ دوسروں کے بچوں کو جدید علوم سیکھنے سے روکتے اوران پر کفر کے فتوے لگاتے ہیں خود ان کی حالت کیاہے۔افسانے کے کردار رمضان قصائی کے ذریعے ایسے عناصر کی منافقت کا پردہ چاک کیا گیاہے۔اور جب رمضان قصائی مولوی کو یاد دلاتا ہے کہ خود ان کے بچے تو انگریزی سکولوں میں پڑھ رہے ہیں اور ہمیں منع کیا جارہاہیں یہ کونسا انصاف ہے۔بس یوں رمضان قصائی بھی مولوی کے زیر عتاب آگیا اور اگلے ہی دن مولوی مظہر الحق نے اس کو بھی مرتد قرار دے کر اس پر کفر کا فتویٰ لگا دیتاہے۔اس کے بعد چار ڈانگ بردار صوفی مشٹنڈے رمضان قصائی کے دکان پر بھیج دیتاہے۔اس واقعے کو افسانہ نگاریوں پیش کرتاہے:

''مولانا صاحب نے فتویٰ دیاہے کہ رمضان کافر ہے۔اور اس کے ہاتھ کا ذبیحہ چاروں مذاہب سے حرام ہے۔''(٦٨)

اس معاشرے میں ملا کا فتویٰ ہونے کی دیر ہوتی ہے باقی معاشرہ خود سمجھتا ہے کہ آگے کیا کرنا ہے۔اب مرتد رمضان سے لوگ گوشت لینا حرام سمجھتے ہیں۔رمضان کو معاشی طور پر بدحال کر کے بھی مولانا مظہر الحق کا غم وغصّہ ختم نہیں ہوتا۔ جب انگریزوں کے خلاف ایک جلسے میں شریک رمضان کو گولی سے مار کر ہلاک کیا جاتا ہے اوراس کا دوست مولوی مصلح الدین جیسے حق پرست عالم اور اس کے طلباء کو بھی دھر لیا جاتا ہے تو مولانا مظہر الحق رمضان جیسے نام نہاد مولوی کا رویہ انتہائی گھٹیا انداز میں سامنے آتا ہے۔اس موقع پر مظہر الحق کا ایک اور فتویٰ بھی سامنے آتا ہے۔یوں ملک و قوم کی خاطر جامِ شہادت نوش کرنے والے رمضان کو بغیر جنازہ کے دفن کر دیا جاتا ہے۔اس معاشرے کے نام نہاد مولویوں کی منافقت کو عیاں کرنے کے لیے افسانہ نگار ایک اور واقعہ بھی پیش کرتا ہے۔وہ یوں کہ مظہر الحق کا ایک بیٹا رشوت لیتے ہوئے گرفتار ہو جاتا ہے اور دوسرا بیٹا تعبیر الحق جو کہ عالم بھی ہے، اپنے بھائی کو چھڑوانے کی خاطر سفارش کرتا ہے۔رمضان قصائی کا بیٹا جدید تعلیم سے بہرہ ور ہو کر جج کے عہدہ پر فائز ہو چکا ہوتا ہے۔ تعبیر الحق اس کو جانتا تک نہیں لیکن اس کی باتوں سے جب رمضان کے بیٹے کو پتہ چل جاتا ہے کہ موصوف تو اس مولوی کا بیٹا ہے جس نے اس کے باپ کے ساتھ انتہائی زیادتی کی تھی تو اس موقع پر اس کا رویہ دکھاتے ہوئے افسانہ نگار لکھتا ہے:

> "رشوت کا یہ مقدمہ اگر ملزم تعبیر الحق کی مرضی پر کسی اور عدالت میں تبدیل کر دیا جائے تو بہتر ہو گا۔ کیونکہ میں ملزم کے خاندان سے ذاتی رنجش رکھتا ہوں۔ملزم کے باپ نے میرے والد پر کفر کا فتویٰ لگایا تھا۔اور بغیر جنازے کے دفن کیا تھا۔میں نہیں چاہتا کہ میں ذاتی عداوت کی بنا پر انصاف کی راہ سے بھٹک جاؤں اور کوئی غلط فیصلہ کر لوں۔"(۶۹)

پختونوں کی یہی مذہبی جنونیت یا مذہب سے گہری وابستگی ہی کا نتیجہ ہے جس نے ان کو توہمات میں مبتلا کر دیا ہیں۔اگرچہ ان کے عقائد و نظریات بالکل واضح ہیں۔لیکن اس کے باوجود بعض توہمات ان میں موجود ہیں چونکہ یہ توہمات صدیوں کا ایک تسلسل ہے اس لیے بعض توہمات ان کی سوچوں اور خیالوں میں موجود ہیں اور ان کی صداقت کو تسلیم نہ کرتے ہوئے بھی وہ غیر شعوری طور پر بعض باتوں کو کہہ جاتے ہیں اور بعض باتوں کو سچ سمجھ لیتے ہیں۔

ڈاکٹر پروین عظیم کے افسانہ "پاپی" میں ایک بچے کا کردار پیش کیا گیا ہے۔جس کا اصل نام گل محمد تھا، جسے سوتیلے باپ نے بگاڑ کر "گلو" بنا دیا تھا جبکہ اسکی ماں اسے "گل" کے نام سے پکارتی تھی، جبکہ خاندان والے اسے "منحوس" کہا کرتے تھے کہ بقول ان کے اپنی پیدائش کے ایک ماہ کے اندر وہ اپنے باپ کو کھا گیا،یوں اس کی ماں اس کی وجہ سے ایک سال کے اندر اندر بیوہ ہو گئی۔اسی طرح گل محمد کا یہی پاپ کہ اس کے پیدائش پر اس کا باپ مر گیا اس کی پوری زندگی کے لیے باعث تکلیف بن جاتا ہے۔اس افسانے میں افسانہ نگار پشتونوں کے اس توہم کو حدفِ تنقید بناتا ہے کہ کسی کے

پیدائش کا کسی دوسرے کے مرنے سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا بلکہ ہر شخص کی اپنی عمر لکھی ہوئی ہوتی ہے جسے پورا کر کے وہ دنیا سے چلا جاتا ہے اور جس کی رزق جب لکھی ہو تب اسے دنیا میں لا یا جاتا ہے۔ لیکن پشتون معاشرے میں بعض جگہوں پر اس قسم کے توہمات پائے جاتے ہیں جس کا ذکر اس افسانے میں کیا گیا ہے۔

”نام تو اس کا گل محمد تھا جسے باپ بگاڑ کر گلو کہتا۔ ماں پیار سے گل کہتی۔ خدا تعالیٰ یار اور خاندان والے منحوس کہا کرتے بقول ان کے اپنے پیدائش کے ایک ماہ کے اندر اپنے باپ کو کھا گیا۔“(۷۰)

پروین نے نام نہاد مولیوں کو اسلام کا لبادہ اڑھے اور ہر کسی پر کفر کا فتویٰ لگانے کی مذمت کی ہے۔ افسانے میں مولوی کے کردار کو واضح کیا گیا ہے۔ ان کے افسانے ماضی کی یادوں اور حال کے مشاہدے کا سنگم ہیں جن میں زندگی کی حقیقتوں کو بڑی سادگی لیکن فن کاری سے سمویا گیا ہے۔ ان کی تکنیک بیانیہ ہے۔ موضوعاتی لحاظ سے تو ان کے افسانوں میں تنوع ملتا ہے لیکن تکنیک کے جھمیلوں میں وہ نہیں پڑتیں۔ ایک راوی کی طرح کہانی بیان کر دیتی ہیں۔ خود بھی اکثر کہانی میں واحد متکلم کے طور پر موجود رہتی ہیں۔ ان کی اپنی شخصیت کے گہرے نقوش ان کی اکثر کہانیوں پر ثبت ہیں۔ پروین کہانی کے المیہ انجام سے کہانی کے تاثر کو دوچند بنا دیتی ہیں۔ افسانہ "پاپی" کا انجام طربیہ ہے لیکن یہاں بھی خوشی کو غم کی فضا بوجھل بنا دیتی ہے۔ یہاں غم کے بوجھ تلے دبا دبا طربیہ انجام دھیما سا احساس سکون ضرور فراہم کرتا ہے لیکن آنکھیں پرنم رہتی ہیں۔

مشرف مبشر نے اپنے افسانے ”روگ“ میں توہم پر مبنی ایسی نفسیاتی ماحول کا تذکرہ کیا ہے۔ گھٹن، تعصب، جبر و تشدد، نفسیاتی الجھن اور تنگ نظری پر مبنی اس معاشرے میں عورت ذات کی حیثیت ان کے ساتھ روا رکھا گیا ظالمانہ وغیر اخلاقی رویّہ تو چلو سسرال میں بہ امر مجبوری قابل برداشت ہے لیکن بابل کے یہاں بھی اس طرح کے سلوک و رویّے کا سامنا ہو تو مرنے کے سوا چارہ نہیں۔ افسانہ نگار نے ایک طلاق یافتہ عورت کی بیٹی کے زباں کہانی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ والد کے دوسری شادی کرنے پر ہم گھر کے بالائی منزل میں رہنے لگے لیکن والدہ کے طلاق پر ہم چاروناچار ننھیال منتقل ہو گئے ماموں نے بہت آؤ بھگت کی ہمارا اچھے طرح سے خیال رکھا لیکن میرا کلیجہ کٹ کے رہ گیا جب میری شادی پر اپنی اس ماں کو اکیلا چھوڑ رہی تھی جنھوں نے اپنے جوانی میرے لیے بتادی اور مجھے بن باپ کے پالا پوسا۔

"اس ماں کا درد سمجھنے وال اکوئی دل سوز نہ تھا جس نے اپنی جوانی کا رس نچوڑ کر ایک بن باپ کی بچی کو توانا اور مضبوط بنا دیا تھا مگر خود شاخ بریدہ اور برگ زرد کے مانند ایک بار پھر باد مخالف کے جھونکے سہنے کو تن تنہا ویران راہوں پر کھڑی تھی۔"(۷۱)

افسانہ نگار نے پشتون معاشرت کے اس المیاتی حقیقت کو اُجاگر کیا ہے کہ یہاں اگرچہ بہنوں بیٹیوں کو والدین کے گھر عزت و توقیر سے نوازا تو جاتا ہے لیکن اس ذہنیت کا کیا کیا جائے جو طلاق اور بیوگی کی نحوست گردانی پر مبنی ہے۔ اور ان کو بدبخت اور منحوس جانا جاتا ہے۔ افسانہ نگار مظلوم پشتون عورت کی المناک زندگی کو شعوری طور پر اپنا موضوع بنا کر نئی نسل میں ایک انقلابی رویہ پیدا کرنا چاہتی ہیں۔ ایسا انقلابی رویہ جو عورت کو مرد جیسی استحصالی قوت سے متصادم ہو کر اپنے بنیادی حقوق کے حصول کا حوصلہ بخشے تاکہ اس میں وہ بیداری پیدا ہو سکے جو اس جدید دور میں ہر خطے میں جنم لینے والی عورت کا بنیادی حق ہے۔ وہ بیمار معاشرے کی فرسودہ روایات کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے ایک نئے دور کی نوید سناتی ہیں جس میں عورت اپنی حیثیت منوالے گی جہاں نئے دور میں صحت مند اقدار پروان چڑھے گی جن کی روشنی میں انسانیت کش فرسودہ رسومات کے تاریک پہلو مٹ جائیں گے۔ عورت کو آزادی سے جینے کا حق دیا جائے گا۔

(ٹ)۔ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم:

خیبر پختونخوا میں تقسیم یا ملکیت جائیداد کی روایت ملک احمد یوسفزئی کے زمانے سے رواج پذیر ہو چکا ہے۔ اس کے وزیر اعظم شیخ ملی جو کہ ایک مذہبی شخصیت تھے نے اس تقسیم کا فارمولا طے کیا تھا۔ شیخ ملی کی تقسیم جائیداد کے تحت مرد و زن کو وراثت میں برابر کا حصہ دار ٹھرایا گیا تھا۔ لیکن پختون حسب عادت نہ تو شیخ ملی کی اور نا اسلام کی بتلائے ہوئے طریقوں پر عمل پیرا ہے۔ یہاں جائیداد کا وارث صرف بیٹا ہوتا ہے۔ بیٹیوں کی جائیداد کا حصہ دینا کمتر جانا جاتا ہے۔ روایتاً یہاں باپ کے بعد بیٹا وارث ہوتا ہے لیکن اگر کسی کی اولاد نرینہ نہ ہو تو پھر بیٹی وارث قرار دی جاتی ہے۔ جس کا حقیقتاً مالک اس کا شوہر ہوتا ہے۔ یہاں کے دیہی معاشرت میں جائیداد کی غیر منصفانہ اور غیر مساویانہ تقسیم کی وجہ سے معاشرتی اور معاشی پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ جس کی وجہ سے بہت سارے تنازعات نے جنم لیا ہے خصوصاً اس معاملے میں حکومتی رٹ نہ ہونے یا پھر اتنا ڈھیلا ہونے کے بنا تقسیم ملکیت کے دوران طاقتور کا قبضہ جمانا روایت بن چکا ہے۔ اس معاشرے میں ملکیت جائیداد کے حوالے سے کمزور یا عورت ذات کو اس کا حق ملنا نہایت مشکل بلکہ ناممکن حد تک جا چکا ہے۔ حق ملکیت کے حصول کے لیے سالوں کوٹ کچہری کے چکر کاٹنے یا پھر بزور بازو حصول کیلئے قتل مقاتلے تک تیا ہونا پڑتا ہے۔ اور بعض اوقات لوگ پہلے ہی آخر ذکر کے لیے اپنے آپ کو تیار کر لیتے ہیں۔ کیوں کہ کوٹ میں اگر آپ حق ملکیت جیت بھی جاتے ہیں تو قبضہ کے حصول کے لیے بالآخر ہاتھا پاتی اور جنگ و جدل کی نوبت آتی ہے۔

خیبر پختونخوا کے افسانہ نگاروں نے اس معاشرتی المیے کو اور اس کے نتیجے میں رونما ہونے والے واقعات کو اپنے افسانوں کی زینت بنایا ہے۔ اور اکثر لکھاریوں نے اصلاح معاشرہ کے لیے مسئلے کو اُجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ اس کا حل بھی بتلانے کی کوشش کی ہے۔ خیبر پختونخوا کے دیہی معاشرت میں زن، زر اور زمیں کی وجہ سے تنازعات عام سی بات

ہے۔طاہر آفریدی نے اسی تناظر میں افسانہ "دعائے مغفرت"میں اس مسلے کو اجاگر کیا ہے۔ افسانے میں میرو کا بوڑھاباپ بیمارپڑتاہے۔اس کارشتہ دار دلبر خان اس کی جائیداد ہتھیانے کی غرض سے اس کی تیمارداری کا بیڑا اُٹھاتاہے۔ آخر کارایک دن میرو کا باپ مر جاتاہے۔ دلبر خان اپنی غرض کو حاصل کرنے کے لیے اس کی ماں سے شادی رچالیتاہے۔ دلبر خان سے شادی کرنے کے بعد میرو کی ماں بھی جلد ہی موت کی آغوش میں چلی جاتی ہے۔ دلبر خان یتیم ولاوارث میرو کی جائیداد پر قبضہ جمانے کے لیے یہ بہانہ تراش لیتاہے۔ کہ اُس نے میرو کے باپ اور بعد میں اس کی ماں پر اتناپیسہ خرچ کیاہے کہ جائیداد تو کیا اگر میرو بھی ساری عمر مزدوری کر کے اس کا قرضہ بھرتاجائے تب بھی وہ اس کی خرچ کی ہوئی رقم کوواپس نہیں کر سکے گا۔ اگرچہ اصل صورتحال یہ ہے کہ دلبر خان میرو کے والدین کی بیماری پر جو پیسہ خرچ کرتاہے وہ میرو کے باپ کی کمائی ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ میرو کی ماں کی رسم قُل کے موقع پر ذبح کرنے والی بکریاں بھی میرو کے باپ ہی کی ہوتی ہیں۔ دلبر خان توپہلے ہی سے میرو کی جائیداد پر قابض ہونے کا منصوبہ بناچکاہے اور ہر قیمت پر اپنے منصوبے میں کامیاب ہوناچاہتاہے ۔وہ اس منصوبے میں کامیاب تو ہوجاتاہے اور میرو کی جائیداد پر قبضہ جماہی لیتاہے لیکن اس کو یہ خدشہ بھی لاحق ہوتاہے کہ بڑاہونے پر کہیں میرواس سے اپنی جائیدادواپس لینے کاتقاضانہ کردے۔اس خدشے کے پیشِ نظر وہ میرو کو ذہنی طور پر ٹارچر کرنے کی کوشش کرتاہے۔اس کے علاوہ معاشرے میں بھی اُسے سست، کاہل اور دیوانہ مشہور کر دیتاہے۔ وہ میرو کی شخصیت کو تباہ کرنے،اُسے کمزور، بزدل اور کم ہمت بنانے کے لیے نہ صرف اُسے مارتا پیٹتا بلکہ بات بات پر اُسے تمسخر کانشانہ بھی بناتارہتاہے۔یوں میرو کی شخصیت اتنی دبی اور کمزور رہ جاتی ہے۔ یہاں تک کہ بچوں کو پیچھے لگواکراس پر نعرے لگانے آوازیں کسنے اور چھیڑ چھاڑ کر تنگ کرنے کی منصوبہ بندی بھی کامیاب ہو کر رنگ لاتی ہے۔یوں اچھاخاصامیرو پاگل کہلانے لگتاہے اور دردر کی ٹھوکریں کھاکر پاگل ہو بھی جاتاہے۔ دماغی توازن کھودینے کے بعد میرو جائیداد کا کر تاہی کیا تھا جو اس کا اپنے سوتیلے باپ سے تقاضا بھی کرے۔اسی طرح وہ اپنی کمزوری کے سبب اپنی جائیداد کے ساتھ ساتھ اپنی سوچ اور فکر سے بھی محروم ہو جاتاہے۔

افسانہ ''سردار''میں افسانہ نگار زیتون بانو نے والد کے وفات کے بعد رضیہ کو چچا اور ان کے بیٹوں کے ہاتھوں تختہ مشق بنتے دکھایاہے ۔جہاں دلبر خان رضیہ اوراس کے بھائیوں کو جائیداد سے محروم کر کے اپنے اکلوتے بیٹے کو جاگیردار بنانے کے لیے معصوم جانوں پر کھیلتاہے۔رضیہ سے بھائیوں کی مفلسی نہیں دیکھی جاتی تو خود نرسنگ کی ٹریننگ کر کے اپنے گھر والوں کی دیکھ بھال کرنے کی خاطر نرس بن جاتی ہے۔وہ ایک معزز پیشہ سے جڑی ہے کہ آخری عمر میں دلبر خان کو بیماریاں گھیر لیتی ہیں۔ عیاش بیٹے کو بیمار باپ کی کیافکر رہی۔وہ لاوارثوں کے وارڈ میں ہسپتال میں پڑارہتاہے۔

رضیہ اس کو پہچان لیتی ہے اوراس کی خدمت گزاری کو اپنا فریضہ سمجھ کر ظالم پختون چچا کا بدلہ ایک تعلیم یافتہ اوررحم دل بھتیجی کی حیثیت سے دیتی ہے۔

"چچا ان سے انگوٹھا لگوا لیتا نئے نئے نوٹ ان کو گن دیتا اور ان کی خانی کو ہوا دیتا رہتا ایک روز رضیہ نے دبی زبان سے احتجاج کیا کی اس کا حصہ اس کو دیا جائے تو بھائیوں اور چچا نے اسے کھری کھری سنائیں اور کہا کہ پختون بہنیں بیٹیاں جائیداد کا نام نہیں لیتیں۔"(۷۲)

افسانہ نگار نے معاشرتی بے حسی اوررشتوں کے تقدس کو جائیداد ہتھیانے کے لیے پامال ہوتے دکھایا ہے۔قطعہ اراضی کے لیے خون سفید ہوتے دکھایا ہے۔اور خون کے رشتو کو ان کے عظمت و تقدس کو ملحوظ ہی نہیں رکھا جاتا۔خونی رشتوں کے درمیان عداوت، دشمنی اور نفرت کے سلسلے شروع ہو جاتے ہیں۔جو شیطان کی آنت کی طرح ختم نہیں ہوتے دراصل اسی معاشرے کے لوگ جائیداد کے لیے رشتے ناطے اور سارے بندھن توڑنے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔یہاں تک کے اس کے لیے مذہبی اصولوں کو بھی کسی خاطر میں نہیں لایا جاتا۔

زیتون بانو نے اپنے افسانے "کرم خوردہ ستون"میں اسی معاشرتی رویے کو اجاگر کیا ہے۔اس افسانے میں نور خان اور فضل داد کے درمیان جائیداد کا تنازعہ چل رہا ہے۔کئی باران دونوں کے درمیان اس سلسلے میں لڑائی جھگڑا بھی ہو جاتا ہے۔نور خان ایک دفعہ یہ کہ جاتا ہے کہ اگر وہ مقدمہ ہار گیا تو اپنی کلہاڑی سے فضل داد کے ٹکڑے کر دے گا۔ جب مقدمہ نور خان جیت جاتا ہے تو فضل داد کو نور خان والی بات یاد آجاتی ہے۔وہ سوچتا ہے کہ مقدمہ ہارنے کی صورت میں نور خان اس کو زندہ نہ چھوڑ دیتا اس لیے اُسے بھی اس قسم کا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔نور خان کا ذہن یک دم ایک خطرناک منصوبے کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔وہ اپنی سوچ کو عملی شکل دینے کے لیے منصوبہ بندی کرلیتا ہے۔ایک دن دریا کے کنارے وہ ایک اجنبی شکاری کو دیکھ لیتا ہے موقع کو غنیمت جان کر وہ اس بے گناہ شکاری کا گلا گھونٹ کر اُسے مار دیتا ہے۔شکاری کو مارنے کے بعد وہ اپنے کپڑے اور انگوٹھی اُسے پہنا دیتا ہے اوراس کی پاؤں سے بھاری پتھر باندھ کر اسے دریا میں ڈبو دیتا ہے۔شکاری کو قتل کرنے کے بعد وہ کہیں روپوش ہو جاتا ہے۔اس واقعہ کے چند دن بعد لاش کا سُراغ لگ جاتا ہے۔چونکہ لاش مسخ شدہ ہے اس لیے اس کی شناخت مشکل ہو جاتی ہے لیکن فضل داد کی بیوی شوہر کی انگوٹھی سے اندازہ لگا لیتی ہے کہ یہ تو اس کی شوہر کی لاش ہے۔۔جب معاملہ کورٹ میں جا پہنچتا ہے تو عدالت میں لوگ نور خان کے قول کو نظر میں رکھ کر نور خان پر قتل کی گواہی دیتے ہیں۔اسی طرح عدالت نور خان کو مجرم قرار دے دیتی ہے۔یوں ایک بے گناہ شخص تختہ دار پر چڑھ جاتا ہے۔

اس افسانے کا انداز اگرچہ غیر فطری ہے کیونکہ فضل داد کا شکاری کو مارنا پھر اس کے ساتھ اپنے کپڑوں کا تبادلہ کرنا اور فضل داد کی بیوی کا انگوٹھی سے اسے پہچان لینا یہ ساری باتیں حقیقت سے دور اور فلمی دنیا سے قریب لگتی ہیں پھر بھی اس افسانے سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ پشتون معاشرے میں جائیداد کے تنازعہ پر عداوت اور دشمنی کا رجحان موجود ہے۔اسی طرح معمولی باتوں کو انا اور پشتو کا مسئلہ بنا لیا جاتا ہے جس کے نتیجے میں ایک دوسرے کو جان سے بھی مار دیا جاتا ہے۔یہ واقعہ حقیقت سے اگر دور ہے تو ممکنات میں سے ضرور ہے۔اس کلچر کا پروردہ شخص زندگی کے کسی میدان میں بھی ہار ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ کھیل کود سے لے کر زندگی کے سنجیدہ اُمور تک میں پشتونوں کے اس رویے کو دیکھا جا سکتا ہے۔اس افسانے میں بھی پشتون کلچر کے اسی رویے کو پیش کیا گیا ہے۔پشتون معاشرے میں عرب کے زمانۂ جاہلیت کی طرح معمولی معمولی باتوں کو بھی غیرت، ناموس اور انا کا مسئلہ بنایا جاتا ہے۔اگر ایک پشتون کھیل تک میں بھی ہار جاتا ہے تو اسے اپنی توہین اور بے عزتی سمجھتا ہے چہ جائے کہ جائیداد کا مقدمہ ہار جائے اور خاموش رہے۔ایسے مواقع پر تو وحشیانہ پن کا مظاہرہ کر کے ہی ایک پشتون کی انا کو تسکین مل سکتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ فضل داد مقدمہ ہارتے ہوئے بھی اپنی شکست تسلیم کرنے اور قانون کا احترام کرنے کی بجائے ایک مکروہ منصوبہ سوچتا ہے۔اگرچہ نور خان نے اس پر قاتلانہ حملہ تو نہیں کیا تھا بلکہ صرف ایک بات کہی تھی کہ مقدمہ ہارنے کی صورت میں اُسے زندہ نہیں چھوڑے گا لیکن اس کے ذہن میں نور خان کی وہی بات گھوم رہی ہوتی ہے اس لیے فضل داد نے بھی یہ سوچا کہ کوئی ایسی تدبیر کی جائے کہ اس کا دشمن بھی مارا جائے اور وہ خود زندہ بھی رہے۔اسی طرح اس نے یہ منصوبہ بنا لیا اور کامیاب ہو گیا۔

اس افسانے کا ''منظور'' نہ صرف اپنے گھرانے کو پالتا پوستا ہے بلکہ اپنے بھائیوں کی شادیوں کی ذمہ داری بھی سر انجام دیتا ہے۔وہ کھیت کھلیانوں میں محنت اور مشقت کر کر کے اپنے گھر کے تمام افراد کا پیٹ پالتا ہے۔ایک دن جب وہ اپنے کھیتوں کی سبزیاں منڈی لے جانیکا پروگرام بناتا ہے تو راستے میں سیلاب آ جاتا ہے۔اس کی زندگی سیلاب کے ریلے کی نذر ہو جاتی ہے۔شوہر کی موت پر اس کی بیوی صابرہ صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے آنسو پی جاتی ہے۔وہ اس خدشے کے پیشِ نظر آنکھوں سے آنسوؤں کو گرنے تک نہیں دیتی کہ اس کے دیور اور سسر کو صدمہ پہنچے گا۔وہ بجائے رونے دھونے کے اپنے سسر کو اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتی ہے اور اپنا گھر بار سنبھالنے کی بھی فکر کرتی ہے۔جب تک صابرہ کا سُسر زندہ رہتا ہے اُس وقت تک اُسے گھریلو زندگی میں کسی مصیبت کا سامنا نہیں ہوتا۔لیکن اس کے سُسر ''غفور'' کے ساتھ بھی زندگی وفا نہیں کر پاتی وہ بھی جلد ہی انتقال کر جاتا ہے۔غفور کے انتقال کے بعد صابرہ کا باپ اپنی بیٹی کو اپنے گھر لے جانے کے لیے آتا ہے۔دیوروں کی مخالفت کی بنا پر صابرہ باپ کے ساتھ جانا مناسب نہیں سمجھتی۔یوں صابرہ اپنے دیوروں کے ساتھ رہنے لگتی ہے۔جس طرح پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ پشتون معاشرے میں نہ صرف یہ کہ عورت

کو جائیداد میں حصّہ نہیں دیا جاتا بلکہ چچا جب دیکھتا ہے کہ اس بھتیجے چھوٹے ہیں تو ان کی عمر کی کمزوری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے انہیں جائیداد سے محروم کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ صابرہ کے دیوروں کی ذہنیت بھی اس وقت آشکارا ہو جاتی ہے جب اس کا بیٹا سلیم گاؤں کے سکول سے فارغ ہو کر ہائی سکول میں داخلہ لینے کے لیے شہر جانے لگتا ہے۔ اس موقع پر اس کے چچا اس کی مخالفت شروع کر دیتے ہیں۔ صابرہ کے دیور نہ صرف سلیم کو مزید تعلیم حاصل کرنے سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ سلیم سے کھیتوں میں جا کر اپنے ساتھ کام کرنے کا تقاضا بھی کرنے لگتے ہیں۔ وہ سلیم سے کہتے ہیں کہ اس کے باپ کے اتنے بڑے خزانے نہیں جس سے وہ اپنی تعلیم مکمل کر لے۔ صابرہ اگرچہ اپنے دیوروں کے رویے سے پریشان تو ہو جاتی ہے لیکن اُسے اتنا اطمینان ضرور ہوتا ہے کہ سلیم کو اپنے باپ کی جائیداد میں سے اتنا حصّہ تو ملے گا جس سے سلیم کی تعلیم کا خرچ پورا ہو سکے۔ جب اس سلسلے میں وہ زبان پر سلیم کی تعلیم کا نام تک لاتی ہے تو سارے گھر میں ایک بھونچال سا آ جاتا ہے اور گھر کے سب افراد یک زبان ہو کر کہتے ہیں:

> "سلیم کا باپ چونکہ اپنے باپ کی زندگی میں مرا ہے اس لیے جائیداد میں اس کا کوئی حصّہ نہیں اور نہ ہی اس کے باپ نے اپنی زندگی میں کوئی چیز وصیت میں لکھی ہے۔ یہ تو ہماری مہربانی ہے جو تم اور تمہارے بچے اس گھر میں رہتے ہیں اور ہماری دولت پر مزے کرتے ہیں۔"(۷۳)

ماں جیسی بھابی اور اس کے بیٹے کے ساتھ شوہر کے مرنے کے بعد دیور کیا سلوک کرتے ہیں اس افسانے سے پشتون معاشرے کے اسی رخ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ پشتون معاشرے میں جب شوہر کے گھر کا دروازہ کسی کے اوپر بند ہو جاتا ہے تو اس کا ایک ہی سہارا باقی بچتا ہے اور وہ ہے اس کے باپ کا گھر۔ صابرہ کو جب اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کے دیوروں کی آنکھیں بدل گئی ہیں، اب اس کے لیے اس گھر میں جینا محال ہو گیا ہے اور اسے اپنے بیٹے کا مستقبل بھی تاریک دکھائی دینے لگتا ہے تو وہ بیٹے کو لے کر اپنے باپ کے گھر جانے کا قصد کر لیتی ہے۔ باپ کے ہوتے ہوئے وہ کچھ دن سکون اور اطمینان سے گزار تو لیتی ہے۔ لیکن باپ کے مرنے کے بعد اس کے بھائی اور بھاوج کی نظریں بھی بدل جاتی ہیں۔ وہ بات بات پر غصّہ ہوتے ہیں۔ بھائی اور بھاوج کی نظروں سے غیض وغضب کے آثار جھلکنے لگتے ہیں۔ وہ اسے تنگ کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ بھائی اور بھاوج کے اس سلوک اور رویے کے پیشِ نظر اب صابرہ کو اپنے بھائی سے باپ کی جائیداد میں سے اپنا حصّہ لینے کا تقاضا کر لینا چاہیے تھا لیکن وہ پشتون کلچر سے واقف ہے۔ اسے یہ اندازہ ہے کہ پشتون معاشرے میں تو جائیداد کے لیے بھائی بھائی کا گلہ گھونٹتا ہے۔ بہن کے تو ہونٹ سلے ہوتے ہیں۔ بھائی سے اپنا حصّہ جائیداد لینے کا مطالبہ یا ایسی بات کو زبان پر لانا تو بڑی بات ہے اسے تو ایسا سوچنا بھی نہیں چاہیے۔ اگرچہ صابرہ اپنے بھائی اور بھاوج کی نیت کو بھانپ تو لیتی ہے لیکن بجائے احتجاج کرنے یا اپنا حق مانگنے کے اپنی زبان سی لیتی ہے۔ اس کی بھلائی اس

بات میں ہے کہ بھائی اور بھاوج کے ہر سلوک کو برداشت کرے، ہر ظلم کو سہہ لے اور بھائی بھاوج کی ناروابات کا بھی خندہ پیشانی سے جواب دے۔

خیبر پختونخوا کے دیہی علاقہ جات میں بہن یا بیٹی کو جائیداد میں حصّہ نہ دینا ایک رواج اور دستور بن گیا ہے۔ لیکن بعض مواقع اور حالات ایسے بھی ہوتے ہیں کہ کہیں بہن یا بیٹی کو جائیداد میں سے حصّہ دیا جاتا ہے۔ پشتونوں میں خان خوانین کے طبقے میں اکثر یہ رواج پایا جاتا ہے کہ وہ اپنی بہن یا بیٹی کو جائیداد میں تھوڑا بہت حصّہ دے بھی دیتے ہیں۔ اسی طرح جب کسی کی اولادِ نرینہ نہ ہو تو وہ بھی اکثر اپنی بیٹی کو حصّہ دیتا ہے۔ لیکن جس طرح پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ اس معاشرے کا عام دستور یہ ہے کہ عورت کو حصّہ نہیں دیا جاتا۔ عورت کو جائیداد میں حصّہ نہ دینے کا دستور اس معاشرے میں اس طرح راسخ ہو چکا ہے کہ بعض اوقات جب کوئی شخص اپنی بہن یا بیٹی کو جائیداد میں حصّہ دے دیتا ہے تو شادی کے بعد اس کا شوہر اس کی جائیداد کو اپنے نام منتقل کرا دیتا ہے۔ اس موقع پر ایک لڑکی یا عورت کچھ کہہ بھی نہیں پاتی کیونکہ اگر وہ کچھ کہتی ہے تو اس کو مختلف قسم کی دھمکیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان دھمکیوں میں سب سے زیادہ خطرناک دھمکی طلاق دینے کی ہے جبکہ پشتون عورت سب کچھ برداشت تو کر سکتی ہے لیکن اس کے لیے طلاق کا لفظ سننا موت کے مترادف ہوتا ہے۔ چونکہ اس معاشرے میں عورت کی حیثیت بہت کمزور ہے اس لیے اُسے خاموش رہ کر اپنے شوہر کی ہر بات مان لینی پڑتی ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب شوہر اپنی بیوی کی جائیداد ہڑپ کر لیتا ہے تو پھر بیوی کو خیال میں بھی نہیں لاتا۔

افسانہ "چلیچی" میں رشتوں کی پامالی اور یتیم بچوں کی حق ملکیت ہڑپ کرنے کا بیان ہے۔ افسانے میں جب مہتابہ کا باپ مر جاتا ہے تو اس کے تربور (چچیرے) اس کی جائیداد پر قابض ہو جاتے ہیں۔ مہتابہ جائیداد سے محروم تو ہو جاتی ہے لیکن اس کی ماں ہمت نہیں ہارتی اور اپنی بیٹی کو تعلیم دلواتی ہے یہاں تک کہ مہتابہ ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کر لیتی ہے۔ ڈاکٹر بننے کے بعد اس کے لیے ڈاکٹر حنیف کا رشتہ آتا ہے۔ ان دنوں اس کے لیے ایک وکیل کا رشتہ بھی آتا ہے جو کہ دو بچوں کا باپ ہوتا ہے۔ مہتابہ کی ماں اس کی شادی بجائے ڈاکٹر حنیف کے وکیل کے ساتھ اس لیے کرانا چاہتی ہے کہ اس کے ذریعے وہ اپنی جائیداد کو اپنے شوہر کے میراث خوروں یعنی وارثوں سے واپس لے سکے گی۔ جب مہتابہ اپنی ماں سے مذاق میں کہتی ہے کہ گویا تم میرا سودا کرنا چاہتی ہو۔ تو اس کی ماں کہتی ہے کہ وہ غیرت کر رہی ہے کیونکہ اس نے قسم کھائی ہے کہ وہ اپنے شوہر کے تربوروں (چچیروں) سے اپنے شوہر کی جائیداد لے کر رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ڈاکٹر حنیف کی بجائے اس کی شادی وکیل سے کرانے کا ارادہ کر لیتی ہے۔

زیتون بانو نے افسانہ ''ایک آنے کا بیٹا'' میں پشتون معاشرت میں حق ملکیت اور تقسیم جائیداد کے تنازعے کو موضوع بنایا ہے۔ جہاں قمر گل کا والد اس کے بچپن ہی میں وفات پا جاتا ہے۔ اس کا چچا قمر گل کے والدہ اے نکاح پڑھواتا ہے اور یوں اس کی جائیداد اپنے نام کر لیتا ہے۔ خوشگوار مستقبل کی آس لگائی قمر گل کی ماں کو اس وقت شدید صدمہ پہنچتا ہے جب اس کا دوسرا شوہر قمر گل کو مارنے پر تل جاتا ہے۔ وہ قمر گل کے کردار کی زبانی پشتون ثقافت میں جائیداد کے حصول کا سفاکانہ رویہ سامنے لاتے ہوئے کہتی ہے:

"اچانک میری آنکھ کھل گئی تو دیکھا کہ میرا خاوند قمر گل کا گلا گھونٹ رہا ہے۔ میں نے ایک چیخ ماری اور وہ بھاگ نکلا۔ قمر گل بچ گیا لیکن اب اس کی زندگی خطرے میں تھی۔ چنانچہ ایک رات میں اُسے سینے سے لگائے پشاور بھاگ آئی۔ اس وقت قمر گل ڈیڑھ سال کا تھا۔ "(۷۴)

پشاور آ کر قمر گل کی ماں کو تنگدستی، اِفلاس اور بھوک کا سامنا ہوتا ہے۔ اُسے خود اپنی نہیں بلکہ اپنے بیٹے قمر گل کی فکر لاحق ہوتی ہے۔ چونکہ وہ آسودہ حال زندگی گزار چکی ہے اس لیے بیٹے کو بھوکا پیاسا اور ننگا دیکھ کر اُس کا دل دکھتا ہے۔ وہ ہر حال میں اپنے بیٹے کو آسودہ دیکھنا چاہتی ہے اس لیے وہ بیٹے کو ایک آنے کے عوض ایک بے اولاد جوڑے کے ہاتھوں بیچ ڈالتی ہے۔ قمر گل کی ماں پہلے سے یہ شرط عائد کر چکی ہے کہ وہ ہر دوسرے دن بیٹے کو دیکھنے آیا کرے گی۔ بیٹے کو حوالہ کرنے کے بعد اگلے دن وہ بے قرار ہو جاتی ہے۔ جب وہ اپنے لختِ جگر کو دیکھنے آتی ہے تو وہ لوگ قمر گل کو ساتھ لے کر غائب ہو چکے ہوتےہیں۔ قمر گل کی ماں دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر بھاگتی پھرتی ہے۔ محلے کے لوگوں سے پوچھنے پر اُسے یہ پتہ بھی چل جاتا ہے کہ وہ لوگ اجنبی تھے اور چند دنوں سے اس مکان میں کرایہ دار کی حیثیت سے رہائش پذیر تھے۔ یوں قمر گل شوہر کے مرنے کے بعد اپنے ہی دیوروں کے ہاتھوں نہ صرف جائیداد سے محروم ہو جاتی ہے بلکہ اُسے بیٹے سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔

افسانہ ''اپنے بھید دل ہی جانے'' میں بھی آمنہ کے والدین کے مرنے کے بعد اس کی عمر چالیس سال تک پہنچ جاتی ہے لیکن اس کی شادی نہیں کرائی جاتی۔ جب اس کے بھائیوں کی اپنی بیٹیاں جوان ہونے لگتی ہیں اور انہیں اس بات کی فکر ہونے لگتی ہے تب انہیں خیال آتا ہے کہ لوگ کہیں گے کہ بہن کو تو گھر میں بٹھا کر بوڑھا کر دیا اور بیٹیوں کو وقت پر بیاہ دیا اس لیے وہ آمنہ کے لیے بر ڈھونڈنے لگتے ہیں۔ ظاہر بات ہے جب عورت عمر کی اس حد تک پہنچ جائے تو اُس کے لیے موزوں رشتہ آنا مشکل ہو جاتا ہے۔ آمنہ کے بھائی اب کسی صورت اپنی بہن کو بیاہنا چاہتے ہیں اس لیے وہ ایک ادھیڑ عمر کے مجید نامی کلرک سے اس کی شادی کرا دیتے ہیں۔ آمنہ کے کہنے کے مطابق اس کی بھابیوں نے اس کی شادی بھی سادگی سے کرا کے خرچہ نہ ہونے دیا اور بھائیوں نے یہ کہہ کر کہ ان کے کاروبار میں آج کل گھاٹا ہو رہا ہے اس لیے

جہیز بھی برائے نام ہی دیا۔ شادی کے ایک تقریب میں مسز درانی سے اس کی ملاقات ہوتی ہے چونکہ وہ اچھا لباس پہننے کی عادی ہوتی ہے اور اس وقت بھی اچھے کپڑوں میں ملبوس ہوتی ہے اس لیے مسز درانی اس سے بہت متاثر ہو جاتی ہے۔ آمنہ کی فطرت میں سادگی اور سچائی ہوتی ہے وہ مسز درانی کو اپنی دکھ بھری کہانی سنا دیتی ہے۔ تو وہ منہ پھاڑے اس کی کہانی کو حیرت سے سن رہی ہوتی ہے اور آخر میں اُسے ٹوکتے ہوئے بولتی ہے:

"باپ کی جائیداد میں تمہارا حق ہے۔۔۔ تم بھائیوں سے اپنا حق لے سکتی تھیں۔'' وہ تلخ مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر بولی۔ یہاں بیٹیوں کو کون حقوق دیتا ہے۔ اور میں ویسی بہن بھی نہیں کہ بھائیوں کے خلاف عدالتوں میں جاؤں۔"(۷۵)

آمنہ کی باتوں سے ظاہر ہے کہ قبائلی علاقوں سے ہٹ کر وہ علاقے جہاں حکومت بھی ہے اور عدالتیں بھی وہاں بھی عورتوں میں عدالت جانے کی جرأت نہیں ہوتی۔ اسی لیے تو ان کو جائیداد سے محروم رکھا جاتا ہے۔ اسی طرح آمنہ جیسی شریف عورت اگر ایک طرف عدالتوں کے چکر کاٹنے اور بدنامی کے خوف سے عدالت کا دروازہ نہیں کھٹکھٹاتی تو دوسری طرف اپنے سگے بھائیوں کا احترام بھی ملحوظ ہے۔ جبکہ بھائیوں کا بہنوں سے رویہ معاشرتی اخلاقی پسماندگی کی دلیل ہے۔ اس معاشرے میں ہمیشہ بہنوں سے غیر مساویانہ اور غیر منصفانہ رویہ رکھا جاتا ہے۔ اور ہمیشہ ان کی حق تلفی ہوتی ہے۔

شمیم کے افسانوں کے کردار عجیب و غریب ضرور ہیں لیکن مابعد الطبیعات نہیں۔ اسی دنیا کے جیتے جاگتے زندگی کے ہاتھوں مارے ہوئے لوگ ہیں جنھیں حادثات زمانہ کہیں سے کہیں پہنچا دیتے ہیں۔ زندگی سے مایوس یہ کردار فلسفیانہ نقطہ نظر کے حامل ہیں لیکن ان کا فلسفہ بعض اوقات کہانی کو خشک اور بے رنگ کر دیتا ہے۔ بحثوں اور اکتا دینے والی تمہیدوں سے کہانی میں الجھاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ یوں کہانی کی تاثراتی فضا بھی متاثر ہو جاتی ہے جبکہ رہی سہی کسر طوالت پوری کر دیتی ہے۔ افسانہ نگار نے اپنے افسانوں میں ماحول کی تصویر کشی میں قدرتی مناظر کی دل کشی اور خوبصورتی سے واقعات و حالات کے اندوہناک کرب کو کم کر کے کہانی کی فضا کو معتدل بنانے کی بھرپور کوشش کی ہیں۔

(ث)۔ عورت کا مقام:

پختونوں کی تاریخ بہادری، مردانگی اور پدر شاہی پر مبنی ایک طویل سلسلہ ہے۔ یہاں پشتون ولی سے جڑے روایات پر عمل اور پاسداری جز ایمان گردانا جاتا ہے۔ خاص قبائلی روایات پر اگر نظر دوڑائی جائے تو اس معاشرت میں عصری تعلیم کو حصول کی غیر ضروری جانا جاتا ہے۔ یہاں انسانیت، برداشت اور درگزر کو بزدلی اور بے غیرتی سے تشبیہ دی جاتی ہے اور اس کے برعکس جبر، انتقام، دہشت کو غیرت گردانا جاتا ہے۔ انہی روایات کے بنا اس معاشرت میں

عورت ذات سے جڑے معاشرے کی ہر قسم حصہ داری سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ بھائی کو بہن پر فوقیت حاصل ہے اور اس معاشرے میں عورت مرد کے اجازت کے بغیر کوئی بھی قدم نہیں اُٹھا سکتی اور اس سے رو گردانی غداری اور قابل سزا جرم گردانا جاتا ہے۔ معاشرے میں عورت ذات کی حیثیت اور قدر و منزلت کی وجوہات میں یہاں کے نیم مذہبی ملاؤں کا کردار بھی رہا ہے۔ جنہوں نے ہر اس آیت وحدیث کی اپنی رو سے تشریح کی جو یہاں کی ذہنی پسماندگی اور باسیوں کی زن بیزاری کا سبب بنا۔ جبکہ مذہب کی رو سے عورت ذات کا معاشرتی مقام، مثبت کردار، اور جائز حقوق پر مبنی احکامات و روایات کو نظروں سے او جھل رہنے دیا۔

پشتون معاشرت میں کم درجہ پانے اور حق و انصاف نہ ملنے کی باوجود پختون عورت زندگی کے ہر موڑ پر مرد کی شانہ بشانہ رہی ہے۔ کھیتی باڑی سے لیکر میدان کارزار تک انھوں نے اپنے مردوں کا ساتھ دیا ہے۔ دگر گوں حالات کے باوجود یہاں کی عورت ڈٹ کر کھری ہے اور روایت کی پاسداری کرتی نظر آتی ہے۔ یہاں کے افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں پشتونولی پر کاربند جبکہ بعض کو اس سے بغاوت کرتے دکھایا ہے۔ عورت ذات کے حوالے سے یہاں کے افسانہ نگاروں نے معاشرے کے محاسن و مصائب کو واضح کر کے اصلاح کی کوشش کی ہے۔

منور رؤف کے افسانوں میں پشتون معاشرے کی عورت کی جیتی جاگتی زندگی ملتی ہے۔ اس کے افسانہ ''درونہ پختون'' میں پلوشہ کا کردار پیش کرتے ہوئے وہ واضح کرنا چاہتی ہے کہ اس معاشرے میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو قربانی اور ایثار کا مجسمہ ہوتے ہیں۔ جب ان کے ساتھ احسان کیا جاتا ہے تو وہ بھی سراپا ایثار بن جاتے ہیں۔ پلوشہ بھی اسی ذہنیت کی لڑکی ہے۔ جب اُسے پتہ چل جاتا ہے کہ بہادر نے اس کے باپ کی جان بخشی کی ہے تو وہ اپنے خاندانی دشمن بہادر کے اعلیٰ کردار سے متاثر ہو کر اس کے ساتھ شادی کا اعلان کرتی ہے۔ اسے بھی بہادر جیسے شخص سے محبت ہوتی ہے جو معاشرے میں امن کا باعث ہو۔ بہادر تو اپنے دشمن کو معاف کر کے صرف دشمنی کا خاتمہ کرتا ہے لیکن پلوشہ جو قدم اُٹھاتی ہے اس سے دونوں خاندان باہم شیر و شکر ہو جاتے ہیں۔

منور رؤف کے افسانہ ''انمول ہیرے'' کی الماس کا کردار پشتون معاشرے کی عورتوں کی نیک دلی، شرافت اور ایثار کی ترجمانی کرتا ہے۔ الماس کی پانچ بہنیں ہیں اور باپ مر چکا ہے۔ الماس بہنوں میں سب سے بڑی ہے۔ یہ جوان ہے اور اسے اعلیٰ تعلیم کے حصول کا شوق ہے۔ پشتون معاشرے کی اکثر لڑکیوں کی طرح یہ بھی بہت حساس ہے۔ باپ اور بھائی کی غیر موجودگی نے اس کی حساسیت میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ الماس اور اس کی ماں محنت مشقت کر کے اپنا گھر سنبھالتی ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس معاشرے میں بے سہارا لوگوں کو سہارا نہیں دیا جاتا بلکہ کمزور اور بے سہارا شخص کو درخور اعتنا نہیں سمجھا جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کو نظر انداز کر کے کوئی چوکتا بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ الماس

کے محلے والے ان سے کسی قسم کا خوف محسوس نہیں کرتے اور آتے جاتے ان پر آوازیں تک کستے ہیں۔ الماس کو لوگوں کے ذو معنی جملوں پر غصہ بھی آتا ہے اور یہ پیچ در پیچ باتیں سننے سے اُسے دکھ بھی ہوتا ہے۔ لیکن وہ حالات سے مقابلہ کرنے کی سکت رکھتی ہے مگر جیسا کہ پشتون معاشرے کی ریت ہے کہ عورت ہی قربانی کی سولی پر لٹکائی جاتی ہے بلکہ بسا اوقات عورت خود برضا و رغبت قربانی دینے کے لیے تیار ہوتی ہے۔ الماس کو بھی اس صورت حال سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ اگرچہ الماس کا یہ عزم ہے کہ وہ شادی کرنے کی بجائے اپنے گھرانے کا سہارا بنے گی لیکن وہ اپنی ماں اور بہنوں کی خاطر شادی کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے:

> ''میں اپنی پیاری امی کے سکون کی خاطر اپنی بہنوں کی تحفظ کی خاطر یہ قربانی ضرور دوں گی۔ وہ ایک عزم کے ساتھ اُٹھی۔ اُس نے اپنا فیصلہ پھوپھی اماں کو سنایا۔'' (۷۶)

مرد کے بغیر اس معاشرے میں جینا کتنا مشکل ہے اور عورت ذات کے لیے تن تنہا اس سماج کا مقابلہ کرنا کتنا کٹھن ہے افسانہ نگار نے ان مصائب و تکالیف اور پھر اس سے چھٹکارہ پانا مرد کی سایہ عافیت ہی تجویز کیا ہے۔ کہ اس سماج میں مردوں کی حکمرانی ہے اس میں اپنا حصہ بنانے کے لیے یا تو ایک طویل اور صبر آزما جدوجہد درکار ہے یا پھر ہار مان کر مرد کی حکمرانی کو خندہ پیشانی کے ساتھ تسلیم کرنا چاہئے۔ اس افسانے کے ذریعے مصنفہ نے عورت کی فطری نیک دلی ،شرافت اور ایثار کی عکاسی کی ہے کہ مشرقی عورت اپنے سے متعلق لوگوں کے لیے اپنی خواہشات کی قربانی دیتی ہے اور یہی اس کی معراج ہے اور اسی لیے یہ عورت انمول ہیرے کی حیثیت رکھتی ہے۔ قدرت نے اس کی فطرت میں ہیرے کی سی چمک دمک اور نور رکھا ہے۔ افسانے میں مصنفہ نے ہماری توجہ اس فکر انگیز پہلو کی طرف بھی دلائی ہے کہ مرد ہی عورت کی درپے ہے اور مرد ہی اس کی عزت کا رکھوالا ہے۔ عورت مرد سے پناہ حاصل کرنے کے لیے مرد ہی کی پناہ میں جاتی ہے۔ یہ طرفہ تماشا نہیں تو کیا ہے۔

خیبر پختونخوا کے دیہی علاقہ جات میں طرح طرح کے رویے ملتے ہیں۔ بعض علاقوں میں عورتوں سے امور خانہ داری کو نمٹانے کے علاوہ کوئی اور کام جیسے کھیتی باڑی، مویشی چرانے میں مدد لینا پشتونولی کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ اس قسم کا پشتون ولی کا مثبت رویہ رکھنے والے لوگ امیر ہوں یا غریب عورتوں کا چار دیواری سے باہر کام کرنے کو معیوب سمجھتے ہیں۔ مثبت رویہ رکھنے والے لوگ خود بوجھ برداشت کر لیتے ہیں لیکن عورتوں پر بوجھ ڈالنا مناسب نہیں سمجھتے جبکہ اکثر پہاڑی علاقوں کے لوگ امیر ہوں یا غریب ان کی عورتیں ان کے ساتھ ہر قسم کا بوجھ اٹھانے میں چار و ناچار ہاتھ بٹاتی ہیں۔ وہ اپنے مردوں کو سہولت دینے کے لیے ان کے ساتھ کھیتوں میں مصروف کام کرتی ہیں، جانوروں کو پالنا انہی کا کام ہوتا ہے اور امور خانہ داری کو بجا لانا بھی ان کے سُپرد ہوتا ہے۔

طاہر آفریدی کے افسانہ ''متاعِ جاں''میں پشتونوں کی دیہاتی زندگی کے اسی رُخ کو پیش کیا گیا ہے۔اس افسانے میں نوری کے ہاتھ میں درانتی ہوتی ہے۔ وہ اپنے خاندان کے دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر فصل بھی کاٹتی ہے جس سے اس کے نرم ونازک ہاتھ محنت طلب کام کر کے سخت اور کھردرے ہو جاتے ہیں۔

"نوری درانتی زمین پر پھینک کر یوں غیر ارادی طور پر اُٹھ گئی۔ جیسے کوئی اہم بات یا کوئی خاص کام یاد آ گیا ہو۔ کمر سیدھی کرتے ہوئی ایک لمبی انگڑائی لی اور چاروں طرف نظر گھما کر اُونچے اونچے پہاڑوں کو دیکھنے لگی۔"(۷۷)

یہاں کے دیہی علاقوں میں عورتوں کا گھر کے کام کاج کے علاوہ، کھیتی باڑی کے کام،اور جانور پالنے اور سنبھالنے ان کے لیے کھیتوں، پہاڑوں سے چارہ لانے تک کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اور ایسی ہی ذمہ دار خواتین کو معاشرے میں قدرو منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ افسانہ نگار نے اپنے کئی افسانوں میں ایسے خوبصورت وخوبرو دوشیزاؤں کو کھیتوں، پہاڑوں اور چراگاہوں میں درانتی تھامے بھیڑ بکریاں چراتے اور چارہ کاٹتے دکھائے ہیں۔ افسانہ "پگڑی" کی گلنار بھی اسی قسم کی ایک محنت کش دیہاتی لڑکی ہے۔

''سردیوں کے لیے بارش شروع ہونے سے پہلے ہی پورا گاؤں جلانے کی خشک لکڑیااور مویشیوں کے لیے خشک چارہ جمع کرلیتا۔ گلنار اور اس کی ماں نے بھی دور پہاڑوں سے گھاس اور لکڑی کاٹ کر جمع کر رکھی تھی۔''(۷۸)

افسانہ نگار نے یہاں کے دیہی معاشرت میں عورت ذات کی بیچارگی اور اس پر ہونے والے مظالم کو آشکار کیا ہے۔ یہاں کے خواتین بناؤ سنگھار کے بجائے امور خانہ داری نمٹانے اور دوسرے کاموں میں دن بھر جتے رہتی ہیں۔ یہاں زندگی بہت سخت اور کٹھن ہوتی ہے۔ گھر کے کاموں کے علاوہ یہ خواتین مردوں کے ساتھ کھیتی باڑی اور فصل سنبھالنے میں بھی مدد کرتی ہیں۔ طاہر اپنی کہانیوں میں انسان کے اندر چھپے ہوئے حیوان کو ادمیت کی راہ دکھاتے ہیں ۔گلنار کے اندر کی چھپی ہوئی غیرت مند عورت کو بیدار کرنے کے لیے وہ خشک واعظانہ انداز اختیار نہیں کرتے نا ہی لمبی چوڑی اخلاقی بحثوں میں پڑتے ہیں بلکہ ماحول کے نقوش اس انداز سے ابھارتے ہیں کہ کردار کو اپنی لغزش کا احساس بڑی جلدی ہو جاتا ہے۔ گلنار افضل کے ساتھ گھر سے زیور اور کپڑے لے کر نکل آتی ہے۔ راستے بھر اسے ایک مرتبہ بھی واپس لوٹنے کا خیال نہیں آتا۔ اچانک ایک پتھر سے ٹھوکر کھا کر وہ جوش سے ہوش کی دنیا میں آجاتی ہے اور واپس گھر جانے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ قدموں کی لڑکھڑاہٹ اسے اخلاقی لغزش کا احساس دلا دیتی ہے اور وہ افضل سے ہاتھ چھڑا کر

دیوانہ وار گھر کی طرف بھاگنے لگتی ہے۔طاہر نے شاذ و نادر کہیں اگر فلسفیانہ پیرائیہ اظہار اپنایا بھی ہے تو دلچسپی سے خالی نہیں۔

افسانہ "زندہ دکھ" میں قجیرے ببو کا شوہر بیمار ہونے کے سبب کام کاج سے قاصر ہوتا ہے۔یون قجیرے ببو گھر کے کاموں کے ساتھ ساتھ روزی روٹی کمانے اور شوہر کے علاج کا بندوبست کرنے کی ذمہ داری بھی اُٹھاتی ہے۔افسانہ نگار نے دہرے مصیبت میں مبتلا اپنے اس کردار کو معاشرے میں کردار نبھاتے دکھایا ہے۔جوانسال منہا کی ماں قجیرے ببو کی مردانہ وار زندگی کی عکاسی افسانے میں بھرپور انداز میں کی گئی ہے۔

"اس کی ماں گوبر اکٹھا کرتی اور اُپلے تھاپتی ،اور پھر یہ اُپلے سمندر کلال کے ہاتھوں بیچ دیتی،وہ ان اُپلوں میں سے کچھ ایندھن کے طور پر استعمال کرتا اور باقی میں برتن پکاتا۔وہ ان اُپلوں کی رقم کچھ برتن پکنے سے پہلے ادا کر دیتا اور کچھ برتن پک جانے کے بعد ادا کر دینے کا وعدہ کرتا، منہا کی ماں یہ رقم وصول کرتی اور انہیں دو حصوں میں تقسیم کر دیتی، آدھے پیسے گھر بار کی ضرورتوں پر اٹھ جاتے اور نصف رقم وہ منہا کے حوالے کر دیتی تاکہ وہ زمین میں دفن ہانڈیاں میں رکھ دے۔آخر شادی غم، بیماری، انسان کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ لیکن شادی سے پہلے پہلے دمے کا مریض منہا کا بوڑھا باپ مر گیا۔ منہا کی ماں قجیرے ببو نے اس کے کفن دفن کا انتظام ایسے مثالی انداز میں کیا کہ لوگوں نے اس پر تعریف و تحسین کے ڈونگرے برسائے۔"(۷۹)

قجیرے ببو صرف اسی بات پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ جب اس کی بیٹی جوان ہو جاتی ہے تو وہ اپنی محنت مشقت کے بل پر اپنی بیٹی کی شادی اور اُس پر اُٹھنے والے اخراجات کے لیے بھی رقم بچا کر جمع کرتی جاتی ہے۔اگر چہ اس معاشرے میں ”ولور“ کی رسم موجود ہے جس کے تحت بیٹی کے بیاہ میں دینے کی بجائے اُلٹا اُسے پیسے لینے پڑیں گے لیکن وہ پشتون کلچر کی اس روایت کی پاسداری نہیں کرتی بلکہ پشتون کلچر کی اصل روح کے مطابق شادی پر آنے والے باراتیوں کے کھانے پینے کا انتظام اپنے پلّے سے کر لیتی ہے۔

"زندہ دکھ" زیتون بانو کے فکری سلسلے کی کڑی ہے یہ افسانہ ایک ایسے معاشرتی دکھ کا اظہار ہے جو نسل در نسل سفر کرتا ہم تک پہنچتا ہے۔کردار مخصوص پشتو معاشرے کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں روایتی دشمنی ان کے ذہنی رجحان اور رویے کی سمت متعین کرتی ہے۔بنیادی طور پر یہ افسانہ نئے اور پرانے معاشرے کے ٹکراؤ کا افسانہ ہے کہ پہلے قاتل سے انتقام نہ لینا بزدلی سمجھا جاتا تھا مگر آج باپ کے قاتل کو مارنا بزدلی کی علامت بنتا ہے۔یہ ایک خوب صورت افسانہ ہے جو سادہ اسلوب اور خوب صورت تحریر میں ہمارے سامنے موجود ہے اور زیتون بانو کے فکری زاویوں اور مخصوص انداز کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔

افسانہ "کوڑھ" میں عورت کی معاشرتی حیثیت اور مرد کی عدم برداشت کو پیش کیا گیا ہے۔ کہ کس طرح میاں بیوی کے معمولی تکرار طلاق کی نوبت اختیار کر گئی۔ اور اپنے انانیت سے مجبور مرد عورت ذات کی معمولی زبان درازی کو برداشت نہ کر سکا۔

"مگر میں تمھارا شوہر ہوں

شوہر کس جانور کو کہتے ہیں۔۔۔ وہ تلملا کر کھڑا ہو گیا۔ تم۔ تم

میں نے کہا۔۔۔ ''اکیلی عورت کو دیکھ کر رعب جمارہے ہو۔ چلو نکلو یہاں سے '' پتہ نہیں یہ جملہ کس طرح میرے ہونٹوں سے پھسل پڑا۔ رفیع جانتا تھا کہ یہ جملہ میں ٹریفک کے سپاہی کے لیے اکثر اس وقت استعمال کرتی ہوں جب کار غلط جگہ پارک کرنے پر وہ آکر مجھے ٹوکتا ہے۔ اس لیے شاید اس نے میرے اس جملے کا بہت برا مانا کیونکہ دوسرے دن طلاق نامے میں اس نے لکھا تھا میں شوہر بن کر رہنا چاہتا ہوں۔ جانور یا ٹریفک کا سپاہی نہیں۔ بھئی حد ہو گئی ہے بد مذاقی کی۔۔ بیوی کو ماما، دھوبن، خادمہ، کنیز، لونڈی، پیر کی جوتی جو چاہیں بنائیں خود ذرا سا جانور یا ٹریفک کا سپاہی بھی نہیں بن سکتے۔ توبہ استغفر اللہ۔"(۸۰)

اسی طرح ایک دوسرے پر جان چھڑکنے والے میاں بیوی کے درمیان معمولی تکرار ان کی عمر بھر کی رفاقت کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ اس افسانے میں افسانہ نگار سماجی رویوں پر گہرا طنز کرتی ہے۔ اگر افسانے کے عنوان پر غور کیا جائے تو یہ عنوان بجائے خود ایک گہری معنویت کا حامل ہے۔ مشرقی معاشرے میں عموماً اور پشتون معاشرے میں خصوصاً طلاق یافتہ عورت کا حال کوڑھ کے مریض جیسا ہوتا ہے۔ جس طرح کوڑھی کو اس کے مرض کی وجہ سے متروک اور مردود کر دیا جاتا ہے اور تنہائی اس کا مقدر بن جاتی ہے اسی طرح طلاق یافتہ عورت بھی بھرے معاشرے میں تنہا رہ جاتی ہے۔ اس معاشرے کی عورت میں بھی بدلتے ہوئے معاشرتی رویوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ وہ خود ہی آہستہ آہستہ احساس کمتری کا شکار ہو کر زندگی کے ہنگاموں سے دور رہ کر تنہائی کا زہر پیتی ہے۔ اس کی ویران اور یاس بھری تنہا زندگی کسی کوڑھی کی اذیت ناک تنہائی سے کم تکلیف دہ نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس افسانے کے کردار ''میں'' کو جب طلاق دی جاتی ہے تو وہ اپنا انتقام معاشرے سے لیتی ہے۔ وہ معاشرے میں کسی بھی شخص کو آسودہ حال اور خوش حال نہیں دیکھ سکتی۔ وہ ہر وقت اور ہر جگہ ہر شخص سے انتقام کا سوچتی ہے۔ وہ اپنے دفاع کے لیے انتقامی کارروائیوں پر اُتر آتی ہے اور اپنی محرومی کا بدلہ پورے معاشرے سے لینا چاہتی ہے۔ کبھی بحیثیت لکچرار اپنی طالبات سے بدلہ لیتی ہے، کبھی پرنسپل کی حیثیت سے اپنی ماتحت ملازماؤں سے اور کبھی شاہانہ کا گھر برباد کر کے اپنی انا کو تسکین پہنچاتی ہے۔

حنا کا افسانہ "کوڑھ" سماجی رویوں پر گہرا طنز ہے۔ افسانے کا عنوان "کوڑھ' ایک گہری معیویت لیے ہوئے ہے۔ مشرقی معاشرے میں طلاق یافتہ عورت کا حال کوڑھ کے مریض جیسا ہوتا ہے۔ جس طرح کوڑھی کو اس کے مرض کی وجہ سے متروداور مردود کر دیا جاتا ہے اور تنہائی اس کا مقدر بن جاتی ہے اسی طرح طلاق یافتہ عورت بھی بھرے معاشرے میں تنہا رہ جاتی ہے۔ بدلتی ہوئی معاشرتی رویوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ اس میں نہیں ہوتا۔ اس کی ویران اور یاس بھری زندگی کسی کوڑھی کی اذیت ناک تنہائی سے کم تکلیف دہ نہیں ہوتی۔

سیدہ حنا کے افسانوں کی گہری نفسیاتی بصیرت انھیں اردو افسانہ نگاری میں ایک نمایاں مقام دلاتی ہے۔ کرداروں کی گفتگو بڑی بے ساختہ اور نفسیاتی ارتعاش کی حامل ہوتی ہے۔ وہ صرف واقعات و اعمال کو ہی پیش نہیں کرتیں بلکہ کردار کا نفسیاتی جائزہ بھی پیش کرتی ہیں اور ان واقعات و اعمال کو بروئے کار لانے میں نفسیاتی عوامل کا بھی احاطہ کرتی ہیں۔ انھون نے اپنے افسانون مین انوکھی تکنیک استعمال کی ہے۔ کبھی ایک لفظ کے گرد کہانی کا تانا بانا تیار کرتی ہے۔ وہ ایک لفظ اگر حذف کر لیا جائے تو کہانی بے جان اور بے اثر ہو جاتی ہے۔

افسانہ "صوالئے" میں مرد کی روایتی ہٹ دھرمی اور عورت کی بیچارگی کو پیش کیا گیا ہے۔ اس معاشرے میں ایسی و یماب صفت اور حوصلہ مند خواتین بھی پائی جاتی ہین جو کہ ہر حال میں شوہر کو اپنا دیوتا اور سر کا سایہ گردانتی ہے۔ شوہر چاہے کتنا ظالم جابر اور سفاک کیوں نہ ہو وہ ہر حال میں اس کی پرستش کرتی ہے۔ زیتون بانو کی اس افسانے میں ایک ایسی ہی صفات رکھنے والی خاتون کا ذکر ہے۔

> "خاوند نام خدا کا ہے اور خدا بڑا حاکم ہے اور خاوند گھر کا بھی حاکم ہوتا ہے لیکن صوالئے کا خاوند سچ مچ کا حاکم ہے اور صوالئے اس کی اصل محکوم - محنت مزدوری اس بے چارے سے ہوتی نہیں، جانے وہ پیدائشی نکھٹّو ہے یا کہ وہ یونہی تیار خور ہے یا پھر اپنی بیوی کی محنت مزدوری اور دوسرے کا پانی بھر بھر کر رنگ کے سوختہ ہو جانے کو دیکھ محنت مزدوری سے پہلو تہی کرتا ہے کہ کہیں اس کا گورا چٹا رنگ بھی اس کی بیوی جیسا نہ ہو جائے- ویسے تو بقولِ صوالئے آسمان سر پر اُٹھا لے لیکن نصیب خراب ہے کہ اچھی نوکری ہاتھ نہیں آتی اور مزدوری کرتے ہوئے "شرم" آتی ہے- اور اگر میں کبھی صوالئے سے کہدوں کہ "یہ اس کے لیے شرم کی بات نہیں کہ بیوی کی کمائی کھاتا ہے"؟ تو وہ مسکرا کر کہتی ہے۔ کوئی بات نہیں بانو جان- خدا اُسے تندرست رکھے، باقی دیکھا جائے گا- تین ارواح ہی تو ہیں۔ ان کا پیٹ بھرتی رہوں گی۔ باقی سب کچھ خدا کے ہاتھ میں ہے۔" (۸۱)

اسی طرح وہ محنت مشقت کرتی ہے اور اپنے بچوں سمیت اس نکھٹّو کے لیے دانا پانی کا بندبست بھی کرتی ہے۔وہ اکثر افسانہ نگار کے ہاں آجایا کرتی ہے۔ایک دن وہ افسانہ نگار کو ہنسی خوشی یہ پیغام بھی دیتی ہے کہ اس کا شوہر فرید خان دوسری شادی کرنا چاہتا ہے۔اس بات پر افسانہ نگار تعجب کا اظہار کرتی ہے کہ صوالئے بجائے غمزدہ ہونے کے خوش وخرم نظر آتی ہے لیکن صوالئے سے اس کی خوشی کی کیفیت پوچھنے کے بعد اس کو اندازہ ہوجاتا ہے کہ وہ اس لیے خوش ہوتی ہے کہ گھر کا بوجھ آدھا ہوجائے گا۔اپنے بچوں کے لیے وہ کما کر لائے گی اور شوہر کے لیے اس کی سوکن کو بھی کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔آخر وہ دن بھی آتا ہے کہ فرید سچ مچ ایک بیوہ سے شادی کرلیتا ہے۔اس کی دوسری بیوی کے ساتھ اس کے خاوند یا خاوندوں کے چار بچے بھی ہوتے ہیں۔جب فرید کی دوسری بیوی گھر آتی ہے تو وہ صوالئیے سے کہتا ہے:

"تین باتیں ہیں -سات راستے تمہارے سامنے ہیں- سات راستوں پر جاتی ہو؟ کہ اس کی نوکرانی بننا قبول ہے۔یا تمہیں مار ڈالوں؟ لیکن طلاق اس لیے نہیں دیتا کہ ''پختون''ہوں۔(۸۲)

صوالئے ان تین باتوں میں سے موت کو قبول کرلیتی ہے۔فرید آؤ دیکھے نہ تاؤ۔تیشہ اُٹھاتا ہے اور اس کے سر پر دے مارتا ہے۔وہ سر کے بل گر پڑتی ہے تو سوکن اسے فرید کے اگلے وار سے بچا لیتی ہے۔وہ صوالئے کو گھر سے چلے جانے کا مشورہ دیتی ہے۔اسی طرح صوالئے افسانہ نگار کے ہاں آتی ہے اور اس کی ماں اس کی مرہم پٹی کرکے اس کو تسلی اور حوصلہ دیتی ہے۔ صوالئے کو جب قرار سا آجاتا ہے تو وہ افسانہ نگار کے گھر سے نکل جاتی ہے۔اس مرحلے پر افسانہ نگار کہتی ہے کہ صوالئے چونکہ محنت کش عورت ہے اس لیے اس کے بچے بھوکے تو نہیں رہیں گے لیکن اس کے علاوہ بھی تو زندگی کی بہت ساری ضروریات سے نبرد آزما ہونا ہے جن میں سب سے بڑی ضرورت سر کا سایہ ہے۔اس لیے افسانہ نگار کو سب سے زیادہ اس کے سر کے سائے کی فکر ہوتی ہے۔وہ اس سوچ میں گم رہتی ہے کہ اس کے گھر سے نکلنے کے بعد اس نے کہاں پناہ لی ہوگی؟ اس افسانے میں پشتون معاشرے کے ایسے کاہل اور بارِ زمین مرد افراد کے رویے کو پیش کیا گیا ہے جو بیویوں کے ساتھ جانوروں سا سلوک روا رکھتے ہیں اور بجائے اس کے کہ ان کی ضروریات زندگی کو خود پورا کریں وہ اُلٹا عورتوں کی کمائی پر زندگی گزارتے ہیں۔

افسانہ "صوالئے" نچلے طبقے کی مظلوم عورت کی کہانی ہے۔جو اپنی ذات پر کیئے گئے نظالم سے پوری طرح اگاہ بھی نہیں وہ تو بس وفا کرنا جانتی ہے۔یہ محنت کش عورت بے روزگار خاوند کو کھلانے کے ساتھ ساتھ بچوں کا پیٹ بھی دوسروں کے گھر مزدوری کرکے پالتی ہے۔صوالئے اگرچہ ان پڑھ گنوار عورت ہے لیکن احساسات سے عاری نہیں۔کوئی بھی ذی شعور عورت اپنے خاوند کے ساتھ دوسری عورت کو برداشت نہیں کرسکتی یہی حال صوالئے کا بھی ہے۔سائرہ ہاشمی زیتون بانو کے اس کردار کے بارے میں رقمطراز ہیں:

"""صوالئے "پگلی کے ہیروئن سے زیادہ طاقت ور اور مظبوط ہے کیونکہ محنت نے اسے زندگی کے راہ پر چلنے کی ہمت عطا کی ہے۔ لیکن "پگلی "توازل کی کمزور عورت تھی جو غموں کی برداشت کی قوت نہیں رکھتی اور احساس کی شدت سے حواس کھو بیٹھتی ہے۔"

افسانہ "خاموش نگاہیں "میں افسانہ نگار رحیم گل نے پشتون معاشرے کے رسم "ولور" کے تحت بیٹی کی فروخت اور جانور کی طرح قیمت لگاتے دکھایا ہے۔ اس افسانے میں ولی خان اور اس کے ماموں کی بیٹی مہرجان ایک دوسرے سے شدید محبت رکھتے ہیں۔ ولی خان یتیم ویسیر ہونے کی وجہ سے اپنے ماموں کے پاس رہتا ہے۔ جب وہ بڑا ہو جاتا ہے تو اپنے ماموں سے اس کی لڑکی کا رشتہ مانگتا ہے۔ اس کا ماموں اُسے رشتہ دینے میں کوئی تامل نہیں کرتا لیکن اس رشتے میں پشتون معاشرے کی روایات آڑے آتی ہیں۔ پشتون معاشرے میں ''ولور'' کی رسم کے تحت بیٹی کے بیاہ کے عوض معاوضہ دیا اور لیا جاتا ہے۔ اگر کوئی لڑکی معاوضہ دیئے بغیر کسی کے نکاح میں دے دی جاتی ہے تو یہ بات لڑکی کے خاندان کے لیے سبکی کا باعث ہوتی ہے اس لیے ولی خان کا ماموں اس سے صاف صاف کہتا ہے:

> "ولی خان میری مرحوم بہن کی آخری نشانی ہے۔ یہ رشتہ ولی خان سے نہیں ہوگا تو اور کس سے ہوگا۔ یہ دونوں ابھی ماؤں کی گود ہی میں تھے کہ مرحوم بہن نے ہنستے ہنستے مہرو کی منگنی کر دی تھی لیکن میں چاہتا ہوں کہ ولی خان جو اب جوان ہو چکا ہے، اپنے پاؤں پر خود کھڑا ہو جائے۔ دو ہزار تو مجھے مہروؔ کے عوض لینے ہی پڑیں گے۔ اس سے کم لوں تو ناک کٹ جائے گی۔ تربوروں اور برادری میں کس کی لڑکی ہے جس کی قیمت دو ہزار سے کم پڑی ہو!"(۸۳)

ولی خان ماموں کی بات سن کر خوش ہو جاتا ہے لیکن اب اسے یہ فکر لاحق ہو جاتی ہے کہ اتنے پیسے وہ کہاں سے لا کر دے گا۔ پشتونوں کے قبائلی علاقوں کی زمین زیادہ تر بنجر ہے اور یہاں صنعتیں بھی نہیں ہوتیں جہاں محنت مزدوری کی جا سکے۔ قیامِ پاکستان سے پہلے قبائلی علاقے کے لوگوں کو پیسہ کمانے کے لیے مجبوراً کراچی اور بمبئی جیسے دور دراز کے شہروں میں جانا پڑتا تھا۔ ولی خان کو بھی اپنے ماموں کو''ولور'' کے پیسے دینے کے لیے اپنے ہم وطنوں کے ساتھ بمبئی جانا پڑا۔ وہاں جا کر اس کے ہم وطن پٹھان اس کے لیے بمبئی فلم انڈسٹری میں چالیس روپے ماہوار کی نوکری ڈھونڈ لیتے ہیں۔ ولی خان بمبئی میں چار سال اور دو مہینوں کی طویل مشقت کے بعد کچھ اوپر دو ہزار روپے بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ انڈسٹری کا مالک اُسے رخصت کرتے ہوئے بطورِ انعام بھی کچھ رقم دے دیتا ہے۔ طویل مسافت طے کرتے ہوئے وہ پشاور سے ہوتا ہوا اپنے گاؤں پہنچ آتا ہے۔ ماموں کے گھر پہنچتے ہی اُسے پتہ چل جاتا ہے کہ مہرجان کی شادی کے تو دو مہینے ہو چکے ہیں۔ جب ولی خان اپنے ماموں سے استفسار کرتا ہے تو اس کے ماموں کا کہنا یہ ہوتا ہے:

''جوان بیٹی کب تک بیٹھی رہتی۔ سمندر خان نے ڈھائی ہزار نقد کی پیشکش کی۔ کوئی کم رقم نہ تھی، سودا طے ہو گیا۔ آج کل ڈھائی ہزار لینا کچھ کم فخر کی بات نہیں ہے بیٹا!''(۸۴)

پشتون معاشرے میں بد قسمتی سے ایسے رسوم و رواج پنپ چکے ہیں کہ جس کو اب معیوب نہیں بلکہ باعث افتخار جانا جاتا ہے۔ اسی میں ایک رسم "ولور" بھی ہے کہ جس کے تحت جتنی زیادہ رقم لڑکی کے رشتے کی عوض وصول کی جائے اتنی سسرال جا کر ان کی عزت ہوتی ہے۔ افسانہ نگار نے کمال مہارت کے ساتھ اس معاشرے میں اس رسم قبیح کو سرائیت کرتے دکھایا ہے۔

رحیم گل کے افسانے اپنے ماحول اور معاشرت کے گہرے تجربے اور مشاہدے کا نچوڑ ہیں۔ کمال فن کاری سے معمولی جزئیات کو قاری پر آشکار کرتے ہیں جو کہ ان کی عبور فن کا ثبوت ہے۔ پشتون معاشرے میں رواج پذیر فرسودہ رسومات و غلط عقائد کو کی مصوری ان کے ہاں بڑی مہارت سے کی گئی ہے۔ وہ مقامی مسائل اور انسانی دکھوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بناتے ہیں۔ معاشرت ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے زندگی کے چند پہلوؤں کو پیش کرتے ہیں۔ فنی لحاظ سے بھی ان کی کہانیاں معیاری ہیں۔

حوالہ جات

۱. اردو انسائکلوپیڈیا، فیروز سنز، کراچی، ۱۹۸۴ء، ص:۳۶۱

۲. فارغ بخاری، (پیش لفظ)، اٹک کے اُس پار، فارغ بخاری / رضا ہمدانی (مرتبین)، گوشۂ ادب، لاہور، ۱۹۵۴ء، ص:۸

۳. سید مظہر گیلانی، بدنصیب سارہ، اردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۴۶ء، ص:۴۰

۴. رضا ہمدانی، غوبل (افسانہ) مشمولہ: اٹک کے اس پار، رضا ہمدانی / فارغ بخاری (مرتبین)، گوشۂ ادب، لاہور، ۱۹۵۴ء، ص:۲۸۴

۵. اورنگ زیب، صوبہ سرحد کے کسان اور سیاسی تحریکات (مضمون) مشمولہ: اٹک کے اُس پار، از فارغ بخاری / رضا ہمدانی (مرتبین)، گوشۂ ادب، لاہور، ۱۹۵۴ء، ص:۲۳۰

۶. سحر یوسفزئی، آگ اور سائے، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، ۱۹۶۷ء، ص:۱۹۵۔۱۹۶

۷. سحر یوسفزئی، سبزہ اور چنار، ص:۱۹۷

۸. فہمیدہ اختر، کشمالہ، یونیورسٹی بُک ایجنسی، خیبر بازار، پشاور، ۱۹۶۱ء، ص:۱۴

۹. مراد شنواری، پشتو افسانے، مترجمہ رضا ہمدانی، نیا مکتبہ، پشاور، ۱۹۴۱ء، ص:۳۵

۱۰. طاہر آفریدی، دیدن، بختیار اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۲ء، ص:۱۳۳

۱۱. طاہر آفریدی، دیدن، بختیار اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۲ء، ص:۱۴۳

۱۲. محمد رفیق، طاہر آفریدی شخصیت اور فنِ، (غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم اے) شعبہ اردو، جامعہ پشاور، ۲۰۰۸ء ء ص:۷۷

۱۳. مشرف ربانی، پاکیزہ، پشاور، جولائی، ۱۹۸۰ء، ص:۹۰

۱۴. طاہر آفریدی، دیدن، بختیار اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۲ء، ص:۱۴۳

۱۵. انور خواجہ، بوزنے بندر، شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور، ۱۹۸۲ء، ص:۴۹۔۵۰

۱۶. انور خواجہ، ناشناس، مکتبہ ارژنگ، یونیورسٹی روڈ، پشاور، ۱۹۹۱ء، ص:۵۳

۱۷. ایضاً، ص:۷۵

۱۸. ثاقب، معصوم شاہ، سید، ٹوٹی کہاں کمند، مستجاب پبلیکیشنز، کوہاٹ، ۱۹۸۸ء، ص:۳۲

۱۹. یوسفزئی، اعجاز احمد، پختون سماج، فیض الاسلام پرنٹنگ پریس، راولپنڈی، اکتوبر، ۲۰۱۵ء، ص:۴۱

۲۰. احمد پراچہ، سوتی جاگتی کلیاں، ادارۂ ادب وسائنس، کوہاٹ، ۱۹۸۵ء، ص:۳۴

۲۱. زیتون بانو، زندہ دکھ، مترجمہ مشتاق شباب، مقبول اکیڈمی، انار کلی، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص:۲۰۷

۲۲. سائرہ ہاشمی، (مضمون)، زیتون بانو شخصیت اور فن، از احمد پراچہ، مکتبہ ارژنگ، پشاور، ۱۹۸۱ء، ص:۱۲۳

۲۳. اباسین یوسفزئی، زیتون بانو شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات، پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص:۶۷۔۷۷

۲۴. سیّدہ حسینہ گل، ، پشتو زبان کے بہترین افسانے، مترجمہ علی کمیل قزلباش، کلاسک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص:۵۴

۲۵. محمد نواز خان، ڈاکٹر، ایک ہی کہانی، القلم پبلی کیشنز، صدر بازار ہری پور، اگست ۲۰۰۲ء، ص:۳۱

۲۶. سحر یوسفزئی، آگ اور سائے، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، باراوّل:۱۹۶۷ء، ص:۱۷۶

۲۷. سحر یوسفزئی، آگ اور سائے، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، باراوّل:۱۹۶۷ء، ص:۱۲۵

۲۸. فہمیدہ اختر، اپنے دیس میں، یونیورسٹی بک ایجنسی، پشاور، باراوّل، ۱۹۶۱ء، ص:۱۴۴

۲۹. منور روف، طرفہ تماشا، ایم جے بکس انٹر نیشنل، پشاور صدر، ۱۹۷۴ء، ص:۱۹۶

۳۰. رختاج امین، ڈاکٹر، (مضمون)، منور روف شخصیت کے آئینے میں، از احمد پراچہ، یونیورسٹی بک ایجنسی، خیبر بازار، پشاور، اگست، ۲۰۰۳ء، ص:۱۰۶

۳۱. طاہر آفریدی، دیدن، بختیار اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۲ء، ص:۵۹

۳۲. طاہر آفریدی، دیدن، بختیار اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۲ء، ص:۷۷

۳۳. ایضاً، آیئنہ چہرہ، ص:۱۵

۳۴. ایضاً، برف پہاڑوں کا آدمی، ص:۱۹

۳۵. سید معصوم شاہ ثاقب، ٹوٹی کہاں کمند، مستجاب پبلیکیشنز، کوہاٹ، ۱۹۸۸ء، ص:۱۳

۳۶. عبدالکافی ادیب، بگڑے چہرے، یونیورسٹی بک ایجنسی، پشاور، ۱۹۶۲ء، ص:۱۲۳

۳۷. کاچو خیل، محمد جمیل، نوحۂ بے نام، پشتو ادبی ٹولنہ، الہ ڈھنڈ ڈھیری، ملاکنڈ، ۲۰۱۱ء، ص:۱۱۱

۳۸. مظہر گیلانی، ، بدنصیب سارہ، اردو اکیڈمی، لاہور، س ن، ص:۶۱

۳۹. منور روف، انمول رتن، ایم جے بکس انٹر نیشنل، پشاور صدر، ۱۹۷۴ء، ص:۱۷۸

۴۰. منور روف، انمول رتن، ایم جے بکس انٹر نیشنل، پشاور صدر، ۱۹۷۴ء، ص:۱۸۱

۴۱. فیروزہ بخاری، سچ کا زہر، ادارہ علم وفن، پشاور، ۱۹۸۰ء، ص:۱۰۷

۴۲.	انور خواجہ، بوزنے بندر، شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور، ۱۹۸۲ء، ص:۴۹۔۵۰

۴۳.	احمد پراچہ، سوتی جاگتی کلیاں، ادارۂ ادب و سائنس، کوہاٹ، ۱۹۸۵ء، ص:۵۷

۴۴.	وحیدہ فرحت، گونگا کلچر، م ن، پ ن، اشاعت اوّل:۱۹۹۷ء، ص:۵۸

۴۵.	غزالہ نگاراورکزئی، حلقہ تیری زنجیر کا، (افسانہ)، مطبوعہ: خواتین ڈائجسٹ، جنوری ۱۹۸۸ء، ص:۹۱

۴۶.	عبدالقادر، مولانا (مقدمہ)، پٹھان، مترجمہ سید محبوب علی، پشتو اکیڈمی پشاور، ۱۹۶۷ء، ص:۲۹

۴۷.	قتیل شفائی، خوبانیاں، (افسانہ)، اٹک کے اس پار، فارغ بخاری / رضا ہمدانی (مرتبین)، گوشہ ادب، لاہور ، ۱۹۵۴ء، ص:۲۷۲

۴۸.	ایضاً، اٹک کے اس پار، از فارغ بخاری / رضا ہمدانی (مرتبین)، ص:۲۷۵

۴۹.	ایضاً، اٹک کے اس پار، از فارغ بخاری / رضا ہمدانی (مرتبین)، ص:۲۷۷

۵۰.	غنی خان، پور، (افسانہ) مشمولہ: اٹک کے اس پار، فارغ بخاری / رضا ہمدانی (مرتبین)، مترجمہ عبدالودود قمر، گوشہ ادب، لاہور، ۱۹۵۴ء، ص:۱۹۹

۵۱.	رضا ہمدانی، غوبل، (افسانہ) مشمولہ: اٹک کے اس پار، فارغ بخاری / رضا ہمدانی (مرتبین)، گوشہ ادب، لاہور ، ۱۹۵۴ء، ص:۲۸۷

۵۲.	سحر یوسفزئی، آگ اور سائے، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، باراوّل :۱۹۶۷ء، ص:۴۱

۵۳.	ایضاً، آگ اور سائے، ص:۴۷

۵۴.	مراد شنواری، ، پشتو افسانے، مترجمہ رضا ہمدانی، نیا مکتبہ، پشاور، ۱۹۴۱ء، ص:۳۳۔۳۴

۵۵.	ایضاً، پشتو افسانے، ص:۳۵

۵۶.	فہمیدہ اختر، اپنے دیس میں، یونیورسٹی بک ایجنسی، پشاور، باراوّل، ۱۹۶۱ء، ص:۱۹۹

۵۷.	فہمیدہ اختر، اپنے دیس میں، ص:۲۰۱

۵۸.	منور روف، طرفہ تماشا، طاہر حسن پرنٹرز، موری گیٹ، لاہور ۱۹۷۸ء، ص:۳۷

۵۹.	منور روف، طرفہ تماشا، ص:۳۹

۶۰.	ایضاً، طرفہ تماشا، ص:۴۰

۶۱.	ایضاً، طرفہ تماشا، ص:۲۰۳۔۲۰۲

۶۲.	ایضاً، طرفہ تماشا، ص:۲۰۴

۶۳. ایضاً، طرفہ تماشا، ص:۲۰

۶۴. ایضاً، طرفہ تماشا، ص:۲۰۶

۶۵. ایضاً، طرفہ تماشا، ص:۲۰۷

۶۶. رختاج امین، ڈاکٹر، (مضمون)، منور رروف شخصیت کے آئینے میں، از احمد پراچہ، یونیورسٹی بک ایجنسی، خیبر بازار، پشاور، اگست، ۲۰۰۳ء، ص:۱۰۶

۶۷. فرحانہ قاضی، پروفیسر منور روف علمی اور ادبی خدمات، (غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم اے) شعبہ اردو، جامعہ پشاور، ۲۰۰۶ء، ص:۹۵

۶۸. شیر زمان طائزی، ڈاکٹر، صرف شرفاء کے لیے، مترجمہ قیوم مروت، گلشن ادب، سنت نگر، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص:۸۲

۶۹. شیر زمان طائزی، ڈاکٹر، صرف شرفاء کے لیے، ص:۸۲

۷۰. پروین عظیم، ڈاکٹر، گور کی کی ماں، فیصل آباد، ندیم شبلی، نشید شبلی، پبلی کیشنز، ۱۹۹۱، ص ۶۰

۷۱. مشرف مبشر، بر کھا کی بدلی، دستاویز مطبوعات، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص:۱۳

۷۲. زیتون بانو، زندہ دکھ، مترجمہ فقیر حسین ساحر، مقبول اکیڈمی، انار کلی، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص:۱۲۰

۷۳. زیتون بانو، زندہ دکھ، مترجمہ تاج سعید، مقبول اکیڈمی، انار کلی، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص:۸۸

۷۴. زیتون بانو، زندہ دکھ، مترجمہ سعد اللہ جان برق، مقبول اکیڈمی، انار کلی، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص:۱۳۵

۷۵. شمیم فضل خالق، اندھیرے میں جگنو، ایڈورٹائزنگ پروموشنل روسز، پشاور، ۲۰۰۴ء، ص:۲۲

۷۶. منوّر رؤف، طرفہ تماشا، عظیم پبلشنگ ہاؤس، پشاور، طبع اوّل، جنوری ۱۹۸۷ء، ص:۴۹

۷۷. طاہر آفریدی، دیدن، بختیار اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۲ء، ص:۴۷

۷۸. طاہر آفریدی، دیدن، بختیار اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۲ء، ص:۹۹

۷۹. زیتون بانو، زندہ دکھ، مقبول اکیڈمی، انار کلی، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص:۴۲

۸۰. سیّدہ حنا، جھوٹی کہانیاں، پاک ڈائجسٹ پبلی کیشنز، وحدت کالونی، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص:۳۱

۸۱. زیتون بانو، زندہ دکھ، مترجمہ مشتاق شباب، مقبول اکیڈمی، انار کلی، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص:۳۰۸

۸۲. زیتون بانو، زندہ دکھ، ص:۳۰۸

۸۳. رحیم گل، سرحدی عقاب، رابعہ بک ہاؤس، اردو بازار، لاہور، بار اوّل:۲۰۰۰ء، ص:۱۵۹

۸۴. رحیم گل، سرحدی عقاب، ص:۱۷۳

باب چہارم:

خیبر پختون خوا کے اُردو افسانے میں فطرت نگاری کے عناصر

غیور عوام کے مردم خیز سرزمین خیبر پختون خوا پر اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص مہربانیاں نچھاور کی ہیں۔ فلک بوس و برف پوش پہاڑ، جھومتی گاتی ندیاں، سرداور حسین چشمے، سدا بہار اشجار، سونا اُگلتی زرخیز زمین، لہلہاتے کھیت، رس بھرے پھل، اور پیار بھرے ملائم جذبات سے معمور دل شامل ہیں۔ یہاں کے لوگ فطرت سے قریب تر ہونے کے بنا ہر قسم کی ذہنی وفکری آلودگیوں سے پاک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں زندگی کی تمام مستیاں اور سر مستیاں جوبن پر ہوتی ہیں۔ زندگی کے دوسرے میدانوں میں ملکی اور بین الاقوامی سطح پر کارہائے نمایاں انجام دینے والے یہاں کے باسیوں نے ادب کے میدان میں بھی گراں قدر سرمائے کا اضافہ کیا ہے۔

خیبر پختونخوا کے افسانہ نگاروں نے اپنی تخلیقات میں پختون خوا کے دامن میں پھیلی ہوئی دیہی معاشرت اور سماج کو بطور خاص موضوع بنایا ہے۔ ہماری ۸۰ فیصد آبادی، شہروں سے دور دیہات میں بستی ہے جو کہ ہماری اقتصادیات میں ریڑھ کی ہڈی کی مانند ہے کیونکہ ہمارا پورا دیہاتی معاشرہ زرعی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس خطہ کے افسانہ نویسوں نے، اپنے افسانوں میں یہاں کا دیہاتی ماحول، کسان، حجرہ، فطری مناظر، پہاڑ، پودے، دریا، پگڈنڈیوں، کھیت کھلیان، سادہ لوح دیہاتی افرادان کے غم محبت، بہادری، خودداری، خلوص، ایثار، مذہب، توہم پرستی، جرگوں، انتقام، رومان اور مسائل غرض تمام پہلوئے حیات کو اپنی تخلیقی کاوشوں میں چابکدستی سے پیش کیا ہے۔

خیبر پختونخوا کے افسانہ نگاروں کی تخلیقات اپنے مقامی رنگ اور مناظر فطرت کی پیش کش کی بہترین انداز میں عکاسی کرتے ہیں۔ بیشتر افسانہ نگاروں کے افسانے دیہاتی ماحول کے پس منظر میں لکھے گئے ہیں۔ لہٰذا گاؤں میں غروب اور طلوع آفتاب کے مناظر، چاندنی راتوں میں چلنے والی لطیف ہواؤں اور لہلہاتے کھیتوں میں ترتیب فطرت سے کھلے ہوئے پھولوں کے مناظر ان کے افسانوں میں جابجا بکھرے نظر آتے ہیں۔ شام کو گاؤں کے حجرے میں رقص و سرور کے محافل، شادی بیاہ کے موقع، خوشی کے اظہار میں ہوائی فائرنگ کے مناظر، ہل چلاتے اور پانی دیتے ہوئے کھیتوں کے سلسلوں کو خیبر پختونخوا کے افسانہ نگاروں کے افسانوں میں خصوصی جگہ حاصل ہے۔

(الف)۔ حسن اوقات:

حسن فطرت کو خیبر پختون خوا کے اُردو افسانہ نگاروں نے اپنے تخلیقات میں بہت عمدگی سے پیش کیا ہے۔ دیہات میں حسن فطرت کی فراوانی ہوتی ہیں اس کو اپنی اصلی روپ میں دیہات میں ہی دیکھا جاسکتا ہے۔ صبح و شام کے مناظر قابل دید ہوتے ہیں۔ ڈھلتے سورج میں لہلہاتے کھیت اور فلک بوس و برف پوش پہاڑوں پر پڑتے سورج کے زرد کرنیں فرحت انگیز منظر پیش کرتا ہے۔ صبح و شام کے یہ مناظر اس قدر دلفریب ہوتے ہیں کہ دل چاہتا ہے کہ دیکھتا ہی چلا جائے۔ خیبر پختون خوا کے اُردو افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں دیہات کے ان مناظر کی جزیات نگاری پر خصوصی توجہ دی ہے ان کے مناظر قدرتی اور فطری مناظر ہیں اس لیے موثّر بھی ہیں اور دلچسپ بھی۔ افسانہ ”اندھیرے کا گھاو“ کا یہ منظر ملاحظہ ہو۔

> "آدھی رات کی خاموشی پوری طرح بیدار ہو چکی تھی۔ سنسان اور تاریک سوئی ہوئی گلیوں اور کوچوں میں سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے کتّے یوں بھونک رہے تھے جیسے وہ اس خاموش اور سرد رات کے اندگیروں سے گھبرائے ہوئے ہو اور لحافوں کی گرمی میں تھکن اور میٹھی نیند میں ڈوبے ہوئے گاؤں کے باسیوں کو جگا دینا چاہتے ہوں۔"(۱)

خیبر پختونخوا کی دیہی معاشرت میں پردہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ جس کی وجہ سے عورت ذات کو گھر کی چار دیواری میں مقید کرکے رکھا جاتا ہے۔ یہ قدغنیں بعض اوقات بغاوت کی شکل اختیار کر جاتی ہے۔ اس افسانے میں افسانہ نگار نے اسی قسم کی بغاوت کو دکھایا ہے۔ جبار خان، اس کی محبوبہ خارو جبار کی بہن اور یوسف اس گھٹن زدہ ماحول اور قدیم روایت سے بغاوت کرتے دکھائے گئے ہیں۔ بوڑھا گل زمان حجرے میں پڑا رہنے کے باوجود اپنی بیٹی خارو کی حفاظت کے خیال سے تمام رات کروٹیں بدلتا رہتا ہے اور حجرے میں پڑے جوانوں کی ہر آہٹ پر چونک پڑتا ہے۔ لیکن جب رات کا پچھلا پہر شروع ہو جاتا ہے اور سب لوگ گہری نیند میں سو جاتے ہیں، تو وہ بھی سب طرف سے مطمئن ہو کر لحاف اوڑھ لیتا ہے اور گہری نیند سو جاتا ہے۔ جبکہ حجرے میں پڑا ہوا جوان جبار خان اس کی بیٹی خارو کو وقت دے چکا ہوتا ہے اس لیے وہ چپل پاؤں میں پہننے کی بجائے ہاتھ میں لے کر انتہائی احتیاط کے ساتھ حجرہ سے نکل جاتا ہے اور گاؤں کے قبرستان کا رُخ کرتا ہے۔

طاہر آفریدی نے خیبر پختون خوا کے قبائلی معاشرت میں موجود برائیاں یا خوبیاں ہی بیان نہیں کی بلکہ اس کے پیش نظر انسانی فطرت کا وہ تضاد ہوتا ہے جس کو خیر و شر کا مرکز سمجھا جاتا ہے۔ ان کے کہانیوں میں جو ماحول اپنی مکمل جذیات کے ساتھ محاکاتی انداز میں ملتا ہے۔ یہاں کے دوسرے لکھنے والوں کی کہانیوں میں پختون ماحول کی اتنی فنکارانہ

بھرپور اور مکمل عکاسی نہیں ملتی۔ انہوں نے یہاں کے گھٹن زدہ ماحول کا نقشہ کھینچتے ہوئے قاری کو بوریت کا شکار ہونے بچانے کیلئے کمال مہارت کے ساتھ یہاں کے برف پوش چوٹیوں، گن گاتے آبشاروں، نباتات کے اثرات سے پُر قدرتی صاف و شفاف پانی کے چشموں اور قدرتی مناظر سے بھی سجایا ہے۔ رات کو آسمان پر جھلمل کرتے ستاروں کا منظر کچھ یوں پیش کیا ہے:

"پسینے کے مانند آسمان کے ماتھے پر ننھے ننھے ستاروں کے قطرے یوں جھلملا رہے تھے جیسے گاؤں کے معصوم بچے سورج غروب ہونے کے بعد گلیوں میں کھیلتے کودتے اور شور مچاتے ہیں۔"(۲)

افسانہ نگار نے دیہی معاشرت اور پشتونولی کی روایات کے مطابق معاشرے میں مردوزن کے کھلے عام جنسی تعلق پر قدغن کا ذکر کیا ہے۔ اور پشتونولی کی روایات سے روگردانی کو قابل سزا جرم قرار دیا ہے۔ اس قسم کی روگردانی پر اس معاشرے مین مطلوبہ افراد پر پشتونولی کی حدلاگو ہو کر موت کا سزاوار ٹھرایا جاتا ہے۔ محبت کے اظہار اور جنسی تعلق پر یہاں اس قدر پابندی لاحق ہے کہ ایک گھٹن اختیار کر گئی ہے۔ یہاں محبت کا اظہار اور اپنے کیفیات کو بیان کرنا موت کو دعوت دینے کی مترادف ہے۔

طاہر آفریدی نے اپنے افسانے "برف پہاڑوں کا آدمی" میں چاندنی رات کی منظر کشی بہت عمدگی سے کی ہے۔ دیہاتی اور قبائلی پس منظر میں لکھے گئے اس افسانے میں افسانہ نگار نے یہاں کے روایات اور پشتون معاشرے میں گھر آئے مہمان کو پناہ دینے کی روایت ان کی مہمان نوازی کو واضح کیا ہے۔ افسانے میں جو منظر پیش کیا گیا ہے وہ خالص قبائلی دیہات کا ہے۔ حجرے کی روایت بھرپور طریقے سے قبائلی علاقوں میں زندہ ہے جبکہ صوبے کے دوسرے علاقوں میں اس کی جگہ "بیٹھک" نے لے لی ہے۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ بڑا حجرہ ہے جس کے بیچ میں ایک مسجد ہے پانی کے گھڑے موجود ہیں۔ پشتون روایات کے مطابق مہمان سے اُس کے قیام کے بارے میں نہیں پوچھا جاتا۔ اُس کے کھانے اور آرام کا خاص خیال رکھا جاتا ہے یہ سب ایک مخصوص تہذیب کی عکاسی ہے پہاڑوں میں گراہوا علاقہ ہے جہاں پر شکار کھیلنے کے مواقع موجود ہیں۔ بندوق یا رائفل ہر جوان کا نشانِ امتیاز ہے۔ وہی قبائلی رسومات اور رواجوں کے بندھن ہیں۔ مگر اس افسانے میں سب سے اچھا وہ چاندنی رات کا منظر ہے جس نے کردار کے لاشعور کو ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔

"اس خوبصورت چاند نے بلا تخصیص اس وادی پر محبت کے کرنیں پھینکیں ہیں۔ سورج کی روشنی نے ہر اعتبار سے بالاتر ہو کر اس کو زندگی دی ہے۔ بادل برستے ہیں۔ بہاریں آتی ہیں۔ پھول کھلتے ہیں۔ پہاڑ دعوت نظارہ دیتی ہیں۔ پرندے محبت و خلوص کے نغمے الاپتے ہیں۔"(۳)

بے جا جکڑ بندیوں اور سخت گیر قوانین معاشرت کے بنا بغاوت کا ابھرنا فطری بات ہے۔روایات سے معمولی روگردانی قتل مقاتلے اور تنازعات کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔پس اس ماحول میں رہنے والوں پر اس کی پاسداری لا محالہ فرض ہے۔لیکن اس کا الٹا اثر یہ ہوتا ہے کہ جتنا اس کو دبایا جاتا ہے یہ قدغنیں اتنی ہی بغاوتوں کو جنم دیتی ہے۔اور ماحول گھٹن زدہ ہو جاتا ہے۔کلاشنکوف اور بندوق تھامے طاہر کے افسانوی کردار اسی معاشرت کے عکاس ہیں۔جہاں بات منوانے اور روایات کا پاس نہ رکھنے والوں کو نہ معاشرتی لعن طعن کا سامنا کرنا پڑتا ہے بلکہ بندوق کی ابان میں بجھی ان سے بات کی جاتی ہے۔

افسانہ نگار حتی الوسع یہ کوشش کرتا ہے کہ پشتون معاشرے سے نفرتوں اور عداوتوں کا یہ رویہ ختم ہو اور اس کی بجائے ان کے درمیان محبت اور شفقت کا جذبہ درآئے۔اس مقصد کے حصول کے لیے وہ گل شیر جیسا کردار پیش کرتا ہے۔اس افسانے میں گل شیر کے ساتھ منسوب لڑکی زلفانہ کی شادی اس کے والدین گل شیر کی بجائے کسی اور آدمی سے کرادیتے ہیں۔اب پشتون ولی کے نقش قدم پر چلنا تو یہ ہے کہ گل شیر زلفانہ کے شوہر کو قتل کردے۔اس غرض کے حصول کے لیے گل شیر چند آدمیوں کو لے کر زلفانہ کے شوہر پر حملہ کرنے کی تاک میں بیٹھا ہے۔زلفانہ اور اس کا شوہر شہر سے خریداری کرکے گاؤں آرہے ہیں کہ ایک دم گل شیر اپنے ساتھیوں سمیت ان دونوں کا راستہ روک لیتا ہے۔گل شیر زلفانہ کے شوہر پر بندوق تان کر نشانہ لیتا ہے کہ اُسی لمحے اس کی نظر زلفانہ پر پڑتی ہے۔اس اَکڑی ہوئی صورت میں گل شیر کے اندر کا آدمی دل و نظر کے معاملے کو عشق کی عدالت میں پیش ہوتے ہوئے چشم تصّور سے دیکھتا ہے۔عشق نے اُسی لمحے فیصلہ سنادیا۔رہنے دو۔اس کے ہاتھوں میں ہی بندوق جھک جاتی ہے۔وہ عشق کی عدالت سے تفصیلی فیصلہ سننے میں محو ہو گیا"واپس چلے جاؤ"گل شیر ایک ساتھ دھڑکنے والے دلوں کے درمیان مت آؤ۔اپنے ساتھیوں کے طعنے اور گالیاں سن کر اَن سُنی کردو۔بھول جاؤ اس بات کو کہ لوگ کیا کہیں گے" انصاف انصاف ہوتا ہے۔عشق کی عدالت کے انصاف کے آگے پشتون ولی مجرم تھی۔اُس نے اپنی ہار تسلیم کرکے اپنی بڑائی کا ثبوت دیا۔زلفانہ کو جینے کا حق مل گیا۔گل شیر نے مردانہ وار حقیقت کے آگے سر تسلیم خم کیا۔وہ گھر آکر سارا سازوسامان باندھ کر گاؤں چھوڑنے کا فیصلہ کرتا ہے۔

طاہر آفریدی کے افسانے پہاڑوں کے دامن میں اُگے ہوئے پیڑوں کی طرح توانا اور پہاڑی چشمے کے پانی کی طرح سبک رو ہیں۔انہوں نے اپنے افسانوں میں یہاں کی قدرتی خوبصورتی اور پُر فریب وادیوں کا تذکرہ دلفریب انداز میں کیا ہے۔فطرت کی آغوش میں پرورش پانے والا یہ فنکار بے حد سیدھے سادے انداز میں ہمیں محبتوں کی،نفرتوں کی،مسرتوں کی،دکھوں کی،آرزووں کی اور شکست آرزو کی کہانیاں سناتا اور حسین نظاروں ،خوشبو بھری طراوت

سے لبریز وادیوں کی انوکھی دنیا اور بودوباش، رسم و رواج، عقائد اور معاشرت سے روشناس کراتا ہے۔ اور یہاں کے مناظر فطرت دل پزیر انداز میں پیش کرتا ہے۔

"چاند نے اب پہاڑ کی اونچی چوٹی سے نکل کر گاؤں اور اس وادی میں اپنی نرم چاندنی بچھادی تھی، گاؤں کے بچے گلیوں میں چاندنی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔"(۴)

پشتون دشمن سے بدلہ لینے والے لمحے کو پشتو اور غیرت کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ گو یا پشتو یا غیرت جہاں مثبت کردار نبھاتی ہے وہاں اس کا منفی رُخ بھی موجود ہے جو انتقام اور خون خرابے پر منتج ہوتا ہے۔ افسانہ نگار پشتونوں کے جذباتی رجحان اور انتقامی سوچ کو سامنے رکھتے ہوئے ایک ایسا رویہ پیش کرنا چاہتا ہے جو پشتو اور پشتونولی کے چہرے کو خوبصورت بناتا ہے۔ اس کی یہ سوچ ہے کہ پشتو کو انتقام کی بجائے درگزر کے مترادف بنالیا جائے تو یہ بہترین عمل ثابت ہو سکتا ہے۔ اسی طرح باپ کے گناہ میں بیٹے کو مار ڈالنا بھی کسی معاشرے کے لیے اچھا تاثر نہیں دیتا۔ انصاف کا اوّلین تقاضا تو یہ ہے کہ درگزر سے کام لیا جائے اور اگر ایسا نہ ہو سکے تو پھر قانونی چارہ جوئی سے کام لیا جائے اور اگر ایسا بھی نہ ہو سکے تو پھر کم از کم اصل قاتل ہی سے انتقام لیا جائے نہ کہ اس کے بیٹے، بھائی یا بھتیجے وغیرہ کو قتل کرکے اپنے انتقام کی پیاس بجھائی جائے۔

افسانہ ''برف پہاڑوں کا آدمی'' میں بھی افسانہ نگار نے اصلاحی انداز اپناتے ہوئے اپنے کردار گل شیر کو قبائلی روایات کے خلاف اپنے دشمن پر گولی چلانے سے باز رکھا۔ اگرچہ گل شیر اس بات پر قادر تھا کہ اپنے دشمن کو ٹھکانے لگاتے لیکن انھوں نے عین موقع پر اپنا فیصلہ واپس لیا اور اپنے محبوبہ زلفانہ کو بیوہ ہونے سے بچایا۔

"ویسے میرا ارادہ تھا کہ اس شخص کو گولی ضرور ماروں گا مگر جب وہ میرے نشانے پر آیا تو میں نے اس کے پیچھے ایک نغمہ ریز آواز سنی جو زلفانہ کی چوڑیوں کی جھنکار تھی جو اس کے سہاگ کی نشانی تھی جس کی پیشانی پر ابھی سہاگ کا جھومر ہچکولے کھا رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں پر ابھی تک رنگ حنا باقی تھا۔ اس کی کالی زلفوں میں گلاب کے سُرخ پھول مسکرا رہے تھے۔ اس نے سرخ رنگ کا جوڑا پہن رکھا تھا اور وہ بہت خوش تھی۔ میں اس کی خوشی چھیننا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ایک پھول تھی میری محبت کا پھول۔۔۔۔۔۔ اور میں اپنے ہاتھوں اس پھول کو مسل نہیں سکتا تھا۔ میں زلفانہ کی خوش و خرم اور مطمئن دنیا کو اجاڑنا نہیں چاہتا تھا۔ میں اس کو اگر اور کچھ نہیں دے سکتا تھا تو اس کی خوشیاں اُجاڑنے کا بھی مجھے کوئی حق نہیں تھا۔ میں نے زلفانہ کی خاطر اپنے بدترین دشمن کو معاف کر دیا۔۔۔۔"(۵)

اگرچہ یہ رویہ قبائلی روایت کے خلاف ہے لیکن طاہر آفریدی نے قاری کو یہ درس دینے کی کوشش کی ہے کہ ابھی بھی اس معاشرے میں ایسے لوگ موجود ہیں جو کہ انسانیت پر یقین رکھتے ہیں اور دوسروں کے لیے قربانی دینے کا

جذبہ رکھتے ہیں۔اور اسی کو ہی انسانیت کے معراج تصور کرتے ہیں۔ افسانہ نگار صرف کرداروں کے ظاہری عمل ہی کو بیان نہیں کرتے بلکہ ایک ماہر نفسیات کی طرح کرداروں کے عوامل کا نفسیاتی تجزیہ بھی کرتے ہیں۔ اگرچہ ماحول کا اثر تادیر قائم رہتا ہے لیکن ایسا بھی نہیں کہ انسان کے فطرت کو نہ بدلا جا سکیں۔ فرسودہ روایات کے خاتمے اور انسان دوستی کا خواہاں طاہر اپنے تخلیقات میں یہی درس لیے ہوئے ہیں۔ ''آئینہ چہرہ''، ''برف پہاڑوں کا آدمی''، ''بیری کا درخت''، ''ٹھنڈک''، ''وہ جو گاؤں تھا'' ان کے اسی روایتی انتقام کے مختلف روپ پیش کرتے ہیں۔

طاہر آفریدی کی انسان دوستی اور ران کے تخلیقات میں اصلاحی پن کے بارے میں ڈاکٹر رُختاج امین کہتی ہے:

"طاہر آفریدی نے پشتون غیرت وحمیت کی خاطر کی گئی قربانی اور قبائلی ماحول کی ناچاقی وبے حسی کی ترجمانی کی ہے لیکن ان کے افسانوں کی فضا صلح کل ہے۔ وہ معاشرتی امن وسکون اور خیر کے خواہاں ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں کسی نہ کسی قبائلی روایت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے لیکن امن وآشتی کی ایک موہوم سی خواہش ان کے کرداروں میں عام ملتی ہے جو بندوق کی نالی تان کر بھی دشمن کو معاف کر دیتے ہیں۔۔۔۔۔۔ اپنے من کی آگ کو دوسروں کے آنسوؤں سے نہیں بجھاتے۔"(۶)

طاہر کے افسانوں کے کردار اگر ایک طرف قاتل اور قابل نفرت ہیں، تو دوسری طرف عفو اور درگزر کے پیکر ہیں۔ وہ انتقامی جذبے سے اندھے انسان کے اندر خیر کی چنگاری کی تلاش بھی کرتا ہے اور انسانیت کا لبادہ اوڑھے ہوئے بھیڑیوں کے اندر کی درندگی کو بھی باہر لانے کی کوشش کرتا ہے۔ طاہر پشتون معاشرے کے کرداروں کے ذریعے انتقام کا وہ رویہ بھی پیش کرتا ہے جس کے تحت کوئی شخص مٹ بھی جاتا ہے اور مٹا بھی دیتا ہے۔ اسی طرح وہ پشتون معاشرے کے خوبصورت اور بدصورت دونوں رُخ دکھاتا ہے تاکہ پشتونوں کو یہ اندازہ ہو کہ اگر وہ چاہیں تو اپنے معاشرے کو مصائب کا جہنم بھی بنا سکتے ہیں اور اپنے معاشرے کو امن کا گہوارہ بنانا بھی ان کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ وہ پشتونوں کی بہادری اور دلیری، حیاوپاکبازی اور مہمان نوازی وایفائے عہد جیسی قدروں کو پیش کر کے ان کے اندر اخلاقی عظمت پیدا کرنا چاہتا ہے اور عظمت کے اسی سائے میں ان کے انتقامی جذبوں کو سرد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ پشتون قوم کو یہ درس بھی دینا چاہتا ہے کہ وہ پہلے مسلمان اور بعد میں پشتون ہیں۔

ماحول کی تصویر کشی میں طاہر کو کمال حاصل ہے۔ وہ کہانی کے مزاج کے مطابق ماحول کا ایسا نقشہ پیش کرتے ہیں کہ قاری کا ذہن اس فضا سے مانوس ہو جاتا ہے۔ اکثر کہانی کے ابتدائیہ میں جو ماحول پیش کیا جاتا ہے اس سے کافی حد تک قاری کو کہانی کی مزاج کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ وہ ایک خاص قسم کا ماحول پیدا کر لیتے ہیں پھر چند کرداروں اور ان کے عمل کے ذریعے اس پھیلا لیتے ہیں۔

سحر یوسفزئی نے اپنے افسانوں میں خیبر پختون خوا کی دیہی معاشرت اور مقامی رنگ کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ان کے افسانے خیبر پختون خوا کے شمالی علاقہ جات کے قبائلی زندگی، ان کے رسم و رواج، باہمی تنازعات، ان میں موجود توہمات، زن، زر اور زمین کے بنا قتل و غارت پر مبنی ہیں۔ان کے افسانوں میں دیہاتی ماحول کی منظر کشی بھی ہے اور مقامی رنگ کے نمائندگی بھی۔نیلگو پانی کے ابشار بھی اور فلک بوس و برف پوش پہاڑوں پر چیڑ و چنار کے درختوں کے جنگلات بھی۔گاؤں میں غروب و طلوع آفتاب کے مناظر اور چاندنی راتوں میں چلنے والی لطیف ہواؤں کی جھنکار ان کے افسانوں میں موجود ہیں۔چونکہ سحر یوسفزئی نے خیبر پختون خوا کی ان علاقوں کی منظر کشی کی ہے جس کا قدرتی حسن پوری دنیا میں شہرت کا باعث ہے اس لیے قاری ایک سفر نامے کے طرح ان افسانوں کے مناظر میں محو ہو جاتا ہے وہ نہ صرف ان افسانوں کو پڑھتا ہے بلکہ چشم تصور میں خود بھی ان حسین مناظر سے لطف اندوز ہوتا ہے۔افسانہ ''چاند اور کھنڈر'' میں چاندنی رات کا یہ حسین منظر ملاحظہ ہو۔

"چاندنی رات تھی۔ساری کائنات اس ہلکی ہلکی روشنی میں ڈوبی ہوئی تھی۔وہ شہر کا راستہ چھوڑ کر کھیتوں کے طرف ہولیا۔سرسوں اور گیہوں کے کھیت چاند کی روشنی میں کچھ مدہوش مدہوش سے تھے۔ٹھنڈی ہوا میں بہار کی مہک تھی۔اس کے تپتے ہوئے جسم نے اس کے روئیں روئیں سے پینا شروع کر دیا۔وہ اس چاندنی کے دریا میں بہتا رہا، بہتا رہا۔"(۷)

سحر یوسفزئی کے ایک اور افسانہ ''سائے'' میں شام کے وقت چلنے والی لطیف ہواؤں اور لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں دھان کی فصل کا ہوا کے جھونکوں پہ رقص اور دور پہاڑوں کے چٹانوں سے سر ٹکراتی ہوئی سفید دودھیا پانی کی ابشار کی منظر کشی اپنے مثال آپ ہے۔سحر کی منظر کشی کے سلسلے میں ایک بات بڑی اہم ہے کہ ان کے ہاں دیہات کے مناظر کی جزیات نگاری پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔دیہاتی روز و شب کے حسن اوقات کو کمال مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

"شام کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں دھان کی سبز سبز کھیتوں کو گدگدا رہی تھی اور ہوا کے جھونکوں سے دھان کی نرم نرم پتیاں جھول رہی تھیں اور ناچ رہی تھیں۔پھر اس نے اُس پہاڑی جھرنے کی طرف دیکھا جو بہت ہی بلندی سے نالے میں گر رہا تھا۔اور جس کا شفاف پانی ہوا، چٹانوں اور پودوں پر اُڑا اُڑا کر گرا رہی تھی۔پھر اُس کی نگاہ اُس بلد چوٹی تک اُٹھتی چلی گئی۔جہاں سے یہ پانی آرہا تھا وہ برف پوش کنگرا آسمان میں چھوتا چلا گیا تھا۔"(۸)

سحر کے رومان پرور افسانوں کے کردار رومان پرور ماحول میں جنم لیتے ہیں۔ان کے جذبات نگاری اکثر حسین مناظر کے پس منظر میں سامنے آتی ہے۔کہانیوں کی ابتداء عموماً حسین مناظر سے ہوتی ہے۔کہیں کہانی کی تاثراتی فضا میں

بار بار حسین مناظر کا تذکرہ کر کے کہانی کو آگے بڑھانے میں معاونت کرتا ہے۔ لیکن یہ حسین مناظر کہانی کو کمزور نہیں کرتے بلکہ اور بھی توانا بناتے ہیں۔ کہیں بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ مصنف نفس مضمون کے مکمل اظہار کی بے بسی کو چھپانے کے لیے منظر کشی کی خانہ پری کر رہا ہے۔

خیبر پختون خوا کے افسانہ نگاروں میں ایک معتبر نام زیتون بانو کا ہے۔ ''شیشم کا پتا'' اور ''وقت کی دہلیز پر'' ان کے پشتو افسانوں کا اُردو روپ ہے۔ ان کے کہانیاں یہاں کے دیہات اور پشتون معاشرت کی بھرپور نمائندگی کرتی ہیں۔ زیتون بانو نے بڑی جرات و بے باکی سے معاشرتی برائیوں کے خلاف آواز بلند کر کے معاشرتی منافقتوں کے خلاف قلمی جہاد کیا ہے۔ پشتون معاشرے کے تہذیبی، سماجی و ثقافتی پس منظر سے اُبھرنے والی یہ کہانیاں یہاں کے معائب و محاسن کے علاوہ قدرتی مناظر اور جغرافیائی حسن کی بہترین عکاسی پر مشتمل ہیں۔ بانو نے اپنے افسانوں کو یہاں کے قدرتی حسن اور پُر کشش نظاروں سے مزیّن کیا ہے۔

> "یہ بہار کی ایک دلنشین سہ پہر تھی۔ اور میں بیٹھا ہوا تاترے کے پہاڑوں کے نظارے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے تمام کائینات نے ہرے رنگ کی چادر اُڑھ رکھی ہو یا کسی نئ نویلی دلہن نے سبز رنگ کی بنارسی سر ہر ڈالی ہو۔ سورج ہولے ہولے پہاڑوں کے پیچھے سمٹنے کی کوشش کر رہا تھا اور چند لمحوں بعد ایک گول مٹول فٹبال کی شکل اختیار کر گیا اور پھر کچھ دیر بعد سورج نے ڈوبنے کی اجازت مانگی تاکہ دوسری صبح پھر تازہ دم ہو کر نمودار ہو سکے اور نگاہوں سے اُوجھل ہو گیا۔"(۹)

زیتون بانو نے خیبر پختون خوا کے ایک پہاڑی سلسلے ''تاترے'' کا نظارہ بہترین لفّاظی کے ساتھ اپنے افسانہ ''آنکھیں'' میں پیش کیا ہے۔ اور موسم بہار کے ایک دلنشین سہ پہر کو تاترے کا نظارہ قارئین کو بیان کرتے ہوئی اپنے افسانے میں ایسی جاذبیّت پیدا کرتی ہے کہ قاری ان کی فنّی بصیرت کا قائل ہو جاتا ہے۔

پشتون ولی میں یہ ستم ظریفی ہے کہ محبت کے مرتکب شخص کو مجرم ہی سمجھا جاتا ہے۔ یہاں کسی لڑکی کو عشق ہو جاتا ہے تو وہ اندر ہی اندر سلگتی ہے، لیکن اپنی محبت کا اظہار نہیں کر پاتی۔ اب تک پشتون کلچر پر جتنے بھی افسانے لکھے جا چکے ہیں ان میں بیشتر افسانے ایسے ہیں جن کے سارے کردار اپنی محبت کی چتا میں جلتے ہیں لیکن اپنے جذبات کا اظہار نہیں کر پاتے۔ افسانہ ''آنکھیں'' کی انجمن جس کی عمر اٹھارہ برس ہے۔ وہ شہر سے آنے والے ایک ڈاکٹر کو صرف اس کی ایک محبت بھری نظر کے بدلے اپنا دل دے بیٹھتی ہے جو ایک فطری امر ہے۔ ڈاکٹر بھی اس کی محبت کو قبول کرتے ہوئے اس کے لیے دل میں ایک نرم گوشہ رکھتا ہے لیکن اتفاق سے جب ڈاکٹر غائب ہو جاتا ہے تو بھولی بھالی انجمن اسی طرح اس کا راستہ تکتی رہتی ہے۔ ایک دن تو وہ آئے گا مگر وہ خود شام تک برف پر پھسل پھسل کر ڈاکٹر کے انتظار میں دیوانہ

وار" میں کہاں کہاں نہ پہنچا تری دید کی لگن میں" کے مصداق ساری وادیاں چھان مارتی ہے۔ ڈاکٹر آیا پر نہ آیا۔ حتیٰ کہ اس کا چھوٹا بھائی بھی اس کے ساتھ گھومتے ہوئے تھک کر گھر چلا جاتا ہے اور انجمن انگریزی کی مشہور نظم "Exeesiar" کے ہیرو کی طرح برف میں پھسل کر کسی گہری کھائی میں ڈوب کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاتی ہے۔ اس افسانے میں پشتون معاشرے میں محبت پر پابندی کا یہ تاثر دیا گیا ہے کہ یہاں محبت پر اتنے پہرے بٹھائے جاتے ہیں کہ کوئی کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھے۔ شہر کے ڈاکٹر کی محبت میں گرفتار معصوم انجمن محبت کے آغاز و انجام سے بے خبر دل میں لگی آگ سے جل بھُن تو جاتی ہے لیکن ڈاکٹر کے آگے اظہار نہیں کر پاتی۔ اُسے تو آہ بھرنے کا بھی حوصلہ نہیں ہو گا۔

زیتون بانو نے معاشرتی جکڑبندیوں اور محبت کرنے والے پریمیوں پر قدغنوں کا تذکرہ کرتے ہوئے یہاں کے روایات کے پاسداری کرتے ہوئے پختون دوشیزاؤں کے دل کے کیفیات بیان کی ہیں۔ عشق کے روگ میں جلنے والی انجمن اور موسم بہار کے آغاز پر پہاڑوں سے گزرنے والے نیلگوں پانی کے آبشار کے مناظر کو افسانہ نگار نے منفرد اور دل کش انداز میں پیش کیا ہے۔

"برف پگھلنے لگی، پہاڑوں سے ندیاں بہنے لگیں اور پہاڑوں کے دامن میں جھیل کے شکل میں پانی جمع ہونے لگا۔ تو انجمن گھنٹوں ساکن پانی میں پاؤں ڈالے بیٹھی سوچتی رہتی اس کے آنکھیں دور تک کسی کو تلاش کرنے میں مصروف ہوتیں۔"(۱۰)

پشتونوں کے قبائلی اور دیہاتی علاقوں میں اگرچہ محبت کرنا ناقابل تلافی جرم سمجھا جاتا ہے لیکن پھر بھی حسن وجمال کے حامل یہ لوگ دل والے بھی ہوتے ہیں۔ محبت ایک ابدی، فطری اور بے پرواجذبہ ہے۔ پشتون ولی لاکھ آنکھیں نکالے یہ آگ ہی ایسی ہے کہ "لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے۔" گلیوں میں بھی مڈبھیڑ ہو جاتی ہے، آنکھیں چار ہو جاتی ہیں، دل لئے اور دیئے جاتے ہیں۔ تحفے بہ صد خلوص پیش کیئے جاتے ہیں۔ بہ ہزار جان قبول کیے جاتے ہیں۔

اپنے حسین مرغزاروں، سرمدی دُھنیں گاتے آبشاروں کے ساتھ گھنے جنگلوں سے گھرا ہوا یہ پشتون معاشرہ حسن و عشق کے معرکوں سے بھی آتشیں چلا آرہا ہے۔ حسن کے گھر پر یہاں بھی عشق مہمان کی حیثیت سے ضرور موجود رہا ہے۔ فطرت یہاں بھی اپنی جولانیاں دکھاتی ہے۔ آنکھیں اُٹھائے، پلکیں گرائے، زلفیں لہرائے اور قہقہوں کی بجلیاں گرانے سے یہاں بھی جیسے "پربت کا جگر چیر کے جھرنا پھوٹے۔" عشق و محبت کے سلسلے چل نکلتے ہیں۔ پیار کی پینگیں بڑھائی جاتی ہیں۔ تصویر کے بننے اور کھینچنے سے بھی پہلے اُس کا تصّور زندہ رکھنے کے لیے رومال کو نشانی کے طور پر لینا دینا بھی اس معاشرے میں محبت کا کاروبار رہتا آرہا ہے۔ وصال کے اُڑتے لمحے اور جدائی کے کرب سے گزر کر پشتون جوانیاں بھی اپنی سخت جانی منوا چکی ہیں۔

خیبر پختون خوا کے سر زمین پر ایسے افسانہ نگار بھی وارد ہوئے ہیں، جنہوں نے معاش کی خاطر ہندوستان کے دیگر علاقوں سے ہجرتیں کی ہیں۔ ان کے افسانوں میں سر زمین ہٰذا کی دیہات نگاری کم اور برِ صغیر پاک وہند کے دیگر علاقوں کی دیہی وعلاقائی ماحول کی پیش کش زیادہ پائی جاتی ہے۔ ایسے افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام اُم عمارہ کا ہے۔ ان کی دوافسانوی مجموعے ''آ گہی کے ویرانے'' اور ''در روشن ہے'' شائع ہو چکے ہیں۔ اگر چہ ان کے زیادہ تر آفسانے بنگالی، بہاری مناقشے کی عکاسی کرتے ہیں، لیکن ان کے ہاں اپنی اور اپنے ہم وطنوں کی بے بسی کے علاوہ دنیا کے دیگر اقوام کی کوتاہ نصیبی کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ افسانہ "پتھر کا آدمی" ان کی اس سوچ کا غماز ہے، "ایتھوپیا" کے صحراؤں میں پھیلتی ہوئی بھوک سے ان کے جذبات مجروح ہوئے ہیں اور وہ اپنے ہم جنسوں کے غم میں برابر کی شریک ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعوں کے مطالعہ کے بعد بات تو پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ اس نے اپنی سر زمین اور وطن کی محبت سے سرشار ہو کر یہ افسانے تخلیق کئے ہیں۔ بنگالی دیہی معاشرت کو انہوں نے بطور خاص اپنے تخلیقات میں سمویا ہیں۔ اپنے ایک افسانے ''ریت کی دیوار'' میں چاندنی رات کا منظر بہت دل کش انداز میں بیان کیا ہے۔

> "چاندنی رات اور وہ بھی برسات کی دُھلے دھلائے آسمان پر چودھویں کا چاند اپنے روایتی انداز میں بڑی آب وتاب سے چمک رہا تھا کھلے آنگن میں بچے اُودھم مچارہے تھے ایک طرف زرہ ہٹ کر ایک قطار سے پانچ سات پلنگ بچھے ہوئے تھے جن پر بچھی ہوئی سفید چادریں دودھیا چاندنی میں کچھ اور بھی نکھر گئی تھیں۔ دور ہٹ کر ایک طرف چبوترے پر ایک بڑا سا چوکا لگا ہوا تھا۔ محلے کی بیویوں کے جھرمٹ میں کھر کی خواتین بڑے اطمینان سے غیبت میں مصروف تھیں اور ساتھ ہی ساتھ بچّوں کو اُودھم مچانے اور چیخ وپکار کرنے سے منع کرتی جارہی تھیں۔"(۱۱)

اُمّ عمارہ نے بنگالی، بہاری مخاصمت کی صورت میں زندگی کی ستم رانیوں کو نہ صرف قریب سے دیکھا بلکہ براہ راست متاثر بھی ہوئی۔ وہ اپنے افسانوں میں ایک طرف اتھوپیا کے صحراؤں میں اُگتی بھوک کو بیان کرتی ہے تو دوسری طرف بنگال کے سرسبز و شاداب زمیں میں بھوک سے سسکتی انسانیت کے کرب کو اس انداز میں بیان کرتی ہے کہ دل خون کے آنسو روتا ہے۔ اُم عمارہ کی اکثر کہانیاں انہی المیوں پہ لکھی گئی ہیں اور اسے زبان وبیان پہ کمال کی دسترس حاصل ہے۔ فقروں کی درو بست بھی خوب ہے ہر کہانی میں منطقی انجام سے قطع نظر کئی جملے اس درجہ خوبصورتی سے پروئے گئے ہیں کہ جنہیں پڑھ کر قاری عش عش کر اٹھتا ہے۔

زیادہ تر افسانے بنگال کے پس منظر میں لکھے گئے ہیں اور ایک ہی معاشرے کے اندر رونما ہونے والے مختلف مسائل پر صورت بدل بدل کر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اُمّ عمارہ کا اپنے گرد وپیش کا مطالعہ انتہائی عمیق اور ہر ایک واقعہ کے

پس منظر اور پیش منظر کا بھرپور تجزیہ ان کے پختہ شعور کا عکاس ہے۔وہ اپنی تحریروں میں ٹوٹ پھوٹ کے شکار معاشرے، ختم ہوتی روایات، مطلب پرستی اور مفاد پرستی کے سیاہ چہرے سے پردے ہٹاتی چلی جاتی ہیں۔

(ب)۔جغرافیائی حسن:

تاریخی و جغرافیائی حیثیت سے اہمیت کا حامل صوبہ خیبر پختونخوا اپنے قدرتی حسن ور عنائی اور دلکشی کے لیے بے پناہ شہرت رکھتا ہے۔ تہذیب و تمدّن کا گہوارہ ہونے کے ساتھ ساتھ یہاں انسانی زندگی کی موجودگی تاریخی اعتبار سے تقریباً پانچ ہزار سال پرانی ہے۔ موجودہ خیبر پختونخوامیں آبادی کا زیادہ تر حصّہ دیہات پر مشتمل ہے۔ خیبر پختونخوا کے اردو افسانہ نگاروں نے زیادہ تر اپنے موضوعات اور کردار اسی سے حاصل کئے اور اسی کو نمایاں کرنے کی سعی کی۔بلاشبہ فطرت اپنے تمام بے ساختہ پن کے ساتھ دیہات میں جلوہ گر ہوتی ہے۔وہاں تصنع وبناوٹ نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔سادگی، ہمدردی اور خلوص جیسی خصوصیات دیہات کی زندگی کو شہری زندگی سے ممتاز کردیتی ہے۔دیہات کے لوگ زمین سے گہری وابستگی رکھتے ہیں۔اس لیے ان کے زمینی رشتے بہت گہرے اور مضبوط ہوتے ہیں۔ان کے انداز گفتگو، ملنا جلنا، اُٹھنا بیٹھنا اور کردار میں زمین کی بھینی بھینی خوشبو اور زرخیزی صاف محسوس کی جاسکتی ہے۔وہاں کے اکثر لوگ، معصوم، ملنسار، مہمان نواز اور تصنع سے مبرّا ہوتے ہیں۔ خیبر پختونخوا کو قدرت نے بیش بہا قدرتی حسن سے نوازا ہے۔ یہاں کے دیہات اور پہاڑی علاقوں کی فضائیں عطربیز اور مناظر سحر انگیز ہیں۔اس لیے جہاں یہاں کے بیشتر افسانہ نگاروں نے اپنے موضوعات اور کرداروں کا انتخاب اسی معاشرے سے کیا وہاں اپنے افسانوں کو پُر تاثیر اور فرحت انگیز بنانے کے لیے یہاں کے قدرتی مناظر اور جغرافیائی حسن سے اپنے افسانوں کو مزیّن کیا۔

سحر یوسف زئی نے اپنے افسانہ ''مانکیال کا سایہ'' میں خیبر پختونخوا کے ایک خوبصورت وادی ''سوات'' میں واقع چیڑ و چنار سے ڈھکی پہاڑی چوٹی ''مانکیال'' کا نقشہ کچھ اس انداز سے بیان کیا ہے کہ قاری نہ صرف اس حسن سے مسحور ہوتا ہے بلکہ وہ خود ان مناظر میں شریک ہو کر حسن کا متلاشی بن جاتا ہے۔

> "پہاڑوں پر تازہ تازہ برف پڑی تھی، اور ان کے گرد ہلکے ہلکے بادل لپٹے ہوئے تھے۔دور تک بادلوں کی نرم نرم چادر پھیلی ہوئی تھی۔اور آفتاب کی کرنیں اس چادر کو چاک کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔یکایک بادلوں کی اس چادر کا ایک کونا ذرا سا سرکا اور مانکیال کے کنگرے چمک اُٹھے۔ پہاڑوں کی شہزادی مانکیال کی چوٹی رنگارنگ برف کا تاج پہنے جھلمل جھلمل کرتی نظر آنے لگی۔"(۱۲)

افسانہ نگار نے اس افسانے میں اس توہم پرستی کی طرف اشارہ کیاہے جو یہاں کے اکثر لوگوں میں پایا جاتا ہے۔شاید یہ وجہ ہو کہ یہ لوگ اب بھی اپنی عورتوں سے گھرداری کے علاوہ کھیتوں میں ہل چلوانا، فصل کی کٹائی

کرانااور کلہاڑی، درانتی کا مشقت بھرا کام کرتے ہیں۔ خود ہاتھ میں بندوق تھامے اپنے گھروں کی چھتوں پر بیٹھ کر سیکورٹی بجالانے کا دم بھرتے ہیں۔ انہی غلط عقائد کی وجہ سے محبت جیسے لطیف جذبے کو پروان چڑھنے کا موقع نہیں ملتا۔ دو محبت کرنے والوں کو بے دردی سے جدا کر دیا جاتا ہے اور دو انسانی جانیں اس وہم کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔

سحر کے رومان پرور افسانوں کے کردار رومان پرور ماحول میں جنم لیتے ہیں۔ ان کے جذبات نگاری اکثر حسین مناظر کے پس منظر میں سامنے آتی ہے۔ اکثر کہانیوں کی ابتداء ہی حسین مناظر سے ہوتی ہے۔ کہیں کہانی کے ماحول میں تاثراتی فضاء میں بار بار حسین مناظر کا تذکرہ کہانی کو آگے بڑھانے میں معاونت کرتا ہے۔ لیکن یہ حسین مناظر کہانی کو کمزور نہیں کرتے بلکہ اور بھی توانا بناتے ہیں۔ کہی بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ مصنف نفسِ مضمون کے مکمل اظہار کی بے بسی کو چھپانے کے لیے منظر کشی کی خانہ پُری کر رہا ہے۔ ان کی کہانیاں سوات اور قبائلی علاقی جات کے گرد گھومتی ہیں۔ ان علاقوں کو قدرت نے بے پناہ حسن سے نوزا ہے۔ یہی حسن وہ اپنے کہانیوں میں سمو کر پیش کرتے ہیں۔

"زرد زرد دھوپ میں سانپوں اور جھینگروں کی بے ہنگم آواز گونج رہی تھی۔ ایک بے معنی سر سراہٹ۔ بے ہنگم سا شور سیٹیوں کی سی آوازیں۔ ادھر دریاں بہہ رہا تھا۔ اٹھلا اٹھلا کر مچل مچل کر اور اس کی سفید دودھیا سفید دھاری دور سے نظر آرہی تھی۔ کبھی وہ سحر زدہ انسان کی طرح سر پٹخنے لگتا اور کبھی رک رک کر بہنے لگتا۔ پہاڑ پر سے آنے والی سرد ہوائیں پیڑوں میں اُلجھ اُلجھ کر اودھم مچارہی تھی۔ اگر یہ ساری آوازیں تھم جاتیں تو فضا بالکل ساکت، خاموش اور پر سکون ہو جاتی مگر ہوائیں فضا کو پُر شور کر رکھا تھا۔" (۱۳)

سحر یوسفزئی نے اپنے افسانوی مجموعے "آگ اور سائے" میں قبائلی علاقاجات اور بالخصوص وادی سوات کے حسین اور دلفریب مناظر پیش کئے ہیں۔ خیبر پختونخوا کے شمال میں واقع وادی سوات دلہن کے ماتھے پر سجے جھومر کا منظر پیش کرتی ہے۔ رنگ برنگ قدرتی پھولوں کے تختے، اخروٹ اور سیب کے جھومتے ہوئے درخت اور مکئی کے لہلہاتے کھیت خوبصورت منظر کشی کو جنم دیتے ہیں، دریاں کا مدبھرا شور اور دھوپ کی تمازت میں چاندی کی مانند چمکتی برف سب مل کر انسان کو مسحور کر دیتے ہیں اور دل کو ٹھنڈک اور دماغ کو فرحت و سرور بخش دیتے ہیں۔

یہ علاقہ دریائے سوات کے کنارے کنارے فطری مناظر کے لحاظ سے کاغان سے بہت زیادہ خوب صورت اور میدانوں کی شادابی کی وجہ سے کشمیر ثانی ہے۔ یہاں قدرتی جھیلیں ہیں، دریائے سوات سے ہر سو نکلے ہوئے ندی نالے ہیں، سر سبز کھیتوں میں جابہ جا خوب صورت پھول کھلے ہوئے ہوتے ہیں، پہاڑوں پر برف کی رنگارنگ چٹانیں نظر آتی ہیں، جن میں طرح طرح کے پھول اور پھلوں کے درخت و پودے ہیں۔ دور سے پہاڑوں پر برف کے چھوٹے چھوٹے گلیشیئرز کا سہانا منظر اور مانکیال پہاڑ کی ۱۸۰۷۵۰ فٹ بلندی پر سورج کا طلوع و غروب ہونا، رات کی خاموشی اور ستاروں کا

جھرمٹ سوات کے وجدانی مناظر ہیں۔ گرمیوں میں یہاں مون سون ہواؤں کے اثرات نہیں ہوتے جس کے باعث یہاں کا موسم خشک اور معتدل رہتا ہے۔ خاص کالام کی ایک انفرادیت یہ ہے کہ دن کے وقت یہاں تیز ہوائیں چلتی ہیں اور شام کے وقت یہ ہوائیں رک جاتی ہیں۔ لہٰذا دن کے وقت گرمی اور رات کے وقت سردی کا قطعی احساس نہیں ہوتا۔
خیبر پختون خوا کا ایک اور حقیقت نگار افسانہ نویس اشر آف حسین احمد جنہوں نے بڑی چابکدستی سے اپنے افسانوں میں معاشرتی موضوعات کو شامل کیا ہے۔۔ان کے ہاں شہری زندگی کی جھلک بھی ہے اور دیہاتی زندگی کے نقش گری بھی۔ وہ شہروں سے دیہات اور دیہات سے شہروں کی طرف اپنا سفر تخیّل جاری رکھتے ہیں۔ ہر دو زندگیوں کے مسائل وہاں کی معاشرتی جھلک اور خاص کر دیہات کی منظر نگاری کو اپنے افسانوں میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ اپنے علاقائی حسن اور دیہات میں موجود ثقافتی روایات کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے افسانہ ''مِس اَپ'' میں تھائی لینڈ کے ایک دیہاتی علاقے اور سرسبز وشاداب پہاڑی سلسلے کی خوبصورتی کو بہترین الفاظ میں اپنے افسانے میں بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو افسانہ ''مِس اَپ'' سے یہ اقتباس۔

> " آگے بہت آگے، جہاں بلند وبالا پہاڑ تھے اور اُنچے اُنچے پہاڑوں پر چیڑھ، دیار، شاہ بلوط اور تنک کے گھنے پیڑ تھے، مہکتی ہوئی اٹھکیلیاں کرتی ہوا تھی۔ گھنے درختوں کی گھنیری چھاؤں تھی، بجتے ہوئے نقرئی جھرنے تھے، بل کھاتی گنگناتی ندیاں تھیں، موجیں مارتے ہویءدریا تھے اور پھیلا ہوا جنگل تھا اور جنگل میں درختوں کی ہری بھری ٹہنیوں پر ننھّی منّی چڑیاں کدکڑے لگا رہی تھیں، پھدک رہی تھیں اور سبز مونگیا دو شالوں میں لپٹی شاخوں پر کوئلے کوک رہی تھیں، فاختائیں کوکو، کی صدائیں بلند کر رہی تھیں، اور چرندے چر رہے تھے اور درندے جیسے چرواہیں بنے بانسری کی مدبھری دھنوں پر الوہی نغمے بکھیر رہے تھے اور برگد کی گھنی ٹھنڈی چھتنار اور جھومتی لمبی جٹاؤں کے بیچ ایک لاڈلا شہزادہ بیٹھا تھا۔ "(۱۴)

اشر آف حسین احمد نے بیشتر افسانوں میں علاقائی ثقافت اور یہاں کے تہذیب وتمدن کو پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ دیہاتی مناظر، پُرپیچ وادیوں اور فلک بوس پہاڑوں اور جنگلات کے مناظر کو اپنے افسانوں میں سمونے کی بھرپور سعی کی ہے۔ افسانہ ''مِس اَپ'' میں بھی وہ اپنی بچپن کے وقتوں کو یاد کر کے اس وقت وہ دوسرے بچوں کے ساتھ جو کھیل کھیلا کرتے تھے ان کا ذکر کرتا ہے۔ وہ جن کھیلوں کا ذکر کرتا ہے وہ یہ ہیں۔ گلی ڈنڈا، چیندرو، توپ ڈنڈا، مایا گولی، کبڈی، چھپن چھپ، لیچنا پر میچنا اور پتنگیں اُڑانا۔ پشتونوں کے اکثر علاقوں میں یہ کھیل کھیلے جاتے ہیں جبکہ خٹک ڈانس بھی پشتونوں میں اتنا مقبول ہے کہ یہ نہ صرف خٹک لوگ کرتے ہیں بلکہ عام پشتون معاشرے میں بھی یہ

رقص کیا جاتا ہے اور لوگ اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔اشر آف حسین احمد کے افسانوں میں ایک طرف پشتون دیہاتی عورتوں کی زندگی کا عکس ملتا ہے تو دوسری طرف اس معاشرے کی اعلیٰ سوسائٹی کی عورتوں کے بودوباش کے نقوش بھی ملتے ہیں۔ایک طرف گاؤں کی مجبور و مقہور عورتیں ہیں جو زندگی کے گرم و سرد سہہ کر بھی خاموش رہتی ہیں جن کی زندگی پشتونوں کے رسم ورواج پر قربان ہو جاتی ہے اور گھر کی چار دیواری سے صرف گھاس کاٹنے اور جانور چرانے یا لکڑیاں لانے کے لیے باہر قدم رکھتی ہیں۔ دیہاتی لڑکیاں تو شادی سے پہلے ماں باپ اور بہن بھائیوں کی خدمت کر کے گویا شادی کے بعد کی زندگی کے لیے تربیت حاصل کرنے کا مشق کرتی ہیں اور شادی کے بعد اپنے تجربے کو وسعت دینے میں گزارتی ہیں۔ان کی زندگی میں تفریح نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی بلکہ تفریح تو ان کے لیے گناہ کا درجہ رکھتا ہے۔اگر کہیں کسی شادی بیاہ میں جانے کا موقع بھی ملتا ہے تو عورتوں کی مخصوص محفل تک میں بھی ناچ گانے کا شوق پورا نہیں کر سکتی۔اگر ایک لڑکی ایسا کرتی ہے تو اُسے کنجری اور بے حیا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔شادی سے پہلے بناؤ سنگھار پر اُسے مشکوک نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔

طاہر آفریدی نے خیبر پختون خوا کی معاشرتی زندگی، لوگوں کے رہن سہن، رسوم ورواج اور قبائلی بود و باش کی صحیح ترجمانی کی ہے۔ان کے افسانوں میں یہاں کی تہذیب اور روایات وحکایات کی جھلکیاں ہی نہیں ملتیں بلکہ ان سنگلاخ چٹانوں میں بسنے والوں کے جذبات و احساسات کے عکّاسی بھی ملتی ہے۔طاہر نے اپنے افسانوں میں پشتون معاشرت کی عکاسی اپنے بھرپور انداز میں کرتے ہیں کہ زندگی کے حسن و قبیح کے سارے رنگ نکھر آتے ہیں۔طاہر آفریدی کے افسانوں میں پشتون دیہاتی زندگی کا پورا منظر سامنے آتا ہے جو لوگ پشتون معاشرت سے واقفیّت رکھتے ہیں اُنہیں ان کی کہانیوں میں حقیقی زندگی رگ جاں کی طرح نظر آتی ہے۔طاہر کے دیہاتی ماحول کے پس منظر میں لکھے گئے افسانوں میں انہوں نے یہاں کے پہاڑ، دریاؤں اور سبزہ زاروں کو بہت عمدہ اور دل کش انداز میں برتا ہے۔ان کے افسانہ ”متاع جاں“ میں انہوں نے ”پیتاو“ اور ”سیرل“ نامی پہاڑوں کا ذکر کیا ہے اور ان کی لفظی عکس بندی دل فریب انداز میں کی ہے۔

> "سامنے اُنچے پیتاو نامی پہاڑ کی ایک اُنچی چوٹی کے بالکل قریب ایک گڈریا اپنے بکریاں چرا رہا تھا اور ساتھ ہی گا بھی رہا تھا اور بانسری بھی بجا رہا تھا۔دوسری طرف بائیں ہاتھ پر سیرل نامی پہاڑ جو سب سے اُنچا تھا اور گاؤں والوں کے لیے فخر وعزّت کا نشانہ تھا اس پر اب تک سورج کی روشنی نہ آئی تھی، وہاں پر کچھ ٹھنڈک کا احساس ہو رہا تھا۔اس پہاڑ کے دامن میں ایک ٹھنڈا اور میٹھے پانی کا چشمہ بہ رہا تھا۔جہاں گرمیوں میں خاص طور پر گاؤں کے مویشیوں کے ساتھ بوڑھے، جوان اور بچّے ڈیرہ جمائے رہتے تھے۔"(۱۵)

منظر کشی کے بغیر افسانہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ افسانہ نگار کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے افسانے میں مقامی رنگ کو زیادہ پیش کرے، مقامی رنگ کے افسانے خیبر پختونخوا کی افسانہ نگاری کے ہر دور میں لکھے گئے اور ہر دور میں یہ رجحان افسانے کے معنوی اور صوری ترقی کا ضامن بنا۔ طاہر نے اپنے افسانوں کو خوبصورت وادیوں، اُنچے پہاڑوں اور گنگناتے دریاؤں کے منظر کشی سے مزیّن کیا ہیں۔ ماحول کے تصویر کشی میں طاہر کو کمال حاصل ہے۔ وہ کہانی کے مزاج کے مطابق ماحول کا ایسا نقشہ پیش کرتے ہیں کہ قاری کا ذہن اس فضا سے مانوس ہو جاتا ہے۔ اکثر کہانی کے ابتداء میں جو ماحول پیش کیا جاتا ہے اس سے کافی حد تک قاری کو کہانی کے مزاج کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ طاہر آفریدی کے افسانہ "متاعِ جاں" کی نوری کو پشتون معاشرے کے اسی رویے کا سامنا ہے۔ پشتون معاشرے میں نوری اور اس طرح کی دوسری لڑکیوں کو اپنے آباؤاجداد کی ان رسوم کو قبول کرنا پڑتا ہے۔ ان کے والدین ان سے پوچھے بغیر کسی کو زبان دے کر ان کی تمناؤں اور آرزؤں کا خون کر دیتے ہیں۔ یہ مجبور و مقہور لڑکیاں اس رسم کے آگے بے بس ہوتی ہیں۔ وہ اس زبردستی کے جواب میں اپنی مرضی کا کوئی راستہ نکالنے کا سوچ بھی نہیں سکتیں کیونکہ ایسا کرنے کے بعد انہیں زندگی تک سے محروم ہونا پڑتا ہے۔

(پ)۔ حسن موسم:

قدرت نے کمال فیّاضی کے ساتھ خیبر پختون خوا کو چار موسموں سے نوازا ہے۔ جہاں چند میدانی علاقوں کے علاوہ موسم سال کے بیشتر مہینوں میں معتدل اور خوشگوار رہتا ہے۔ سال کے درمیانی مہینوں میں صوبے کے میدانی علاقوں مین گرمی جبکہ اوائل سال میں پہاڑوں پر شدید برف باری کی وجہ سے یخ بستہ ہوائیں چلتی ہیں۔ سونا اُگلتی میدانی علاقوں کی زرخیز زمین پر لہلہاتے فصلوں، ٹھاٹھیں مارتے دریاؤں، اور فلک بوس و برف پوش پہاڑوں، گنگناتے آبشاروں اور چیڑ و چنار کے گھنے جنگلات کو یہاں کے افسانہ نگاروں نے اپنے تخلیقات میں کمال مہارت کے ساتھ برتا ہے۔ خزاں ہو کہ بہار، پت جڑ و برسات کے موسموں کی منظر کشی سے اپنے افسانوں کو نکھار بخشا ہے۔ طاہر آفریدی کے افسانے "متاع جاں" میں موسم بہار کا ایک خوب صورت منظر ملاحضہ ہو۔

> "موسم بہار گزر چکا تھا مگر آس پاس پہاڑوں پر بہار کے آثار ابھی تک باقی تھے۔ موسم بہار میں ان پہاڑوں پر اور پوری وادی پر ان کا اپنا قدرتی رنگ آجاتا ہے، اوران پر ہر طرف ہریالی ہی ہریالی چھا جاتی ہے۔ جنگلی پھول ہر طرف مسکراتے ہیں۔ یہ پھول ہر صبح اس وادی اور پہاڑوں پر اپنی خوشبو بکھیرتے، بوٹی جھاڑیاں اوردرخت سب کے تنوں سے خوشبو کے چشمے پھوٹ پڑتے ہیں۔ گھاس زمین کے سینے پر سبز رنگ کے خوب صورت قالین کی مانند بچھ جاتی ہیں جس پر بھیڑیں اور بکریاں چھلانگیں مارتی اُچھلتی کھودتی ہیں۔ پرندے قسم

قسم کی بولیاں بولتے ہیں۔ تیتر۔بٹیر۔بُلبُل۔کالے طوطے اور دیگر پرندے فضاء میں خوشیوں کے نغمے گاتے رہتے ہیں چکور اُنچی چوٹی پر چڑھ کر چکوروں اور دیگر پرندوں کو لڑنے کا چیلنج دیتے رہتے ہیں۔"(۱۶)

خیبر پختونخوا کے دیہی علاقہ جات میں طرح طرح کے رویے ملتے ہیں۔ بعض علاقوں میں عورتوں سے امور خانہ داری کو نمٹانے کے علاوہ کوئی اور کام جیسے کھیتی باڑی، مویشی چرانے میں مدد لینا پشتونولی کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔اس قسم کا پشتون ولی کا مثبت رویہ رکھنے والے لوگ امیر ہوں یا غریب عورتوں کا چاردیواری سے باہر کام کرنے کو معیوب سمجھتے ہیں۔مثبت رویہ رکھنے والے لوگ خود بوجھ برداشت کرلیتے ہیں لیکن عورتوں پر بوجھ ڈالنا مناسب نہیں سمجھتے جبکہ اکثر پہاڑی علاقوں کے لوگ امیر ہوں یا غریب ان کی عورتیں ان کے ساتھ ہر قسم کا بوجھ اٹھانے میں چاروناچار ہاتھ بٹاتی ہیں۔وہ اپنے مردوں کو سہولت دینے کے لیے ان کے ساتھ کھیتوں میں مصروف کام کرتی ہیں، جانوروں کو پالنا انہی کا کام ہوتا ہے اور امور خانہ داری کو بجالانا بھی ان کے سُپرد ہوتا ہے۔

طاہر آفریدی کے افسانہ ''متاعِ جاں''میں پشتونوں کی دیہاتی زندگی کے اسی رُخ کو پیش کیا گیا ہے۔اس افسانے میں نوری کے ہاتھ میں درانتی ہوتی ہے۔ وہ اپنے خاندان کے دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر فصل بھی کاٹتی ہے جس سے اس کے نرم ونازک ہاتھ محنت طلب کام کرکے سخت اور کھردرے ہو جاتے ہیں۔

"نوری درانتی زمین پر پھینک کر یوں غیر ارادی طور پر اُٹھ گئی۔ جیسے کوئی اہم بات یا کوئی خاص کام یاد آ گیا ہو۔کمر سیدھی کرتے ہوئی ایک لمبی انگڑائی لی اور چاروں طرف نظر گھما کر اُونچے اونچے پہاڑوں کو دیکھنے لگی۔"(۱۷)

یہاں کے دیہی علاقوں میں عورتوں کا گھر کے کام کاج کے علاوہ، کیتھی باڑی کے کام، جانور پالنے اور سنبھالنے ان کے لیے کھیتوں، پہاڑوں سے چارہ لانے تک کی ذمہ داری ہوتی ہے۔اور ایسی ہی ذمہ دار خواتین کو معاشرے میں قدرو منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔افسانہ نگار نے اپنے کئی افسانوں میں ایسے خوبصورت وخوبرو دوشیزاؤں کو کھیتوں ،پہاڑوں اور چراگاہوں میں درانتی تھامے بھیڑ بکریاں چراتے اور چارہ کاٹتے دکھائے ہیں۔افسانہ "پگڑی" کی گلنار بھی اسی قسم کی ایک محنت کش دیہاتی لڑکی ہے۔

خیبر پختون خوا کے پہاڑی علاقہ جات میں موسم بہار کے رنگ خاص طور پر قابل دید ہوتے ہیں۔مارچ اپریل کے مہینوں میں آمد بہار کی وجہ سے ہر سوں ہریالی نظر آتی ہے۔نئے پھول کھلتے ہیں اور اس کی بھینی بھینی خوشبوں سے سارہ ماحول معطر ہوتا ہے۔ نیلگوں پانی کی بہتے آبشاروں سے ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہے۔افسانہ نگار نے فنی مہارت کو بروئے کار لاتے ہوئے بہترین الفاظ کا استعمال کرتے ہوے یہاں کی دیہی معاشرت کی عکاسی کی ہیں۔

خیبر پختون خوا کے ڈیرہ اسماعیل خان سے تعلق رکھنے والی پروفیسر صفیہ بشیر گنڈاپور نے اپنے افسانہ ''زرغونہ'' ضلع چارسدہ کے ایک دیہات کی موسم سرما کا ذکر کرتے ہوئے یہاں کے وسیع و عریض کھیت، پھلوں کے باغات اور سرسبز و شاداب نواحی علاقوں کی منظر کشی بہترین انداز میں کی ہے۔

"وہ اوائل سرما کی خوب صورت دن تھے۔ ہوا میں ٹھنڈک اور خوشگوار خنکی تھی۔ ہماری گاڑی ہموار سڑک پر تیزی سے جارہی تھی۔ اطراف میں آملوک، خوبانیوں اور آلوچوں کے باغات پھیلے ہوئے تھے۔ درخت سُرخ سُرخ پکے ہوئے آملوکوں کے بوجھ سے جھکے ہوئے تھے۔ جیسے سبز سبز پتّوں میں لاتعداد قمقمے روشن ہو۔ ساتھ ساتھ پانی کی چھوٹی بڑی نہریں تھیں۔ ہر طرف پانی، سبزہ، درخت، پھل، پھول، نیلا شفاف آسمان اور وسیع و عریض کھیت یہ چارسدہ کا سرسبز و شاداب نواحی علاقہ تھا۔ جگہ جگہ قدرتی نظاروں کے بُہتات تھی۔" (۱۸)

صفیہ بشیر ادب برائے زندگی کے قائل ہے اور انہوں نے اپنے آفسانوں میں جدید دور کے روزمرہ مسائل کے ساتھ ساتھ معاشی مسائل کو بھی شامل کیا ہے۔ اس طرح لکھا کہ قاری کا دیہان افسانہ پڑھتے پڑھتے زندگی کے حقائق کی طرف خود بخود ہو جاتا ہے۔ اس افسانے کے ابتدائیہ میں صفیہ نے عمدگی سے دیہات کی موسم سرما کی منظر کشی کی ہے اور گردونواح کو بہترین انداز میں صفحہ قرطاس پر منتقل کیا ہے۔

مظہر گیلانی کے افسانوں نے بھی صوبہ خیبر پختون خوا میں اس صنف کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اُردو ادب کا استاد ہونے کے ساتھ ساتھ انہوں نے افسانوی دنیا میں بھی اپنی استادانہ مہارت کا سکّہ جمانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اگرچہ ان کے افسانوں میں داستانوی رنگ نمایاں ہیں لیکن کہانی کا مرکزی کردار یا اساسی واقعہ ہمارے روزمرّہ زندگی ہی سے لیا ہے۔ مظہر کی خوبی یہ ہے کہ وہ الفاظ کے ذریعے چند جملوں میں ایسے نقش و نگار بناتے ہیں کہ قاری کردار کی اندرونی دنیا میں جھانک کر جذبوں کی گہرائی اور ماحولیاتی منظر کی گہرائی تک پہنچ جاتا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانہ ''بد نصیب سارہ'' میں بخارہ کی ایک دیہاتی ماحول اور خوشگوار صبح کو بہترین الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"آسمان صاف تھا۔ بادِ نسیم کے خوشگوار جھونکے مضمحل طبیعت کو گدگدا رہے تھے۔ دھلے دھلائے مخملی سبزے اور شفاف پتّوں پر سے نگاہیں پھسلی جارہی تھیں۔ جگہ جگہ سبزے پر سفید اور پیلے رنگ کے پھول ایک عجیب سماں پیدا کر رہے تھے۔ دور پہاڑوں کے اُس پار آفتاب کی آتشیں شُعائیں، پہاڑوں کی جگمگاتی ہوئی فلک چوٹیاں نکھرے ہوئے آسمان کا دل آویز رنگ اور نسیم صبح کا پتّوں سے رگڑ کھا کر لطیف آواز پیدا کرنا ایک عجیب رومان افزا سماں پیدا کر رہا تھا۔" (۱۹)

مظہر کی فنکارانہ خوبی یہ ہے کہ کہانی کی غیر فطری فضاء میں اکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا۔ کہانی کا ابتدائیہ اور ماحولیاتی منظر کشی اتنی جاذب توجہ ہوتی ہے گویا قاری عملاً وہاں موجود ہو۔ بیان اور الفاظ اتنی پُر تاثیر ہوتے ہیں گویا انکھوں دیکھا حال سُنا رہے ہو۔ ان کی زیادہ تر کہانیاں قندھار، بخارہ، مصر، مکھڈ، کیمبل پور، مکّہ معظمہ اور غرناطہ میں پروان چڑھتی ہیں۔ یوں وہ ابتداء ہی سے قاری کو اپنے صداقت کا یقین دلاتے ہیں۔ اس کے متجسس ذہن کو کہانی کے ساتھ ساتھ ذہنی سفر کرنے میں لطف آتا ہے۔ یوں قاری مکمل طور پر کہانی میں ڈوب کر معاملے کی تہہ داریوں تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا ہے۔

فہمیدہ اختر خیبر پختون خوا کے خواتین آفسانہ نگاروں میں سب سے معتبر نام ہے۔ ان کی افسانوں کی خصوصیت ان کا مقامی رنگ ہے ان کی کہانیاں زندگی کی کہانیاں ہیں۔ انہوں نے اپنی افسانوں کے ذریعے پشتون معاشرت، تہذیب و روایات اور اقدار سے ملک کے دوسرے علاقوں کے لوگوں کو روشناس کرانے میں اہم خدمات انجام دی ہیں۔ فہمیدہ اختر کو مری، نتھیا گلی اور قبائلی علاقہ جات کی جنّت نظیر وادیوں سے والہانہ پیار ہے۔ وہ اپنے قاری کو اپنے ہر افسانے میں حسین وادیوں کی سیر کراتی ہیں جہاں زندگی گنگناتی ہے، رومان پلتے ہیں۔ اس رومان پرور ماحول میں پلنے والی کہانیاں ان کے افسانوں کا موضوع ہیں جو کوہ سفید، شلوبھر، کھجوری، دریائے باڑہ، درہ خیبر، مولے کے پہاڑ، ٹنڈو پہاڑ اور قصّہ خوانی کے گرد گھومتی ہیں۔ خیبر پختون خوا کو اللہ تعالیٰ نے بے پناہ قدرتی حسن سے نوازا ہے۔ مناظر قدرت کی عکّاسی فہمیدہ نے بڑے دل کش انداز میں کی ہے۔ ان کے بیشتر افسانے مسحور کن منظر کشی سے شروع ہوتے ہیں۔ ''ایک ٹھنڈا نور پھیل گیا'' کی منظر نگاری ملاحظہ ہو۔

> "کئی دنوں کی بارش کے بعد سفید سفید بادل پھٹ چکے تھے اور سمٹتے سمٹتے چاروں طرف پھیلے ہوئے پہاڑوں کی چوٹیوں تک پہنچ کر یوں نظر آرہے تھے جیسے دھنکی ہوئی روئی بکھیر دی گئی ہو۔ آسمان کی نیلاہٹیں دھل کر اور نیلی ہو گئی تھیں۔ نازک اور خوش رنگ پھولوں، سرو اور چیڑ کے اُنچے اُنچے درختوں اور گاتے گنگناتے ہوئے چشموں کی بھیگی ہوئی وادی کے اُوپر روپہلی دھوپ پھیل گئی تھی۔"(۲۰)

"خانہ" انچے طبقے سے تعلق رکھنی والی ایک ایسا کردار ہے۔ جو کہ اس معاشرے میں غریب طبقے کا استحصال ہوتے دیکھ رہی ہے۔ ان کو احساس ہے کہ یہ بے کس ولاچار طبقہ گونا گوں مشکلات سے دوچار ہے۔ ان کے مصائب و تکالیف کا احساس کرتے ہوئے وہ نہ صرف ان سے ہمدردی رکھتی ہے بلکہ ان کا مداوا کرنے کا اردہ اور دوسروں کو ان میں مدد کرنے کی ترغیب بھی دلاتی ہے۔ وہ مساویانہ اور انصاف پر مبنی معاشرے کی تشکیل کی خواہاں ہے۔

"رائے بیل، کرنے ،گنڈیری، گلاب ،چنبے کی کلیوں سے ان کی کہانیاں مہکتیں اور سیبوں ،ناشپاتیوں اور نارنگیوں کے پیڑوں تلے پروان چڑھتی ہیں۔ان افسانوں کی ہیروئنیں بھی قدرتی مناظر کا ایک شاہ کار حصّہ معلوم ہوتی ہیں۔جب تھک جایا کروں گی تو سرو اور چیڑ کے شاداب درختوں میں دوڑتے بھاگتے اور اچھے گیت گاتے گاتے کسی مترنم چشمے کے کنارے رنگ برنگ کے تازہ پھولوں کی شبنمیں چادر پر لیٹ جایا کروں گی۔چشمے کا ترنم ------ یہ دل کش لوری ----- اور غم ناک ہوا کے جھونکے ---- یہ نرم اور نازک تھپکیاں ---- پھر میں بڑے اطمینان سے سوجایا کووں گی۔"(۲۱)

یہ رومانوی ماحول پشتو شاعری کے لیے بہت موزون ہے۔ٹپہ پشتو ادب اور کلچر کی جان ہے۔ان ٹپوں کے ذریعے پشتون ثقافت کے بہت سے پرت سامنے کھلتے ہیں۔ فہمیدہ نے اپنے افسانوں میں جابجا ٹپے استعمال کئے ہیں۔ گو یہاں کہانی کی رفتار سُست پڑجاتی ہے اور ٹپے نذیر احمد کے محاوروں کی طرح بوجھل محسوس ہوتے ہیں۔ لیکن قاری کے ذہن پر خوش گوار تاثر چھوڑتے ہیں۔

(ت)۔زراعتی حسن:

خیبر پختون خوا کا بیشتر حصّہ دیہات پر مشتمل ہے۔ جہاں پر لوگوں کا ذریعہ معاش زراعت سے وابستہ ہے، کھیتی باڑی، باغبانی اور مال مویشی پالنے ہی سے زیادہ تر کھروں کے چولھے جلتے ہیں۔ تقریباً ۸۰ فیصد علاقہ دیہات پر مشتمل ہے اور یہاں کے باسی زراعت سے وابسطہ ہیں۔ادیب و افسانہ نگار چونکہ معاشرے کی آنکھیں ہوتی ہے وہ بڑی باریک بینی سے معاشرے کا جائزہ لے کر معاشرتی معائب و محاسن کو مختلف انداز میں اپنے تخلیقات میں قاری کے سامنے پیش کر کے اُن کا حل ڈھونڈنے کی سعی کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں بیشتر اُردو افسانہ نگاروں نے اپنے موضوعات و کردار اسی معاشرے سے چُن کر پیش کی ہیں۔ یہاں کے تہذیب و ثقافت ،رہن سہن، بودوباش، مصائب و مشکلات اور غمی خوشی غرض ہر پہلوئے زندگی کی عکاسی بہترین انداز میں کی ہے۔ خیبر پختون خوا کے افسانہ نگاروں نے یہاں کے حسین مناظر کو عمدگی سے صفحہ قرطاس پر اُتارے ہیں۔ان کے افسانوں میں دیہات کے دل فریب مناظر اور حسن کبھی منظر اور کبھی پس منظر کا کام کرتا ہے۔

طاہر آفریدی اپنے آفسانوں میں پشتون معاشرت کی عکّاسی ایسے بھرپور انداز میں کرتے ہیں کہ زندگی کے حسن و قبیح کے سارے رنگ نکھر آتے ہیں۔وہ ایک ماہر نبض شناس کی طرح معاشرے کی دُکھتی رگ پر ہاتھ نہیں رکھتے بلکہ مرض کی تشخیص اور علاج کے گُر بھی جانتے ہیں۔اپنے ہر افسانے میں انہوں نے اصلاحی مقصد کو مدِ نظر رکھا ہے۔مناظر فطرت کی حسن کاری سے آفریدی کے افسانوں کی دل کشی میں اضافہ ہوتا ہے۔ان کا فطری میلان دیہات کی طرف

تھا۔ایک دیہاتی ہونے کے بنا انہوں نے دیہاتی حسن کو اپنے تحریروں مٰیں بیان کر کے زندگی کے مختلف پہلوں کی نقاب کُشائی کی ہے۔ان کے کردار محنت کش کسان ہیں جو اپنے خونِ جگر سے دھرتی کو سینچتے ہیں۔طاہر کے افسانوں میں دیہاتی زندگی کے تمام پہلوں نمایاں انداز میں پیش کئے گئے ہیں۔"ایک تھا گاؤں"اور"گل شو"میں دیہاتی زندگی کی بھرپور ترجمانی کی گئی ہے۔

"محنتی انسان مشقت کے بعد ذہنی آسودگی کے لیے تفریح چاہتے ہیں۔یہی صحت مند رجحان ہمیں طاہر کے دیہاتی ماحول میں ملتا ہے۔دیہاتی زندگی کے شب و روز، رہن سہن، رسوم و رواج، طرز زندگی، مختلف اہم مواقع، خوشی و غم، خوشحالی و آسودگی، بدحالی و خستگی، کُشادگی و تنگدستی، اچھائی برائی ہر پہلو کی عکاسی ایسی جامعیّت کے ساتھ کی گئی ہے کہ کوئی پہلو تشنہ نہیں رہتا۔گاؤں کا دستور تھا کہ جب فصل تیار ہو جاتی تو زمین پر ہی اس کی تقسیم ہوتی تھی۔سب سے پہلے دسواں حصّہ عُشر ادا نہ کیا جائے تو غلّے میں کیڑا اور گھن لگ جاتا ہے اور نقصان کے ساتھ ساتھ شرمندگی بھی ہوتی ہے۔پھر حجّام بھی اپنا محنتانہ ہر فصل پر آکر لے جاتا ہے۔اسی طرح ہل درانتی، کُدال اوع کھیتی باڑی کے دیگر اوزار بنانے والے ترکھان بھی آکر اپنا حصّہ لے جاتے ہیں۔باقی جو بچ جاتا ہے اُس میں بھی کچھ خدا کے نام کی خیرات کر دی جاتی ہے کہ اسی کے فضل و کرم سے ہمیں اچھی فصل نصیب ہوئی۔"(۲۲)

افسانہ "گل شو" میں افسانہ نگار نے یہاں کے دیہی معاشرے کی بے لوث اور بے غرض محبت کی ایک جھلک دکھائی ہے۔اس افسانے میں صندل کا باپ مر جاتا ہے اور وہ یتیم ہو جاتا ہے۔اسی گاؤں کا ایک خدا ترس آدمی کاکا خوشحال ان دونوں ماں بیٹے کو اپنے ہاں لے جاتا ہے۔وہ ان کی جائیداد کی حفاظت بھی کرتا ہے۔کاکا خوشحال کی بیٹی گل شو اور صندل ایک ہی گھر میں پرورش پاتے ہیں اور ایک ساتھ زندگی گزارتے ہیں۔دونوں ایک دوسرے کو چاہتے بھی ہیں لیکن دونوں ہی اپنی محبت کا اظہار نہیں کر پاتے۔ایک دن صندل کو پتہ چل جاتا ہے کہ اس کی ماں اُس کے لیے اچھی سی لڑکی کی تلاش میں ہے۔اُسے اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ کیوں اس کی ماں دوسری لڑکیوں کو تلاشتی ہے۔وہ اپنے ہی گھر کے اندر کیوں نہیں دیکھتی۔مگر ان دلی جذبات اور گل شو سے محبت کے باوجود وہ اپنی ماں سے گل شو کے متعلق کچھ کہہ نہ سکا۔کچھ کہنا تو دور کی بات ہے وہ ایسا سوچتے ہوئے بھی خوف محسوس کرتا ہے وقت گزرتا ہے اور صندل کے احساسات میں بھی تبدیلی آتی ہے۔جب گل شو اس کے لیے کھیت میں روٹی لاتی ہے تو وہ دیر تک اسے دیکھتا رہتا ہے لیکن گل شو بھی تو ایک پشتون لڑکی ہے وہ بھی کسی مرد کا اس طرح سامنا نہیں کرتی۔یہی وجہ ہے کہ صندل کے اس طرح دیکھنے پر گل شو کی حالت کچھ اس طرح ہو جاتی ہے ایک معاشرہ اتنی سخت جکڑبندیوں کا شکار ہو تو اس میں محبت کرنا تو دور کی بات ہے محبت

کا تصور بھی ناممکن ہو جاتا ہے۔ ایسے معاشرے میں پلنے بڑھنے والے جوانوں کے دل اندر ہی اندر سلگتے رہتے ہیں لیکن وہ محبت کے اظہار کے لیے ایک لفظ بھی زبان پر لانے کی جرأت نہیں کر پاتے۔ گل شو کی شادی کے دن صندل کی اداسی اور کھیت میں کام کرنے کے منظر کو طاہر نے بہت عمدگی سے بیان کیا ہے۔

"بغیر سوچے سمجھے وہ کدال چلا رہا تھا یا فصل کی گوڈی، کدال چلانے کی ضرورت تھی یا بیلچہ چلانے کی۔ بس وہ سر جھکائے خود کو مصروف رکھے سوئے تھا۔ جب اس کی ماں دوپہر کی روٹی لے کر آئی تو بھی اس نے ماں سے کوئی بات نہ کی اس کی ماں نے چاول بھری تھالی اس کے سامنے رکھی جس کے درمیان گھی کا ایک کٹورہ رکھا تھا۔ صندل نے بیدلی سے کھانا شروع کر دیا۔ اس کے کانوں میں گاؤں سے آنی والی ڈھول سُرنا کی آوازیں آرہی تھیں۔ پھر گولیوں کی آواز بھی شامل ہو گئی۔ ڈھول سرنا اور تیز ہوا۔ گانے کی لے اور رقص کی تال اور تیزی آئی۔ صندل کو ایسا لگا جیسے اس کے کانوں میں برمے چل رہے ہیں اور گولیاں، وہ جیسے اس کا سینہ چھید رہی ہیں۔"(۲۳)

افسانہ نگار نے دیہی معاشرت میں روایت کی پاسداری اور پختون دوشیزاؤں کے ساتھ ساتھ جوانوں کی حیا اور پشتونولی کے روایات پر عمل کرنے کو بھی عیاں کیا ہے کہ کس طرح یہاں کا جوان نسل محبت کو قتل ہوتے ہوئے دیکھ کر بھی یہ جراءت نہیں کرتے کہ اس کا اظہار کر سکیں۔ طاہر آفریدی نے اپنے کرداروں کو یہاں کے معاشرت کی بہترین عکاسی کرتے ہوئے دکھایا ہے جوان اور کسانوں کو کھیتی باڑی، ہل و کدال چلاتے، اور کبھی حجروں میں گپیں اور روایتی ٹپے و رباعیاں الاپتے دکھائے ہیں۔

سحر یوسف زئی نے اپنے افسانوں میں یہاں کے باسیوں کی اقتصادی بدحالی، توہم پرستی، معاشرتی و معاشی مسائل اور مجبوریوں کے بیان کے ساتھ ساتھ یہاں کے کسان، کھیت کھلیان اور لہلہاتے فصلوں کا تذکرہ بھی بڑے بلیغ انداز میں کیا ہے۔ پڑھنے والے حسین برف پوش پہاڑوں، سرسبز و شاداب زمینوں، بہتے جھرنوں اور کھنکتی آبشاروں سے مانوس ہو جاتے ہیں اور چاندنی کی ٹھنڈک کو اپنی روح کے گہرائیوں میں محسوس کرنے لگتے ہیں۔ سرسوں اور گیہوں کے فصلوں کے علاوہ خوبانی و ناشپاتی کے باغات، پھل پھول اور سبزہ زاروں کے حسین مناظر سے قاری کا دل لبھانے کی خوب مہارت رکھتے ہیں۔

"بہار کی آمد آمد تھی، برف کھیتوں پر سے ہٹ چکی تھی۔ گیہوں بڑھنے لگا تھا۔ سرسوں میں پیلے پیلے پھول آنے لگے تھے۔ اِکاّ دُکاّ خوبانیوں اور باداموں میں پھول کھل گئے تھے۔ سرور، داود خان کے ساتھ بہت سے

آدمیوں سمیت پہاڑ پر چڑھ رہا تھا اس نے ایک بار مُڑ کر دیکھا تو اُسے وادی ہری پیلی بہت ہی خوب صورت معلوم ہوئی نیچے گاؤں میں بچّے اور عورتیں چھتوں پر چڑھے ان کو اوپر چڑھتا ہوا دیکھ رہے تھے۔"(۲۴)

سحر اپنے افسانوں میں مناظر فطرت کی بہترین عکاسی کر کے قاری کو بوریت اور اکتاہٹ کا شکار ہونے سے بچاتا ہے۔ان کے افسانوں میں تخیل کی بے جا رنگ آمیزی بھی منظر کشی کا روپ دھار کر سامنے نہیں آتی بلکہ اس سے پلاٹ کی توانائی اور کشش بڑھ جاتی ہے۔ان کی کہانیاں خیبر پختون خوا کے شمالی علاقہ جات کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ان علاقوں کو رب کائنات نے بے پنا حسن عطا کیا ہیں۔مصنف اپنے قاری کو ان حسین مقامات کی سیر کراتا ہے جہاں کے سرسبز وشاداب میدانوں ،برف پوش پہاڑوں ،نیلگوں پانی کی جھنکار اور یخ بستہ ہواؤں کو اپنے روح کی گہرائیوں میں محسوس کرنے لگتا ہے۔

سیّدہ حنا کے افسانہ ''دھوپ''میں بھی عادل ؔ کی منگنی رانی سے ہو جاتی ہے وہ تو بہت خوش ہوتا ہے لیکن اپنی اس زندگی سے مطمئن نہیں ہوتا۔اس کی رگوں میں جواں خون گردش کر رہا ہے۔اُسے فوجی زندگی بہت پسند ہوتی ہے اس لیے کہ وہ اپنے ملک و وطن کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتا ہے۔لیکن اس کا باپ اسکی ان تمناؤں سے بے خبر اُس کا سہرا باندھ کر دُلہن لانے کے خواب دیکھ رہا ہے۔وہ اپنے باپ پر اپنا نقطۂ نظر واضح کئے بغیر گھر سے چلا جاتا ہے۔اس عرصے میں کشمیر کی جنگ بھی چھڑ جاتی ہے۔عادل کا پتہ نہیں چلتا کہ وہ کہاں گیا،زندہ ہے یا مردہ،اس کے متعلق متضاد افواہیں سننے میں آ رہی ہوتیں ہیں۔کسی کا کہنا ہے کہ اُسے آزاد کشمیر کی فوج میں کمیشن مل گیا ہے اور وہ کشمیر جنت نظیر کو غاصبوں کے قبضے سے آزاد کرانے کے لیے کشمیری بھائیوں کے دوش بدوش جدوجہد میں مصروف ہے۔کوئی یہ بھی کہتا ہے کہ وہ دشمن کی قید میں ہے۔بعض یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ شہید ہو گیا ہے۔اس کے والد کا تو یہ خیال تھا کہ اگر وہ زندہ ہوتا تو اس کا پتہ ضرور چل جاتا۔اس لیے تو باپ اس کے غم میں مر جاتا ہے اور اس کے گھر والے بھی اس کی جدائی کے صدمے برداشت کرتے ہیں۔آخر ان کے دل کو بھی قرار آ جاتا ہے۔کافی عرصہ گزر جاتا ہے لیکن اس کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔ہوتے ہوتے جب کشمیر کی جنگ ختم ہو جاتی ہے،جنگ میں حصّہ لینے والے جوانوں کو تمغوں اور اعزازات سے نوازا جانا سن کر اپنا عادل بھی یاد آ جاتا ہے کہ اگر وہ زندہ ہوتا تو شاید آج اس طرح کے تمغے اس کے کندھوں پر بھی سجا دیئے جاتے۔اس کے گھر والے شدید سردی میں آگ تاپ کر گرم ہونے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن سردی کی شدت ہے کہ کم ہونے کا نام نہیں لیتی۔اچانک انہیں بھاری قدموں کی آہٹ سنائی دیتی ہے۔ان کی نظریں دروازے پر ہیں اچانک انہیں عادل دکھائی دیتا ہے۔جو فوجی ڈریس میں ملبوس اعزازی تمغے لگائے ان کے سامنے آن کھڑا ہو جاتا ہے۔ان کی یہ اچانک خوشی ناقابل

بیان ہے۔ وہ یہ ٹھٹرتی سردی بھول کر اپنے عادل میں محو ہو جاتے ہیں۔ ان کی حیرت اور خوشی کی انتہا نہیں ہے۔ بھولا بسرا عادل ایک فوجی اعزاز یافتہ افسر کی صورت میں ان کے سامنے ہے۔

حب وطن کی درس پر مبنی اس افسانہ میں جوان نسل کو وطن پاک سے محبت اور اس پر فدا ہونے کی ترغیب دلائی گئی ہے۔ اس طرح کا جوان نہ صرف اپنے والدین اور خاندان کے لیے بلکہ پوری قوم کے لیے سرمایہ افتخار ہوتا ہے۔

افسانہ ''پچھتاوا'' میں عاشہ کی عصمت و عفت زر بخت نامی شخص کے ہاتھوں نیلام ہو جاتی ہے۔ عاشہ کے والدین کے انتقال کے بعد وہ بھابیوں کے خود غرضانہ برتاؤ اور بھائی بھاوجوں کی نظر اندازی کے بعد اپنے ایک چاہنے والے زر بخت کے جھانسے میں آ کر گھر سے بھاگ نکلنے پر آمادہ ہو جاتی ہے مگر زر بخت عاشہ کی محبت کی قدر نہیں کرتا بلکہ اُسے باعزت زندگی مہیا کرنے کی بجائے اُلٹا گناہ کی دلدل میں دھکیل دیتا ہے۔ اسی طرح ایک ایسی لڑکی جو اپنی ماں کے ساتھ میلاد کی محفلوں میں شریک ہوتی تھی اور محفلوں میں اگربتیاں سلگا سلگا کر عقیدت و احترام سے اپنا سر دوپٹے سے ڈھانپ کر دعائیں مانگا کرتی تھی۔ اب اس کے پاؤں میں گنگھرو ڈلوا کر سرعام نچوایا گیا۔ افسانہ نگار نے عاشہ کی بپتی اور معاشرتی زبوں حالی کے بیان کے ساتھ ساتھ دیہی معاشرت اور گاؤں کے شام ڈھلنے کے وقت کے منظر کو بھی عمدگی سے بیان کیا ہے۔

> "شام کے ڈھلتے ہوئے ان اداس لمحوں میں اس نے کچے مکانوں کی قطار دیکھی جن سے گہرا نیلا دھواں آسمان کی طرف اُٹھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ مٹی کے چولہوں میں جلتی ہوئی لکڑیوں کی مہک اسے اپنے آس پاس محسوس ہونے لگی۔۔۔۔۔۔ اس کا ننھا ذہن اس مٹی کو ڈھونڈنے لگا جو اس کے گھر کے آنگن کے کچے فرش، گھر کے کچی دیواروں پر لپٹی ہوتی تھی اور جب کبھی ان دیواروں پر وہ چلو بھر پانی پھینکتی تو مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو سے اس پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی"۔(۲۵)

عاشہ اگرچہ اب ایک طوائف ہے مگر اس کے دل میں نیکیوں کا اثر ہنوز باقی ہے۔ وہ چوری چھپے رات کی تاریکی میں اپنے گاؤں آتی ہے۔ یہاں وہ اپنے ماضی کے خیالوں میں ایسی گم ہو جاتی ہے کہ راستے ہی میں اس کا پاؤں کسی سخت چیز سے ٹکرا جاتا ہے اور وہ تلملا اُٹھتی ہے۔ اس وقت اس کے جذبات کچھ اس طرح کے ہوتے ہیں:

> "جیسے اپنے گھر کے بند کواڑوں کے سامنے بیٹھی ہوئی سر کو جھکائے اپنے پیروں میں بندھے ہوئے گھنگرو کھولنے کی کوشش کر رہی ہے جو گاؤں سے شہر لے جا کر زر بخت نے اس کے پیروں میں بندھوائے تھے۔۔۔۔۔۔ شرم کے شعلوں سے اس کے گال تمتما اُٹھے، داغدار ماضی کی بدبودار چادر میں منہ چھپا کر رونے لگی، مکروہ خیالوں کی بدصورت چھپکلیاں اس کے ذہن میں اُچھل کر رونے لگیں۔

جیسے گاؤں کی عورتیں اور بچے چھتوں پر چڑھ کر اسے پتھر مارنے لگے ہوں۔ ننگ دھڑنگ بچے اس کے گرد جمع ہو کر ناچنے لگے ہوں۔ غلیظ مکھیاں اس کے چاروں طرف بھنبھنانے لگی ہوں اور غلاظت کی سڑاند ہر طرف پھیل گئی ہو۔۔۔۔!!"(۲۶)

یہی وہ حقیقت ہے جس سے آنکھیں بند نہیں کی جاسکتیں۔ پاکباز عاشہ کو معاشرے کے نظروں میں کمتر بنانے والا اس معاشرے کے اشرافیوں میں سے تھا۔ ان کو اس میدان میں اُتار لانے والا بھی تو اسی معاشرے کا ایک فرد تھا جس کی عاشہ ایک بیٹی ہے۔ زر بخت کے بیٹوں کو بڑا ہو کر قابل فخر پشتون کہلانے کا زعم ہے اور اپنی صلاحیتوں کی داد پانے کا استحقاق بھی رکھتے ہیں اور معاشرے میں بلند مقام ملنے کی آرزوئیں ان کے سینوں میں جاگتی ہیں، جبکہ عاشہ کے بچوں کو ماں کے نام کا طعنہ ملے گا چاہے وہ لاکھ صلاحیتوں کے حامل ہوں۔ یہ وہی تضاد ہے جسے کھلا تضاد ہی تو کہا جاتا ہے۔ یہ وہ تضاد ہے جس نے معاشرے کی آنکھوں پر تعصب کی پٹی باندھ رکھی ہے۔ افسانہ نگار اسی تضاد اور تعصب کے شکار معاشرے کی آنکھیں کھولنا چاہتا ہے اور یہ واضح کرنا چاہتا ہے کہ جس معاشرے میں کسی کو اس کی صلاحیتوں کی بجائے اس کے حسب و نسب کے حوالے سے عزت دی جائے گی اس معاشرے کی ترقی کے امکانات بہت کم ہوں گے۔ ایسے معاشرے کو ترقی کرنے کی بجائے جمود کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ پشتون معاشرے میں بھی اکثر دیگر مشرقی معاشروں کی طرح نسلی تعصب بہت زیادہ ہے۔

اس معاشرے میں لوگ کسی کے کمال ہنر مندی اور علمی صلاحیتوں کو نہیں دیکھتے بلکہ خاندان کی نسلی برتری کو دیکھا جاتا ہے اور لوگ زندگی کے کسی میدان میں کمال حاصل کرنے کی بجائے نام نہاد حسب و نسب اور پدرم سلطان بود کے کھوکھلے تصّورات یا کسی پیروی کے شجرۂ نسب میں اپنے باپ دادا کے نام کی تکّلی لگا کر اپنا ایک الگ نام و مقام بنانے کی موہوم سعی کے پیچھے وقت ضائع کرتے ہیں۔ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی بجائے ان لایعنی باتوں میں زندگی کھپاتے ہیں۔ یہاں اس مرد کو جو ناچ گانے کا پیشہ اختیار کرلیتا ہے لختئی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ جس طرح کہ غربت کی چکی میں پسی ہوئی عورت ناچ گانے اور اسی قسم کے دوسرے پیشوں کے ساتھ وابستہ رہتی ہے یا کوئی شخص کسی لڑکی کو اغوا کرنے کے بعد اسے ایسے اڈوں پر بیچتا ہے جہاں اس سے اس قسم کا پیشہ کیا جاتا ہے غربت اور لاچاری کے ہوتھوں شہر کا رخ کرنے والے سادہ لوح بچے اسی طرح کے لفنگوں کے ہتھے چڑھ کر زندگی بھر نحوست کا جامہ پہن لیتے ہیں۔ اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ خود اسی ماحول میں ایسا ڈھل جاتا ہے کہ اس کے پاس سوائے اس کام کے اور کوئی چارہ نہیں رہتا۔ اغوا کر کے بھی بچوں کو اس پیشہ میں جھونک دیا جاتا ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ لوگ انہیں جنسی فروخت پر بھی مجبور کر دیتے ہیں۔

خیبر پختون خوا کے معاشرت سے تعلق رکھنے والے جدّت پسند ذہن کا مالک اشر آف حسین احمد کی افسانوں سے ان کی ذہانت کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے۔ان کی کہانیوں میں عوام کی دل کی دھڑکن محسوس کی جاسکتی ہے۔کچھ افسانے دیہاتی پس منظر اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔تو کہیں دولت و ثروت کے پیش منظر میں افلاس و احتیاج سے اُبھرنے والے مسائل کو بیان کرتے ہوئے وہ اپنے قاری کو جنسی نگار خانے کی سیر کراتے ہیں۔مناظر کی تصویر کشی میں جزبوں کی مصوری اور انسانی درد و غم کی عکّاسی اس خوب صورتی سے سمو لیتے ہیں کہ کایئنات کا حسن زندگی کی زیر ناکی اور کرب کو اپنے اندر بڑی خوب صورتی سے چھپالیتا ہے۔اس طرح وہ سماجی اور معاشرتی واقعیّت کا اظہار بڑے خوب صورت طریقے سے کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ قاری کو اُکتاہت اور بوریّت کا شکار ہونے سے بچانے کے لیے دل پذیر انداز میں کھیت کھلیان اور سبزہ زاروں کی منظر کشی کرتے ہیں۔

> "گاؤں کے ہرے بھرے سر سبز و شاداب لہلہاتے کھیت ،سفید ،گلابی ،عنابی اور قرمزی پھولوں کی مہکتے باغیچے ،شہد جیسی خوبانیوں ، کھٹی میٹھی رس سے رچے مالٹوں ،گلاب جیسے سُرخ رنگ میں لپٹے سیبوں اور لذیذ املوکوں کے دمکتے باغ، ٹھنڈے میٹھے پانیوں کا دریا کے کنارے، کبڈی، گھوڑی، گھوڑی اور لکن میٹی کھیلتے بچّوں کی ٹولیاں اور پنگھٹ پر چار بیتے، نیمہ کئی اور ٹپے الاپتی الپسراؤں کے جھرمٹ۔"(۲۷)

اشر آف اپنے مشاہدے کی گہرائی اور احساس کی شدت سے اپنی مخصوص ثقافت کا احاطہ کرتے ہوئے معاشرتی زندگی میں پلنے والی کہانیوں کو اپنا موضوع مناتے ہوئے اپنے تجربے کو تخیل سے ہم اہنگ کرتے ہوئے کہانی کے پلاٹ مین منطقی ترتیب و تسلسل اس انداز میں پیدا کرتے ہیں کہ عومی مسائل حقیقی رنگ میں ابھر کر سامنے آتے ہیں۔

افسانہ "پاگل" میں ایک طرف شیر زادہ کے شکل میں غیرت ننگ و ناموس جبکہ دوسرے طرف "میری ٹیز" کے شکل میں دیار فرنگ کی آزاد ماحول اور بے راہروی کی جھلک نہایت مہارت کے ساتھ دکھلائی ہے۔ماحول و تربیت کے تفاوت کے تذکرے کی بیچوں بیچ افسانہ نگار نے گاؤں میں خان بابا کے حجرے کی منظر کشی بہترین انداز میں کی ہے۔ حجرے میں گلاب کے پھول اور عشق پیچاں کی بیلیں، صحن میں بیری، شاہتوت، اور نارج کی درخت اس پر پھدکتی کوکتی کوئلیں اور خان بابا کا نورانی چہرہ ان کا اڈتا پیار ایک عجیب مسحور کن فضا کا منظر پیش کرتےے ہیں۔

انور خواجہ کے اولین افسانوی مجموعے "بوزنے بندر" کا افسانہ "بوزنے بندر" میں مرکزی کردار عبدل گلیات کے جنگل میں بے سرو سامانی کی حالت میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔وہ بندروں کے درمیان غربت زدہ زندگی گزارنے کے باوجود جنگلی حیات کا ہمدرد ہے۔وہ جنگلات کا بے دردی سے کٹائی کرنے والوں اور بندروں کی غیر قانونی سملنگ کرنے والوں کے خلاف مزاحمت کرتا ہے سلیم خان اور سیٹھ ہاشم اس کہانی کے جاگیر دار کردار ہیں جو اپنی لالچ اور

ہوس کو پورا کرنے کے لیے علاقائی وسائل کو تباہ و برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ عبدل، سیٹھ ہاشم اور سلیم خان کے درمیان مکالمہ بڑا جاندار اور پُر معنی ہے:

"اس برس ایک پارٹی نے بندروں کی ایکسپورٹ کا آرڈر دیا ہے۔ ہم نے سوچا، انکار کر دے، پھر سوچا ،مال اچھا ملیں گا۔اور نارتھ کے جنگل میں بہت بندر ہے ہم بھی پیسہ کمائیں گا"۔۔۔۔۔۔۔۔۔

"میرا خیال ہے۔ دس روپے فی بندر کافی ہو گا"۔

سلیم خان نے کہا"۔ کیوں عبدل ایک بندر پکڑنے کے کتنے پیسے لوگے"؟

عبدل چند لمحوں تک عجیب نظروں سے باری باری انہیں گھورتا رہا۔ پھر بھاری آواز میں بولا۔"میں بندر نہیں پکڑوں گا اور تم لوگوں کو بھی نہیں پکڑنے دوں گا"۔"(۲۸)

عبدل ایک غریب لیکن ساتھ ساتھ خوددار انسان ہے۔وہ ٹارزن کی مانند جنگلی حیوانات کا محافظ اور دوست ہے۔ جاگیر دار طبقہ اس کو مارنے کی بھی کوشش کرتا ہے لیکن وہ بچ جاتا ہے۔ انور خواجہ کا یہ دلکش اور انوکھا کردار اردو ادب میں اب تک گمنامی کا شکار ہے۔

انور نے اپنے افسانوں میں منظر نگاری کے ذریعے ماحول کے تاثر کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ گاہے بگاہے جنگلی پودوں، درختوں اور جانوروں کی جنگلی زندگی کے بارے میں مفید معلومات فراہم کی ہیں جو اپنی افادیت کے لحاظ سے اہمیت کی حامل ہیں۔ اپنے تجربات اور مشاہدے کو ماحول سے ہم اہنگ کرکے وضاحتی انداز میں ہر چیز کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ قاری کے ذہن میں کوئی الجھن باقی نہیں رہتی۔

(ٹ)۔ آبی حسن:

خیبر پختونخوا کے اُردو افسانہ نگاروں نے دیہات نگاری کے حوالے سے جہاں دیہی معاشرت کے معائب و محاسن یہاں کے رسوم ورواج، بود و باش، خانگی مسائل، معاشی مسائل اور روز مرّہ زندگی کے سہولیات کے فقدان کا ذکر کیا ہیں وہاں اپنے افسانوں میں دیہات کی باسیوں کی سادہ زندگی، قناعت پسندی، صاف ستھرے ماحول اور صحت بخش سادہ خوراک، میل جول، خلوص و محبت اور حب الوطنی کو بھی زیر بحث لاتیں ہیں۔ شہروں کے مصروف، پُر ہجوم اور چکاچوند والی زندگی سے دور سرسبز و شاداب اور زرخیز میدانی علاقوں، دور اُفتاد پہاڑی علاقی جات، خوب صورت وادیوں، فلک بوس پہاڑوں، ٹھاٹے مارتے دریاؤں، گنگناتے آبشاروں اور گھنے جنگلات کی خوبصورتی کو اپنے آفسانوں میں بیان کی ہیں۔

ربّ کائینات نے جہاں اس صوبے کو زرخیز زمین، میدانی وپہاڑی علاقہ جات سر سبز وشاداب وادیوں اور بہترین موسموں سے نوازا ہے وہاں پانی کی وافر مقدار ،ندی نالو ،دریاوں اور آبشاروں کے صورت میں بھی عنایت کی ہیں۔ دریائے سوات، پنجکوڑہ، دریائے کابل، دریائے باڑہ اور آباسین جیسے دریاؤں کا یہاں کے افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں ذکر کیا ہیں۔

فہمیدہ اختر خیبر پختونخواکے خواتین افسانہ نگاروں میں ایک منفرد افسانہ نگار ہیں۔ ان کی افسانوں میں ''حجرہ و رباب ''اور جرگہ وغیرہ کی تہذیبی اقدار کا حامل معاشرہ دم توڑتا ہوا دکھائی دے رہا ہے ۔جدید مادی دور نے اس معاشرے کی روحانیت پر کاری ضرب لگائی ہے۔اس معاشرے میں خوبیاں بھی ہیں اور خامیاں بھی جنہیں فہمیدہ دور کرنا چاہتی ہیں۔ اور محبت و بھائی چارے کا ایساماحول بنانا چاہتی ہے جس میں گولی کی بجائے محبت کی گونج سُنائی دے۔ہر عظیم فنکار کے طرح فہمیدہ نے اپنے دیہاتی ماحول کے مسائل، ناآسودگیوں اور دیگر مصائب کو فن کالباس پہنایا ہے۔ علاوہ ازیں، فہمیدہ نے پہلی بار بھر پور سلیقے اور فنّی شعور کے ساتھ خیبر پختونخواکے دیہاتی ماحول کو رصغیر کے دیگر علاقوں میں متعارف کرایاہے اور اسی کاوش کی بدولت پٹھانوں کے مزاج، تہذیب و ثقافت،رسم ورواج اور فکری رویوں سے اردو دان طبقہ صحیح معنوں میں پہلی بار آگاہ ہو رہا ہے ۔ فہمیدہ لفظوں کے انتخاب اور ان کی دروبست سے پوری طرح واقف ہیں۔کم سے کم لفظوں میں وہ اپنا مفہوم بیان کرتی ہیں ۔ان کے جملے سادہ ہونے کے باوجود نہایت دل کش ہوتے ہیں۔ تاثیر سے بھرپور ادبی حسن کے ساتھ ساتھ شیرینی اور مٹھاس سے بھی مالامال ہیں۔ فہمیدہ نے اپنے افسانوں میں جگہ جگہ اسلوب کی دل کشی کے لیے اپنے کہانیوں کے ریشمی پیراہن میں پشتو کے الفاظ بھی استعمال کئے ہیں۔ جن سے افسانوں کے معنوی حسن کے تابناکی اور بڑھ گئی ہے ۔پشتو الفاظ کو اُردو میں سمونے کا رجحان فہمیدہ کے افسانوں میں غالب ہے ۔انہوں نے پشتو الفاظ کو بڑے سلیقے سے استعمال کیا ہے۔ فہمیدہ کے ہاں پیار و محبت کی فضا ہے۔انسانیت سے محبت، حسین نظاروں سے محبت، رشتوں ناتوں سے محبت، زندگی سے محبت، دھرتی سے محبت غرض یہ کہ ان کے افسانے محبت کا ایک سمندر ہیں۔ جس کی گہرائی میں بڑی سچّائی ہے۔ان کے افسانوں میں قدرتی نظاروں، بارش، سبزہ، پھل پھول، پہاڑ، دریااور جنگلات وباغات کا تذکرہ اور منظر کشی بکثرت اور عمدہ انداز میں کی گئی ہیں۔ ملاحظہ ہو افسانہ ''نشانہ'' سے یہ اقتباس

> "آسمانی فضائیں صاف تھیں دور دور تک بادلوں کا ایک ایسا ہلکا سا عکس تک نہ تھا اور موسم سرما کے نیلے اور ستھرے آسمان پر چمکیلا سورج چمک رہا تھا۔ اور اُس کی کرنیں دریائے باڑہ کے گدلے پانی پر پڑ رہی تھیں اور دریائے باڑہ کا پانی تکونیں سی بناتا ہوا آہستہ آہستہ بہہ رہا تھا اور ان تکونوں کے کناروں پر مٹر اور ٹماٹر کے

لہلہاتے ہوئے کھیت تھیں۔دریائے باڑہ بہت گہرائی میں بہہ رہا تھا اور اس کے دونوں کناروں کی اُونچی اُونچی دیواروں میں خوب صورت کبوتروں نے کئی گھونسلے بنا رکھے تھے۔"(۲۹)

فہمیدہ کے ہاں پیار و محبت کی فضا ہے۔انسانیت سے محبت، حسین نظاروں سے محبت، رشتوں ناتوں سے محبت، زندگی سے محبت، دھرتی سے محبت غرض یہ کہ ان کے افسانے محبت کا ایک سمندر ہیں جس کی گہرائی میں بڑی سمائی ہے۔وہ یہاں کی زندگی کا گہرا مشاہدہ رکھتی ہیں اور علاقے کے ماحول اور روایات سے انھیں واقفیت اور گہری دلچسپی ہے۔انھوں نے اپنے افسانوں میں خیبر پختون خوا کی معاشرت کی بہترین عکاسی کی ہے۔

خیبر پختون خوا اور بالخصوص سوات میں دہشت گردی کی جو لہر چلی تھی اس کے اثرات دوسرے اصناف کے علاوہ افسانہ پر بھی پڑے اور اکثر افسانہ نویسوں نے اس بارے بہت کچھ لکھا، ضلع سوات کے محمد جمیل کاچوخیل نے اپنے افسانوی مجموعے ''نوحہ بے نام'' میں بوجوہ ایک مخصوص عہد کے محدود دائرے میں کہانیوں کے موضوعات، مقامات، واقعات اور کرداروں کا چناؤ کیا ہے۔لہٰذا ان کی کہانیاں مختلف نوعیّت کے موضوعات، واقعاتی حادثات، سماجی تعلقات اور انسانی نفسیات کے باوجود ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیاں لگتی ہیں۔

دراصل کہانیوں کی جنم بھومی وادی سوات ہے۔منظر نگاری اور ثقافتی مظاہر و عناصر بھی اس دھرتی کا عکس و نقش لیے ہوئے ہیں۔لیکن غالب اثرات مجموعی فضاء کے حوالے سے دہشت گردی، عسکریت پسندی اور فوج کشی کا خوف ہر ذی روح پر طاری ہونے اور آبادیوں کی کھنڈرات میں تبدیلی کے عمل سے انسانوں کی دربدری کی صورت میں نمایاں ہیں۔اسی طرح ان کہانیوں کی مرکزیّت کے حوالے سے سوات کی جنّت نظیر وادی انسانوں اور حیوانوں کے سڑے ہوئے گوشت اور منجمد خون کے امیزش اور بے گور و کفن لاشوں بلکہ کٹے انسانی اعضاء اور گوشت کے لوتھڑوں کی ناقابل برداشت بدبو اور تعفّن کی وجہ سے انسانوں کے رہنے کے قابل نہیں رہی تھی اور ہر جانب ویرانی ہی ویرانی میں صرف مردار خوروں کی حکمرانی تھی جو ہر کہانی کے منظر اور پس منظر میں دیکھی اور محسوس کی جاسکتی ہے۔دل خراش و روح فرساں واقعات و حالات کے ساتھ ساتھ جمیل نے جنّت نظیر وادی سوات کے قدرتی خوب صورتی کو بیان کرکے ایک عجیب امتزاج اور مسحور کُن فضاء پیدا کی ہے۔اس نے بہترین انداز میں دریائے سوات کے نیلگوں پانی اور گُنگناتے آبشاروں کی منظر کشی کی ہے۔افسانہ ''میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں؟'' میں دریائے سوات کے دل فریب منظر کشی کی جھلک ملاحظہ ہو:

"اس کے سامنے گھاس بھرا سبز میدان تھا۔جس میں جگہ جگہ خود رو خوشبو دار پودے اور پھول تھے۔میدان کے اختتام پر دریائے سوات ہمیشہ کی طرح لاتعداد موتیاں ہوا میں اُچھال رہا تھا۔اس کا نیلگوں

پانی طلسمی انداز سے آنکھوں میں ٹھنڈک، دماغ میں طراوت اور دلوں میں جوش پیدا کر رہا تھا۔ دریا کے اس پار اُس جیسا ایک میدان تھا۔ اسکے بعد دیودار کے بُلند و بالا درختوں سے ڈھکا ہوا پہاڑ تھا۔ اس پہاڑ سے دو بڑے جھرنے دریائے سوات میں گر رہے تھے۔ یہ جھرنے دور سے پانی کے نہیں بلکہ پگھلے ہوئے قلعی یا چاندنی کے لگ رہے تھے۔ سیمابی انداز میں اُچھل اُچھل کر بے قراری سے پانی میں مل رہے تھے۔ ملکہ کے پیچھے ایک بڑا سا مٹی کا ٹھیلہ نظر آرہا تھا۔ جس کے ڈھلوانی قدرتی دیوار کو جنگلی جھاڑیوں خاص کر جنگلی انگور کی بیلیوں نے چھپایا رکھا تھا۔ "(۳۰)

محمد جمیل کاچوخیل کا افسانہ "نوحۂ بے نام" قتل غیرت پر لکھا گیا افسانہ ہے۔ اس افسانے میں ملکہ ایک ایسی لڑکی ہے جس کی نسبت بچپن میں ہی اپنے چچازاد اجمل کے ساتھ طے ہوتی ہے۔ وہ دونوں اس نسبت سے خوش ہیں۔ گاہ گاہ آنکھ بچا کے ایک دوسرے کو دیکھتے بھی ہیں اور دونوں میں ایک خوشگوار مستقبل کی جوت جگائے جی رہے ہیں۔ سوئے اتفاق سے سوات میں طالبان کا عمل دخل شروع ہو جاتا ہے تو اس تحریک سے وابستہ لوگ اجمل کو بھی ورغلا کر تحریک میں شامل کر دیتے ہیں۔ اس کی عمر اس وقت سولہ برس ہو گی۔ ایک دن وہ ملکہ سے مل کر اپنے اچانک کے اپنانے والے عزائم سے آگاہ کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اُس نے اپنا نام فدائی حملہ آوروں میں لکھا ہے۔ ملکہ کی آنکھوں سے پھوٹتے ہوئے آبگینوں سے اجمل پر بھی رقت طاری ہو جاتی ہے۔ وہ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے ملکہ سے پھیرتے ہوئے کچھ کہے بغیر رخصت ہو تا ہے۔ دوسرے دن وہ فوج کے ایک قافلہ پر خود کش حملہ میں جل مرتا ہے۔

طالبان کے کرتوت نے عوام کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اُوپر سے اجمل کے خود کش نے جلتی پر تیل کا کام کر دیا۔ نتیجے میں گاؤں پر قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ ہوائی جہازوں سے بمباری کے باعث گھر کے گھر تباہ ہو گئے۔ انسانوں کے چیتھڑے ہواؤں میں اُڑتے نظر آرہے ہیں۔ گاؤں کے لوگ اپنی جانیں بچانے جدھر سینگ سمائیں ادھر بھاگ رہے ہیں۔ آسمان سے بمباری کی بوچھاڑ ہو رہی ہے تو پاس کی پہاڑیوں سے توپوں کے دہانے کھل گئے ہیں۔ اس گھن گرج میں کسی کو کسی کی چیخیں سنائی نہیں دے رہی ہیں۔ ہر ایک کو اپنی پڑی ہے۔ گھروں میں مویشی کُھرلی اور تھان پر اچھل اچھل کر رسیاں توڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کسی کا بس چلا تو اُن کو کھلا چھوڑ کر اپنا سر چھپانے کے لیے بھاگ نکلا۔ ملکہ، اس کے ماں باپ، دو چھوٹی بہنیں جن میں ایک شیر خوار ہے۔ گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ سڑکوں پر کرفیوں لگنے کے اعلانات سنائی دے رہے ہیں۔ موٹر، ٹرک، ٹرالیاں، رکشائیں، سائکلیں، موٹر سائکلیں، لوگوں اور ان کی گھٹڑیوں کو اپنے پیٹوں میں سموئے یا اپنی پیٹوں پر لادے ایک بے ہنگم انداز میں چالو حالت میں رُکے اپنا رہا سہا تیل جلا رہے ہیں۔ پہیہّ گھوما نہیں جا سکتا۔ ٹریفک چیونٹی کی چال چل کر رُک جاتی ہے اُلجھ جاتی ہے۔ حکومت کے کارندے ناپید ہیں۔ افواہیں پھیل رہی ہیں

کہ حکومت کو اپنا رٹ ختم ہونے کی شکایت ہے۔ لنگڑے لولوں، بڑے بوڑھوں، ضعیف اور بیماروں کو بچانے والے خود گولیوں کا نشانہ بن رہے ہیں۔ جوان بیٹیاں اور پوتی نواسیاں اپنی ماں، نانی، دادیوں کو کھینچ کھینچ کر خود نڈھال ہو رہی ہیں۔ غضب ہے، قہر ہے، آفت ہے، بلا ہے۔ ایسے میں نہ پائے رفتن و نہ جائے ماندن۔ بچوں کی الگ چیخیں اٹھ رہی ہیں۔ ان کے ہاتھ ماں باپ اور اپنے پیاروں کے ہاتھوں سے نکل چھوٹ چکے ہیں۔ بچوں کا یہ عالمِ بے بسی دیکھا نہ جائے۔

کہتے ہیں خوبصورت بے وفا ہوتے ہیں۔ آج سوات کی اُن حسین وادیوں نے تو جیسی آنکھیں پھیر لی ہیں۔ ان کی وہ دل موہ لینی والی کشش کیوں نہیں ہے۔ سوات کے پیر و جوان تو مئی کی جاتی بہاروں میں سورج کی ہلکی سی تمازت کی بھی تاب نہ لا کر ان آس پاس کے درختوں کی چھاؤں میں ٹولیاں بنائے محفلیں سجاتے تھے۔ وہ درخت بھی گولیوں کی زد میں آ چکے ہیں۔ مکانوں کی دیواروں میں مارٹر گولوں نے دہانے بنا دیئے ہیں۔ کھنڈرات کا ہر دہانہ زبان حال سے بتا رہا ہے۔ عمارت حسین تھی۔ چشم فلک کہتی ہے۔ دل دُکھانے کی بات کرتے ہو۔ پشتو، پشتون ولی کی لاج رکھنے والے تاراج ہو گئے۔ اُن کے نقشِ پا بھی دھماکوں سے اُلٹنے والی زمین میں مٹ گئے۔ طالبان نے معصوم عوام کو یہ کیوں نہیں بتایا تھا کہ ہم تو ڈوبے صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔ آج ان طالبان کے ہاتھوں حسینان سوات بھی گمنامی کے ساتھ پیوند زمین ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ مہمان نواز و دل نواز پشتون اپنے دستر خوان لپیٹ گئے ہیں اپنے حجروں کے در بڑھا گئے ہیں۔ سوات کی دلربا وادیوں میں ہُو کا عالم ہے۔ سوائے توپوں کے گھن گرج کے ہر طرف سناٹا ہے۔ ہر گلی سنسان پڑی ہے۔ پشتون ولی بکھر گئی ہے۔ املوک اور سیب کے باغات اجڑ گئے ہیں۔ اب وہاں اُلّو بول رہے ہیں۔ عطر بیز ہواؤں میں لچکتی شاخوں اور لہراتی ٹہنیوں کو زاغ و زغن بیٹھ کر بادام ناشپاتیوں اور انگور و خوبانیوں سے دل بہلا رہے ہیں۔ اپنے ہیروں کو سینے تلے چھپائے دریائے سوات کا پانی زمرّد کی پہاڑیوں سے آنکھ بچا کر ہولے سے گزر رہا ہے۔ آج وہ ''روانی میں اک شور کرتا ہوا'' کی بجائے اپنے گھاٹوں سے سیر اب ہونے والوں کا مرثیہ گنگنا رہا ہے۔

سوات کی خاموش فضائیں سبز پوش سرزمینِ سوات سے زبانِ حال سے پوچھ رہی ہیں۔ کیا ہوئے وہ تیرے پھولوں جیسے خوبصورت اور پھلوں جیسے میٹھے لوگ جو تیری زینت ہوا کرتے تھے۔ مالاکنڈ کی پہاڑیوں کو عبور کر کے آنے والے بادلوں نے کہا۔ اَجی ہم سے پوچھیے۔ ملاکنڈ کی گھاٹی پر سے گزرتی ہوئی پگڈنڈی جو آج کل سڑک ہے سوات کی دہلیز کہلاتی ہے۔ دس بارہ ہزار سوات کے باسی روتے ہوئے اس دہلیز کو اُلانگ رہے تھے۔ واپس شاید ہی آ جائیں۔ سنا ہے انہوں نے خاموش رہ کر طالبان کو اپنی من مانی کرنے دیا۔ ملکہ کا باپ اور ماں اپنے بچوں کو کندھوں پر بٹھائے بھاگتے بھاگتے تیس گھنٹوں کی مسافت طے کرنے کے بعد بستی تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ جب خطرہ ٹل جاتا ہے تو وہ تھکاوٹ محسوس کرتے ہیں اور ایک جگہ ٹھہر جاتے ہیں۔ ملکہ اور دوسرے اہل خانہ کو پانی تو راستے میں مختلف چشموں سے

مل جاتا ہے لیکن کھانے کا کوئی بندوبست نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ بھوک سے نڈھال ہو چکے ہوتے ہیں۔ اس کا باپ ان کے لیے پانی اور خوراک کا بندوبست کرنے نکل جاتا ہے۔ ملکہ کی آنکھوں کے سامنے بار بار بھوک کی وجہ سے تاریکی چھاجاتی ہے۔ مگر اُس کی قوتِ ارادی اُسے بے ہوشی سے باز رکھتی ہے۔ اُس کے معدہ میں شدید اینٹھیں اُٹھ رہی ہوتی ہے۔ ملکہ کی بہن ماہ جبین اور شیر خوار بھائی کی حالت بھی بھوک کی وجہ سے ابتر ہو جاتی ہے۔ یہ دونوں بھوک سے نیم بے ہوش جاتے ہیں۔ اس صورتحال میں سب سے زیادہ بُرا حال ملکہ کے والد کا ہے کیونکہ وہ اپنی بے بسی کی وجہ سے غم کے ایک ناقابل بیان کیفیت سے گزر رہاہے۔ اور سب سے بڑھ کر بے عزتی کا احساس اس کے اندر ایک طوفان برپا کر دیتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ وہ فوج یا طالبان کے خلاف اگر لڑ کر مر چکا ہوتا تو اس بے عزتی کی زندگی سے چھٹکارا تو مل گیا ہوتا۔ پھر بھی اُسے اپنے خاندان کی بقا کے لیے جنگ لڑنا تھا۔ اس لیے وہ کھانے اور پانی کی تلاش میں چل پڑتا ہے۔ ملکہ سے بھی اپنی ماں کی پریشانی نہیں دیکھی جا رہی۔ اس کے بابا کو جاتے ہوئے زیادہ وقت ہو جاتا ہے تو ملکہ بھی بے تاب ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ اس کی ماں ہے جس سے اُس کے چھوٹے بہن بھائی کچھ نہ ہونے کے سبب سنبھالے نہیں جا رہے۔ اُسے ٹھنڈے پسینے آنے لگتے ہیں۔ اُس کے چہرے پر لمحہ لمحہ زردی پھیل رہی ہے۔ اُدھر بچوں کی حالت بھی دیکھی نہیں جا رہی۔ آخر ملکہ کی برداشت اور حوصلہ بھی جواب دے جاتے ہیں۔ وہ اُمید و بیم کی حالت میں والد کی تلاش میں روانہ ہو جاتی ہے۔ راستہ سنسان ہے۔ وہ ایک باڑ لگے باغ کے قریب پہنچ جاتی ہے۔ باڑ کے پاس ایک جوان ایک ہاتھ میں پانی کی بوتل اور دوسرے میں روٹی اور سالن کا ٹفن لیے کھڑا ہے۔ روٹی کی خوشبو اس کو نوجوان کی طرف متوجہ کر دیتی ہے۔ ملکہ بے تابانہ انداز میں لڑکے کی طرف لپکتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں التجا ہوتی ہے اس کا ایک ہاتھ سوال کے انداز میں اُٹھ جاتا ہے۔ مگر عادت نہ ہونے کی وجہ سے اس کی زبان خاموش ہوتی ہے۔ جوان کی آنکھوں میں ایک دل کشی سی لگ رہی ہے۔ لیکن یہ دل کشی بڑی تیزی سے ایک اور رنگ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

انسان کو حیوان بنتے دیر نہیں لگتی اور وہی ہو جاتا ہے۔ اب اُس کی آنکھوں میں ہوس کی جھلک صاف نظر آ رہی ہوتی ہے۔ وہ ملکہ کا ہاتھ پکڑ کر باغ کے اندر لے جانے لگتا ہے۔ وہ کسی سحر زدہ معمول کی طرح اُس کے ساتھ باغ کے اندر چلنے لگتی ہے۔ ملکہ کو خطرے کا احساس ہو جاتا ہے لیکن اب وہ مزاحمت نہ کر سکی۔ کیونکہ روٹی کی خوشبو نے اُس کے تمام حواس معطل کر دیئے ہیں۔ وہ باغ کے اندر اُس جگہ تک آ جاتی ہے جہاں لڑکا اُسے لے جانا چاہتا ہے۔ لڑکے نے اُسے روٹیاں دے دیں۔ ملکہ اس انداز سے روٹی کھانے لگتی ہے جیسے وہ زندگی میں پہلی بار کھا رہی ہو۔ اُسے یہ بھی احساس نہیں ہو رہا کہ اُس کے زخمی ہونٹوں سے خشک روٹی کے کھانے سے لہو رسنے لگا تھا۔ اور بقولِ افسانہ نگار:

"لہو پینا تو سب نے سنا ہے مگر آج وہ روٹی کے ساتھ اپنا لہو کھا رہی تھی۔ وہ روٹی کھاتی رہی اُسے یہ بھی احساس نہیں ہوا کہ اُس کے جسم کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ اُسے یہ بھی پتہ نہ چلا کہ لڑکا کب اُٹھ کر بھاگ چکا ہے اور کیوں؟۔ بس وہ روٹی کھاتی رہی۔ اُس نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ اُس کا باپ جس کے ہاتھوں میں ایک شاپر میں چاول اور پانی کا بوتل ہے کب سے اُس کے سر پر کھڑا ہے۔"(۳۱)

اس کا والد دور سے ملکہ کو لڑکے کے ساتھ باغ کے اندر جاتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ دوڑ کر آتا ہے مگر اُسے بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ اُس کی عزت کا جنازہ اُٹھ چکا ہوتا ہے۔ اور پھر وہی ہوا جو یہاں کا دستور ہے۔

جمیل خان اس لحاظ سے داد کے قابل ہیں کہ انھوں نے ایک ایسے موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ جس پر لکھنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں اور پھر بڑے نامساعد حالات میں انھوں نے نہایت صاف گوئی اور جراتمندی سے زمینی حقائق کو اپنی کہانیوں میں بیان کر کے ظلم و جبر کی قوتوں کو عوامی عدالت میں لا کھڑا کیا ہے۔ عسکریت پسندوں، فوج، انتظامیہ اور عوام کے کردار پر خاموشی اختیار کرنے کی بجائے ان کا احتساب فنکارانہ اور دانشورانہ نقد و نظر سے کیا ہے۔ اپنے افسانوں میں دیہی معاشرت و ثقافت کی بھرپور عکاسی کی ہے۔

خیبر پختون خواہ کے قبائلی معاشرت کے ترجمان سحر یوسفزئی اپنے افسانوی مجموعے "آگ اور سائے" کے افسانوں میں غریب پٹھانوں کی کسمپرسی کے لفظی تصویریں ہیں۔ اقتصادی بدحالی سے پیدا ہونے والی بے سروسامانی، توہم پرستی، معاشرتی و سماجی مسائل ان کے نفسیاتی عوامل سب کچھ بیان کیا گیا ہے یہ کہانیاں روایت کی کڑیوں میں جکڑے ہوئے مجبور انسانوں کی کہانیاں ہیں۔ سحر اشتراکیت سے بھی متاثر ہیں۔ وہ پشتون معاشرت کے اقتصادی مسائل کی پیش کش میں اُلجھ کر رہ گئے ہیں۔ اس لیے ان کے ہاں مذہبی قدروں کی جھلکیاں بہت کم ملتی ہیں۔ سحر نے کرداروں کی سیرت کشی اور ماحول کی تصویر کشی بہترین انداز میں کی ہے۔ قاری کو بوریّت کا شکار ہونے سے بچانے کے لیے دل پذیر انداز میں قبائلی عاقہ جات کی خوب صورتی یہاں کے دریا، پہاڑ، سبزہ زاروں اور لہلہاتے فصلوں کو صفحہ قرطاس پہ منتقل کیا ہے۔ افسانہ "زیتون اور نرگس" میں دریائے سوات کے خوب صورت لہروں کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"وادی کے سینے میں سے دریا پھٹ کر بہہ رہا تھا، اس کا سفید چمکتا ہوا پانی ڈوبتے سورج کی روشنی میں بہت ہی بھلا لگ رہا تھا اور دریا کا شور پوری وادی میں ہمیشہ کی طرح گونج رہا تھا۔ اس مقام پر تو اس کی آواز، درّوں میں باز گشت کی وجہ سے اور بھی بڑھ گئی تھی۔ کھیتوں میں پکی ہوئی گندم تھی یا پھر ہل چلے ہوئے پھورے کھیت جن میں لوگ کام کر رہے تھے۔"(۳۲)

افسانہ ”زیتون اور نرگس“میں روایتی توہم پرستی کا تذکرہ ہے۔اختر تنہائی سے اُکتا کر شکار کھیلنے نکل پڑتا ہے اور کبوتروں کے تعاقب میں زیتون کے درختوں کے جھنڈ تک پہنچ جاتا ہے۔یہ درختوں کا جھنڈ دراصل قبرستان ہوتا ہے جس میں نرگس کے بہت سے پھول بھی کھلے ہوتے ہیں۔اختر جب ان کبوتروں پر نشانہ باندھتا ہے تو اسے پیچھے سے ایک بوڑھا آدمی کہتا ہے یہاں پر شکار مت کرو ورنہ نقصان اُٹھاؤ گے۔اختر بوڑھے کو نظر انداز کر کے کبوتروں پر فائر کھول دیتا ہے۔اگرچہ اختر کا نشانہ بڑا صحیح ہوتا ہے لیکن سارے کبوتر اُڑ جاتے ہیں اور جب وہ مڑ کر دیکھتا ہے، تو وہ بوڑھا بھی غائب ہو چکا ہوتا ہے۔بوڑھے کی باتوں اور اس کے اچانک غائب ہونے سے اختر خوف زدہ ہو جاتا ہے۔اس رات وہ حرارت بھی محسوس کرتا ہے۔اس کے کچھ عرصے بعد وہ دوبارہ اپنے دوست میاں جان کے ساتھ شکار کو نکلتا ہے۔واپسی میں برف باری شروع ہو جاتی ہے دونوں پناہ کے لیے جگہ ڈھونڈتے ہیں۔تھوڑی سی تلاش کے بعد انہیں ایک گھر مل جاتا ہے۔وہاں پر اختر کی ملاقات قبرستان والے بوڑھے سے ہو جاتی ہے۔اختر اس سے قبرستان میں پیش آنے والے واقعے کے بارے میں پوچھتا ہے کہ آخر اس کو شکار کرنے سے کیوں روکا گیا تھا۔تب اسے بوڑھا بتاتا ہے کہ یہ ایک بزرگ کا مقبرہ ہے جو کہ بہت نیک اور پرہیز گار انسان تھا، جس کا نام کیشو میاں تھا جبکہ اس کا باپ فیض اخوند بھی بہت اچھا اور نیک انسان تھا۔کیشو میاں کو موسیقی سے بہت لگاؤ تھا۔اس لیے اُس نے موسیقی کی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔کیشو میاں کو ایک شادی شدہ عورت سے محبت ہو گئی تھی جس کی وجہ سے اُس کا دل کہیں بھی نہ لگتا تھا۔اگرچہ گھر میں ہزاروں کنیزیں تھیں لیکن اس کے باوجود اُس کو اسی عورت سے محبت تھی جس کی بدولت وہ عشقِ حقیقی کے رتبے پر پہنچ گیا تھا۔بوڑھا اختر سے اس مزار کے متعلق کہتا ہے کہ اب جو کوئی بھی اس کے مزار پر جا کر دعا مانگتا ہے۔اس کی دعا ضرور قبول ہوتی ہے، بوڑھے کے پاس ایک بھینس ہوتی ہے جس کے متعلق وہ کہتا ہے کہ یہ بھینس اسی کی دعا کے طفیل ملی ہیں۔اس بزرگ کے بارے میں یہ تمام باتیں اختر کو اس بوڑھے آدمی کے توسط سے معلوم ہو جاتی ہیں۔

یہاں پر افسانہ نگار اسی گاؤں کے لوگوں کی دین سے ناواقفیت کی بنا پر غلط عقائد اور توہم پرستی جیسی بری عادتوں کو تنقید کا نشانہ بناتا ہے اور یہ کہنے کی کوشش کرتا ہے کہ پشتونوں کے اکثر علاقوں میں یہ بری رسوم اس قدر عام ہو گئی ہیں کہ وہ مشکل میں خدا کو پکارنے کی بجائے یا پیر بابا، یا خراسان کے پیر جیسی ندائیں ماضی قریب تک تعلیم عام نہ ہونے سے قبل ایک مکمل اعتماد کے ساتھ زبان پر لاتے تھے۔اسی طرح مقبروں پر جا کر ہندوؤں کی طرح برتنوں کے ٹکڑے اور جھولے لٹکا کر مرادیں مانگتے تھے اور ان مزاروں سے بے جا باتیں منسوب کر کے معاشرے میں توہمات بڑھانے میں اہم کردار ادا کرتے تھے اور اپنی نئی نسل کو بھی ان توہمات میں مبتلا کر دیتے تھے۔افسانہ نگار یہ بھی بتاتا ہے کہ عقائد کی

کمزوری کی وجہ سے کیشومیاں کے مزار کے متعلق مختلف قسم کی باتیں بہت عام ہو گئی تھیں جس کی وجہ سے اس علاقے کے لوگ اللہ سے زیادہ ان بزرگوں کے مزاروں پر یقین رکھتے تھے۔

اظہار خیال کے لیے موزون الفاظ کے انتخاب میں سحر یوسفزئی کو کمال مہارت حاصل ہے۔اس فنّی باریکی سے آگاہ ہیں۔ کہ بے جالفّاظی اور تصنع و بناوٹ کی ملمع سازی افسانے کے تاثر کو مجروح کر سکتی ہے لہٰذا وہ کم سے کم الفاظ اور جچے تُلے اور سلجھے ہوئے انداز میں موضوع کو آگے بڑھاتے ہیں۔ ماحول کی یکسانیت کی باوجود موضوعات کے تنوع نے ان کی افسانوں میں گنگا جمنی کیفیّت پیدا کر دی ہے۔ان کی سوچ کا زاویہ زندگی کے مسترد شدّہ گوشوں میں جھانک کر موضوعات کی تلاش ہے۔وہ بڑی فنکاری کیساتھ کہانیاں تلاش کر لاتا ہے الفاظ کی قطع وبرید کے بعد جو چیز سامنے آئی ہے اس میں افسانے کے تمام لوازمات کا پوری طرح خیال رکھا گیا ہوتا ہے۔سحر یوسفزئی کا کہنا ہے کہ یہ افسانے تخلیق کرنے کا مقصد پٹھانوں اور خاص کر قبائلی علاقے کی حقیقی زندگی کو پاکستانی عوام کے سامنے لانا ہے تا کہ وہ اس علاقے کے تہذیب اور کلچر کے ساتھ ساتھ یہاں کے نفسیات اور طبقاتی کشمکش سے کسی حد تک واقف ہو سکیں۔افسانے پڑھنے کے بعد قاری کو معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے اپنے کتاب کے مقدمے میں جو کچھ کہا تھا اس میں کافی حد تک کامیاب ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔

محمد جمیل کاچوخیل کا افسانہ ''پگلی'' علاقہ سوات میں دہشت گرد کاروائیوں اور اس کے وجہ سے در بدر ہونے والے اہل علاقہ پر بیتنے والے تکالیف و مصائب کا تذکرہ ہے۔ زرمینہ کو بہت آرمانوں کے بعد شادی کی پانچویں سال اللہ تعالیٰ ایک بیٹے سے نوازتا ہے۔لیکن اس جنگ کے دوران ایک طرف طالبان کے ہاتھوں اس کا پولیس شوہر اس وقت زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے جب وہ بیٹے کی پیدائش کے موقع پر اپنی بیوی کے آپریشن کے دوران دوائی لینے میڈیکل سٹور جاتا ہے وہاں مقامی طالبان کی نشاندہی پر دوسرے طالبان اس کو پکڑ کر موت کے گھاٹ اُتار دیتے ہیں۔اب وہ صرف اپنے بیٹے کے سہارے جینے کا عزم کر لیتی ہے لیکن فوج کی بمباری کے دوران اس کا بیٹا اور ساس بھی لقمۂ اجل بن جاتے ہیں۔خوف ودہشت کے ان مناظر کو افسانہ نگار نے یوں پیش کیا ہے:

> "وہ ایک پوٹلی سینے سے چمٹائے بھاگ رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ وحشتناک نظروں سے پیچھے مُڑ کر دیکھتی تو اُسے اپنے گھر اور گاؤں سے آگ کے شعلے اور دھواں اُٹھتا نظر آتا اُسے مسلسل دھماکے سنائی دے رہے تھے۔اس میں بعض دھماکے اتنی طاقت کے تھے جس سے اُچھل اُچھل کر وہ دوور جا گرتی اور پھر بھاگنے لگتی اور بھی تیز۔"(۳۳)

اس افسانے میں ایک زرینہ کی کہانی بیان کی گئی ہے لیکن زرینہ کی روپ میں یہ ہزار لڑکیوں اور عورتوں کی داستان ہے۔اس کی طرح دوسری عورتیں اور لڑکیاں بھی اپنے شوہروں ،والدین،بھائی بہنوں اور بچوں سے محروم ہو گئیں۔افسانے میں یہ تاثر بھی پوشیدہ ہے کہ اس معاشرے کے بچے جب ازل سے اس قسم کے جنگوں اور تصادم کے درمیان پیدا ہوں گے اور جب ان کی پرورش ایسے ماحول میں ہو گی تو ان کے مزاج میں جذباتیت،انتہا پسندی اور اس قسم کے دوسرے جذبے ضرور پیدا ہوں گے۔عرصہ دراز سے یہاں کے باسیوں نے جنگ و جدل کے ماحول میں آنکھیں کھولیں ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے اندر جذباتیت اور انتقام کا جذبہ دوسرے قوموں کی بہ نسبت زیادہ ہے۔

جمیل کے افسانوں میں کوئی سیاسی نقطہ نظر نہیں ملتا۔وہ نفسیاتی اور پیچیدہ مسائل کو بھی کہانی کی بنیاد نہیں بناتے بلکہ ان کے ہاں سیدھی سادی جیتی جاگتی زندگی فطری انداز میں جلوہ گر نظر آتی ہے جو اپنے تمام تر حقیقتوں کے ساتھ ان کے افسانوں کے قالب میں ڈھل کر حسین ورنگین ہو جاتی ہے۔وہ خوبصورت منظر نگاری سے بھی کہانی میں افسانوی رنگ پیدا کرتے ہیں جس سے کہانی کے فطری ماحول میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔

حوالہ جات

۱. طاہر آفریدی، دیدن، بختیار اکیڈمی، کراچی، نومبر دسمبر ۱۹۸۲ء، ص:۸۹

۲. طاہر آفریدی، دیدن، ص:۸۹

۳. طاہر آفریدی، دیدن، بختیار اکیڈمی، کراچی، نومبر دسمبر ۱۹۸۲ء، ص:۲۵،۲۴

۴. طاہر آفریدی، دیدن، ص:۲۴

۵. ایضاً، دیدن، ص:۲۰

۶. رختاج امین، ڈاکٹر، سرحد میں اردو افسانہ (قیامِ پاکستان کے بعد)، غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی، پشاور یونیورسٹی، ۱۹۹۵ء، ص:۲۷۴۔۲۷۵

۷. سحر یوسفزئی، آگ اور سائے، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، باراوّل:۱۹۶۷ء، ص:۱۰۹

۸. سحر یوسفزئی، آگ اور سائے، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، باراوّل:۱۹۶۷ء، ص:۳۳

۹. زیتون بانو، زندہ دکھ، مقبول اکیڈمی، انار کلی، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص:۱۷۸

۱۰. زیتون بانو، زندہ دکھ، ص:۱۹۰

۱۱. اُمِّ عمارہ، درد روشن ہے، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص:۱۰۱

۱۲. سحر یوسفزئی، آگ اور سائے، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، باراوّل:۱۹۶۷ء، ص:۱۲

۱۳. سحر یوسفزئی، آگ اور سائے، ص:۹

۱۴. اشر آف حسین احمد، اکاس بیلیں، احمد سلمان پبلی کیشنز، پشاور، ۱۹۹۱ء، ص:۱۴۳

۱۵. طاہر آفریدی، دیدن، بختیار اکیڈمی، کراچی، نومبر دسمبر ۱۹۸۲ء، ص:۴۷

۱۶. طاہر آفریدی، دیدن، ص:۷۶

۱۷. ایضاً، دیدن، ص:۴۷

۱۸. گنڈاپور، صفیہ بشیر پروفیسر، زرغونہ، یوسفزئی پرنٹنگ پریس، مردان، ۱۹۹۹ء، ص:۵۸

۱۹. مظہر گیلانی، بدنصیب سارہ، اُردو اکیڈمی، لاہور، س ن، س:۲۵

۲۰. فہمیدہ اختر، اپنے دیس میں، استقلال پریس، لاہور، ۱۹۶۱ء، ص:۷۵

۲۱. فہمیدہ اختر، اپنے دیس میں، ص:۸۷

۲۲. طاہر آفریدی، دیدن، بختیار اکیڈمی، کراچی، نومبر دسمبر ۱۹۸۲ء، ص:۳۱

۲۳. طاہر آفریدی،، دیدن، ص:۳۴

۲۴. سحر یوسفزئی، آگ اور سائے، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، باراوّل:۱۹۶۷ء، ص:۱۶۱

۲۵. احمد پراچہ، سوتی جاگتی کلیاں، ادارہ ادب و سائنس، کوہاٹ، ۱۹۸۵ء، ص:۵۷

۲۶. احمد پراچہ، سوتی جاگتی کلیاں، ص:۵۷

۲۷. اثر آفریدی حسین احمد، اکاس بیلیں، احمد سلمان پبلیکیشنز، پشاور، ۱۹۹۱ء، ص:۱۱۷

۲۸. انور خواجہ، بوزنے بندر، شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور، ۱۹۸۲ء، ص:۴۹۔۵۰

۲۹. فہمیدہ اختر، اپنے دیس میں، استقلال پریس، لاہور، ۱۹۶۱ء، ص:۱۸۸

۳۰. کاچوخیل، محمد جمیل، نوحۂ بے نام، پشتو ادبی ٹولنہ، الہ ڈھنڈ ڈھیری، ملاکنڈ، ۲۰۱۱ء، ص:۸۲

۳۱. کاچوخیل، محمد جمیل، نوحۂ بے نام، پشتو ادبی ٹولنہ، الہ ڈھنڈ ڈھیری، ملاکنڈ، ۲۰۱۱ء، ص:۹۲

۳۲. سحر یوسفزئی، آگ اور سائے، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، باراوّل :۱۹۶۷ء، ص:۴۰

۳۳. کاچوخیل، محمد جمیل، نوحۂ بے نام، پشتو ادبی ٹولنہ، الہ ڈھنڈ ڈھیری، ملاکنڈ، ۲۰۱۱ء، ص:۴۱

باب پنجم:

ماحصل

(الف)۔ مجموعی جائزہ:

خیبر پختون خوا میں افسانہ نگاری کے مطالعے سے یہ بات عیّاں ہو جاتی ہے کہ یہاں کا افسانہ ملک کے دیگر حصّوں کے افسانے کے متوازی ارتقا پذیر ہوئی۔ یہاں کے افسانہ نگاروں نے ابتداء ہی سے اس کو نہایت خلوص اور دیانت داری سے نہ صرف نبھایا بلکہ اس میں دیگر رجحانات کی طرح یہاں کے معاشرتی کرب، دکھ سُکھ، نفسیاتی عوامل اور خاص کر دیہاتی ماحول کو موثر انداز میں پیش بھی کیا۔ یہاں کی سماجی، سیاسی اور تہذیبی زندگی کی خوب صورت اور موثر آئینہ داری کی۔ یہاں کے افسانہ نگاروں نے معاشرتی تغیّرات اور رویّوں کا کامیاب اور حقیقت پسندانہ عکّاسی کی۔ خیبر پختون خوا میں اُردو افسانے کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہاں کے افسانہ نگار برِّصغیر کے افسانہ نگاروں کے شانہ بہ شانہ چلے اور اُردو افسانے کے وزن اور معیار کو بڑھایا ہے۔ ادب کا موضوع انسانی زندگی ہے۔ زندگی اپنے مختلف پہلوں کے ساتھ اصناف ادب میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ افسانہ زندگی کے کسی ایک پہلو کی عکّاسی کرتا ہے۔ سو یہی پہلو افسانے کا موضوع یا فکر ہوتا ہے۔ جہاں تک افسانے کے موضوعات کا تعلق ہے تو سب افساہ نگار روح عصر کے تابع نظر آتے ہیں وہ نہ صرف زندگی کے مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں بلکہ عصر زندگی سے وابستہ حوادث اور وقوعات کا تجزیہ بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں کا افسانہ اس معاشرے کا آئینہ دار ہے۔ اس میں معاشرے کے داخلی تضادات اُجاگر کئے گئے ہیں اور فرد کی کرداری منافقت واضح کی گئی ہے۔

ہر دور کی جو اہم صداقتیں ہیں وہ اس دور کے افسانہ نگاروں کے یہاں ضرور رونما ہوتی ہیں۔ اپنے عہد کے وہ صداقتیں، وہ حقیقتیں اور بے چینیاں جن کی طرف ہمارا ذہن منتقل ہوتا رہتا ہے۔ جو سوالات پیدا ہوتے ہیں ہمارا ذہن جن کے جواب چاہتا ہے۔ اُن کی طرف لازمی طور پر ہر افسانہ نگار کا ذہن منتقل ہوتا ہے۔ اب جس حد تک اس کا فنّی شعور پختہ ہوتا ہے تو زندگی اس حد تک اُسی کی گرفت میں آتی ہے۔ اس حد تک وہ زندگی کو خوب صورتی سے پیش کرتا ہے۔ چنانچہ زندگی افسانے کا ہی موضوع ہوتا ہے۔ احتشام حسین کی رائے میں:

”ہر اچھا افسانہ نویس زندگی کے جن پہلوں کو سمجھ سکتا ہے۔ جن پہلوں کا اسے تجربہ ہوتا ہے اُنہی کو اپنے افسانوں کا مرکزی موضوع بناتا ہے۔“

سب سے پہلے جو چیز قصّہ گو کو بحیثیت فنکار سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ اُس عہد کے تہذیبی اور فکری میلانات ہیں۔ یہ تہذیبی اور فکری میلانات دوسرے افراد کی طرح قصّہ گو کے ذہن اور احساس پر بھی اثر ڈالتے ہیں۔اس حوالے سے اگر اُردو افسانہ پر ایک نظر ڈالی جائے تو ماضوعات کا لامتناہی سلسلہ نظر آئیے گا گویا کہ زندگی اپنے تمام تر رنگینیوں اور تلخیوں کے ساتھ اردو افسانے میں جلوہ گر ہے۔ لیکن چونکہ زندگی کے دامن میں تلخ حقائق کے گنجائش زیادہ ہے اس لیے ان کی عکاسی افسانے کا مستقل موضوع رہی ہے۔ ادبی اصطلاح میں اس حقیقت نگاری کہتے ہیں۔ ہمارے معاشی مسائل نے اُردو افسانوں کو حقیقت نگاری سے قریب رکھنے میں بڑی مدد کی ہے، معاشی مسائل زندگی کے سب سے اہم مسائل ہیں۔ ساری انسانی زندگی اسی محور کے گِرد گھومتی ہے۔اس لیے معاشی مسائل اور ان مسائل کے باعث پیدا شدہ ان گنت پہلوں کی ترجمانی کو اُردو افسانوں میں خصوصیت کے ساتھ اہمیّت حاصل ہے۔اُردو افسانے نے ہر زمانے میں اپنے ماحول کی نہایت صحیح سچّی اور پُر خلوص ترجمانی کی ہے۔اس کی اسی خصوصیّت نے اس میں حقیقت نگاری کا رنگ بھرا ہے۔ حقیقت نگاری نے اُردو افسانہ نویسوں کو اپنے اِرد گِرد کے ماحول کی طرف متوجہ کیا اس لیے انہوں نے اپنے افسانوں کے موضوعات کو اپنے ماحول میں تلاش کیا ہے۔ ادبی اصطلاح میں اس ''مقامی رنگ'' کہا جاتا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ مغربی ادبیات میں جیمز جوائس، فلیبرٹی، کھیترین، فینز فیلڈ، انڈرس، ہمینگوے، روتھ سوکو، کے بوائل، ڈور تھی پارکر اور مورلے وغیرہ مقامی رنگ کے افسانہ نگار ہیں۔

اُردو افسانے میں پریم چند کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے پہلی پہل مقامی رنگ میں افسانے لکھے۔ چونکہ اُن کا تعلق دیہات سے تھا، اس لیے دیہات کی زندگی ان کے افسانوں کا موضوع ہے۔ پریم چند کے بعد علی عباس حسینی، سدرشن، اعظم کریلوی، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، احمد ندیم قاسمی، بلونت سنگھ، جمیلہ ہاشمی، غلام الثقلین نقوی، صادق حسین، فہمیدہ اختر، طاہر آفریدی اور سحر یوسفزئی اسی قبیل کے افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں میں دیہات کی زندگی مختلف پہلوں سے منعکس نظر آتی ہے۔ دیہات کے کرداروں میں تحریک اور زندگی موجود ہے یہ کردار زمین کی تخلیقی قوت کو روبہ عمل لائے اور اس کے مثبت ثمرات سمیٹتے ہیں۔ یہ کردار خون پسینہ بہانے والے محنت کش لوگ ہیں۔ ان کے روزمرّہ کا پیہم عمل در حقیقت انسانی محنت ہی سامنے نہیں لاتا، بلکہ ان آویزشوں کو بھی سطح پر نمایاں کرتا ہے، جو حاصل سے پیدا ہوتی ہے اور درون تلاطم بپا کرتی ہیں۔ دوسری طرف دیہاتی ماحول کا جائزہ لیا جائے تو یہاں فطرت نے اپنے رنگ و بو قلموں انداز میں بکھیرے ہیں۔ یہاں حسن بکھرتا ہے، کھیتیاں پروان چڑھتی ہیں تو میلے ٹھیلے منعقد ہوتے ہیں۔ انسانی جذبات اپنے اظہار کے ہزاروں راہیں رتاشتے ہیں۔ منہ زور جوانیاں جب ڈھول کی آواز پر ناچتی ہیں تو پوری کائینات لرزہ بر اندام ہو جاتی ہے۔ یہ ماحول کُشادہ کھیتوں، بہتہ ندیوں اور گُنگناتے ہوئے چشموں کا ماحول ہے یہاں آنکھ

مچولی کھلی فضاءاور تاروں کی چھاؤں میں کھیلی جاتی ہے۔ گیت کالہر آزادی سے اُبھر تا ہے اور جب آسمان سے ٹکرا کر واپس آتا ہے اپنے سحر آنگیز باز گشت فضاء میں بکھیر دیتا ہے۔ کنواری لڑکیاں اپنے جذبات کو دو پٹے کی بکل میں سنبھالے رکھتی ہے۔ لیکن جب جذبات کا بندھ ٹوٹ جاتا ہے تو اس سیلاب کو روکنا بھی ممکن نہیں ہو تا اور عشق و مستی کا جوار بھاٹا ایک نئی داستانی محبت کو جنم دیتا ہے۔ جس کی کھوک سے بعض اوقات جرم وانتقام کے سینکڑوں سلسلہ در سلسلہ افسانے پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ دیہات کا یہی ماحول برِّصغیر کے دوسرے علاقوں کی طرح خیبر پختون خوا کے دیہات میں بھی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔اور یہاں کے بیشتر افسانہ نگار اسی ماحول کی دل پذیر انداز میں عکّاسی کرتے ہیں۔بلاشبہ فطرت اپنی تمام بے ساختہ پن کے ساتھ دیہات میں جلوہ گر ہوتی ہے۔وہاں تصنع وبناوٹ نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی ۔سادگی، ہمدردی اور خلوص جیسی خصوصیات دیہات کی زندگی کو شہر کی زندگی سے ممتاز کر دیتی ہے۔ دیہات کے لوگ زمین سے گہری وابستگی رکھتے ہیں۔اس لیے ان کے زمینی رشتے بہت گہرے اور مضبوط ہوتے ہیں۔ان کے انداز گفتگو ،ملنا جلنا، اُٹھنا بیٹھنا اور کردار میں زمین کی بھنی بھینی خوشبواور زرخیزی صاف محسوس کی جاسکتی ہے۔وہاں کے اکثر لوگ ،معصوم،ملنسار، مہمان نواز اور تصنع سے مبرّا ہوتے ہیں۔ دیہاتی زندگی کے دوسرے رُخ پر اگر نظر دوڑائی جائے تو اپنے اندر بہت سے خامیاں بھی رکھتی ہے ۔ مفلسی و بیروزگاری، صحت وصفائی اور تعلیمی سہولیات کا فقدان دیہاتیوں کے اجتماعی مزاج پر بیت برا اثر ڈالتا ہے ۔ گاؤں کے روز مرّہ زندگی میں چھوٹی چھوٹی باتوں سے جھگڑے جنم لیتے ہیں اور مزاجاُ چڑچڑاہٹ اور عدم برداشت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ بندوق پہلے چلتی ہے اور سوچا بعد میں جاتا ہے۔ گروہ بندی اور خاندانی دشمنی انسانی خون کو شاید پانی سے بھی ارزاں بنا دیتی ہے۔ گاوں کے پُر سکون زندگی میں ایک طوفان آجاتا ہے۔ کھڑی فصلوں،راہ چلتے جانوروں، فصلوں کو پانی دینے اور حجروں میں اپنے آپ کو منوانے پر اکثر جھگڑے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ دونوں فریق بہت سے ہنستے کھیلتے چہروں کو افسردہ بنا دیتے ہیں۔ دلہنوں کے سہاگ اُجاڑ دیتے ہیں اور بچّوں کے سروں سے سایہ ہٹا دیتے ہیں۔ گاوں کے ان جھگڑوں اور بکھیڑوں میں ایک اہم کردار گاوں کے سربراہ کا ہوتا ہے ایک طرف تو گاوں کے تمام وسائل یہ مارگنج کی طرح اکیلا قابض ہو تا ہے اور دوسری طرف اس کی ذات ان جھگڑوں میں بالواسطہ یابلاواسطہ شریک ہوتی ہے۔

فہمیدہ اختر، سحر یوسفزئی اور طاہر آفریدی نے پشتون معاشرت کے سماجی اور معاشرتی مسائل کو حقیقی رنگ میں پیش کرکے روایات کہن سے پیدا ہونے والی خرابیوں کی نشاندہی کی۔ پشتون افسانہ نگاروں کے جو افسانے اُردو میں ترجمہ ہوئے ان میں پشتون معاشرت کے قصباتی ماحول کی جھلکیاں بڑی واضح ہیں۔ پشتو افسانے میں ایک بڑا نام زیتون بانو کا ہے۔وہ دیہات کے پس منظر میں پشتون عورت کے مسائل اور اس پر ہونے والی زیادتیوں کو بیان کرکے اصلاح معاشرہ کا

رجحان پیدا کرنا چاہتی ہیں۔ خیبر پختون خوا کے دیہات میں دو طبقے زیادہ پائے جاتے ہیں۔ ایک طبقہ حکمرانوں اور خوانین کا ہے جن کے پاس دولت، طاقت اور ان دونوں سے پیدا ہونے والا بے جا غرور سب کچھ ہے۔ دوسرا طبقہ مظلوم اور محنت کش دھقانوں یا مزدور طبقے کا ہے جو محنت کے باوجود زندگی کے نعمتوں سے محروم ہیں اور خوانین ہمیشہ سے ان کا استحصال کرتے آئے ہیں۔ خیبر پختون خوا کے قصباتی ماحول میں پروان چڑھنے والی کہانیاں زیادہ تر انھیں دو طبقوں کی طبقاتی کشمکش کی عکاسی کرتی ہیں۔

فہمیدہ اختر، سحر یوسفزئی اور طاہر آفریدی نے دیہاتی ماحول کو پیش کیا ہے لیکن ان افسانہ نگاروں کے ہاں یکسانیت کا رجحان پیدا نہیں ہوا۔ ہر ایک نے دیہات کو اپنے زاویہ نگاہ سے دیکھا اور دیہاتی زندگی میں ایسی تصویریں پیش کی ہیں جن میں رنگارنگی اور تنوع ہے۔ فہمیدہ کی نظر اس دیہاتی ماحول پر پڑتی ہے جہاں تہذیبی ترقی کا گزر نہیں ہوا لیکن روایت پرستی اور مثالیت پسندی کا رجحان نمایاں ہے۔ غیرت، بہادری، جرات اور دلیری جیسے جوہر دیہاتیوں کا خاصہ ہیں۔ سحر یوسفزئی نے طبقاتی تفریق سے پیدا ہونے والے معاشرتی و سماجی مسائل کو پیش کیا ہے جہاں حقیقت و رومان دونوں گلے ملتے ہیں۔ طاہر آفریدی نے دیہاتی ثقافت کی نقش گری کے ذریعے اصلاح معاشرہ کا رجحان پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

خیبر پختونخوا کے اردو افسانوں میں پشتون دیہات کی زندگی کے تمام پہلو نمایاں اور حقیقی انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ دیہاتی زندگی کے شب و روز، رہن سہن، رسوم و رواج، طرزِ زندگی، مختلف اہم مواقع خوشی و غم، خوشحالی وآسودگی، بدحالی و خستگی، کشادگی و تنگ دستی، اچھائی برائی غرض ہر پہلو کی عکاسی ایسی جامعیت کے ساتھ کی گئی ہے کہ کوئی پہلو تشنہ نہیں رہنے دیا جاتا۔ اگر اردو کے ان افسانوں کے مواد کو یکجا کیا جائے جس میں پشتون کلچر کو پیش کیا گیا ہو تو ان افسانوں سے پشتون معاشرے کی ایک مکمل اور جامع تصویر بن سکتی ہے۔ جس کو پشتون مزاج، تاریخ و ثقافت کی حامل دنیا میں آمیختہ اور دنیا سے ایک علیحدہ شان رکھنے والی پشتون ولی کہلائے گی۔

پشتون دیہاتوں کی زندگی بہت سادہ ہوتی ہے۔ ان دیہاتوں میں عام طور پر تعلیمی سہولیات کا بھی فقدان ہوتا ہے اس لیے زیادہ تر لوگ تعلیم سے محروم رہتے ہیں۔ ان علاقوں میں سرکاری ملازمتوں اور بڑے کاروبار سے منسلک لوگ گنتی کے ہوتے ہیں اس لیے عام طور پر اَن پڑھ طبقہ کے لوگ یا تو ملک سے باہر محنت مزدوری کے لیے جاتے ہیں یا پھر کھیتی باڑی سے اپنی ضروریاتِ زندگی کو پورا کر کے وقت گزارتے ہیں۔ کھیتی باڑی کے ساتھ ساتھ وہ مال مویشی بھی پالتے ہیں۔ خیبر پختونخوا کے اردو افسانوں میں جہاں کہیں پشتون دیہاتوں کی عکاسی کی گئی ہے وہاں کہانی کو حقیقی رنگ دینے کے لیے پشتونوں کو اپنے کھیتوں میں کام کرتے اور مال مویشیوں کو چراتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ مرد اپنے بیلوں کی جوڑی اور دودھیل جانور کی بڑی سیوا کرتے ہیں، بیل، گائے بھینس وغیرہ کے لیے چارا کاٹتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان افسانوں

میں کہیں جانور کھرلی پر بندھے دکھائی دیتے ہیں اور کہیں گھر کے اندر دیوار کے ساتھ یا سایہ دار درختوں کے نیچے گھر کے آس پاس بندھے ہوئے ہوتے ہیں۔ اسی طرح ان لوگوں کو اپنے مال مویشی میں مصروف یا کھیتی باڑی کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ پشتون علاقے زیادہ تر پہاڑی ہیں۔ پنجاب وسندھ کی وسیع زمینوں جیسی نہیں ہیں تب بھی اپنی ان تنگ زمینوں میں یہاں کے لوگ بیلوں کی مدد سے اوراپنی ذاتی اور جسمانی محنت سے سونا اُگالنے کی اُمید میں دن رات ایک کرکے کام کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ انہیں موسم کے نکل جانے اور بے وقت بارشوں کی آمد کا خوف چین سے نہیں بیٹھنے دیتا۔ اب کے ٹریکٹر جدید بیج اور کھاد کی سہولیات نے ان کی جسمانی محنت اور تھکاوٹ میں ایک حد تک کمی کردی ہے۔ تب بھی زمین سے جتے رہنا ان کے نصیبوں میں لکھا گیا ہے۔ جو ہمارے افسانہ نگار حقیقی روپ میں پیش کرتے ہیں۔ جس سے معاشرت، تہذیب، ثقافت اور بودوباش کی عکاسی ہوتی ہے۔ ان رجحانات کے حوالے سے مختلف گروہوں، مسلکوں اور معاشروں کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ نیز یہ دیکھنا ضروری ہے کہ وطن عزیز کے دوسرے علاقوں کے آفسانہ نگاروں نے اپنی دیہی معاشرت کی جو عکاسی کی ہے ان کا تقابل اور مثبت پہلوں کو عیاں کیا جاسکے جو ادبی و قومی حیات کی تشکیل میں صحیح کردار ادا کرسکتے ہیں۔ پشتون ولی کا اہم ستون مذہب ہے لیکن معاشرت کے عکاس افسانہ نگاروں فہمیدہ اختر، سحر یوسفزئی اور طاہر آفریدی کے افسانے مذہبی اثر سے یکسر خالی ہیں۔ مذہبی اقدار کے فروغ کی شعوری کوشش مسز منوّر رؤف کے افسانوی مجمورعہ طرفہ تماشہ کے بیشتر افسانوں میں ملتی ہے۔

فہمیدہ اختر، سحر یوسفزئی اور طاہر آفریدی نے جہاں مقامی معاشرت کی عکاسی کی ہے وہاں ان کی زبان بھی مقامی اثر لیکر آگے بڑھی ہے۔ فہمیدہ نے پشتو شعروں کا استعمال بھی جابجا کیا ہے۔ فارسی اور پشتو کے شعر ڈاکٹر عبدالرحیم کے افسانوں میں بھی ملتے ہیں۔ پشتو معاشرت کی عکّاسی کرتے ہوئے پشتو الفاظ سورہ (بدلے میں دی جانے والی لڑکی)، ننواتے (معافی مانگنا)، تور (تہمت لگانا)، لختئ (ناچنے والا مرد)، جرگہ (پنچائیت) اور چم گاونڈ (ہمسائے) وغیرہ الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔ اشر آف حسین احمد نے تھائی کا نقشہ پیش کرتے ہوئے بھی لونگ (بھائی) کا تھائی لفظ استعمال کیا ہے۔ "کرم کریا" میں کالی ککڑی دی چور، ہٹی جیسے پنجابی الفاظ بھی استعمال کئے گئے ہیں۔

خیبر پختون خوا کے بعض افسانہ نگاروں کے افسانے بلاشبہ اُردو کے صف اوّل کے افسانوں میں شمار ہو سکتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالرحیم کا افسانہ "خون کا داغ"، فرید عرش کا "گیدڑ سنگھی" سیّدہ حنا کا "کوڑھ" منور روؤف کے افسانے "جنگل اور یاجوج ماجوج"، طاہر آفریدی کا "دیدن" اور سحر یوسفزئی کا "مانکیال کا سایہ" اچھے افسانے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے انہیں کوئی اچھا نقاد نہ مل سکا جو انہیں قومی سطح پر روشناس کرا سکتا۔ خیبر پختون خوا کے افسانہ نگاروں کے افسانے محدود حلقے تک ہی پڑھے گئے اور کتابی مجموعوں کو بھی اچھی مارکیٹ نہ مل سکی۔ ان کی پذیرائی کے لیے ماحول سازگار نہیں

تھا ورنہ اچھے اور معیاری افسانے ہر دور میں یہاں بھی تخلیق ہوتے رہے۔ فہمیدہ اختر سے پہلے خیبر پختون خوا میں دو افسانہ نگار نصیر الدین نصیرؔ اور رضا ہمدانی نے یہاں کے دیہاتی ماحول پر افسانے لکھے ہیں۔ چنانچہ ان کا مختصر ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔ پریم چند کے دور میں خیبر پختون خوا میں بھی افسانہ نویسی کی ابتداء ہو چکی تھی۔ نصیر الدین نصیرؔ ہزارہ کے پہلے ادیب ہے جنہوں نے مختصر افسانہ کی طرف توجہ کی۔ ان کی افسانہ نویسی کا آغاز ۱۹۱۴ء میں ہوا۔ ان کا شمار ملک کے نمائندہ افسانہ نگاروں میں ہوتا تھا۔ ان کے افسانے نیرنگ خیال، سرحد اور عالمگیر میں چھپتے رہے۔ جن میں ''جولا مکھی''، ''سہاگن'' اور ''مولوی صاحب کی شلوار'' کافی مقبول ہوئے۔ نصیر پر پریم چند کا اثر رہا۔

۱۹۴۷ء کے بعد کئی افسانہ نگار اُبھرے جن میں رضا ہمدانی کی اہمیت ان کی کہانیوں کی وجہ سے ہے، جو مقامی ماحول پر لکھی گئی ہیں۔ رضا ہمدانی کی دو کہانیاں ''غوبل'' اور ''کافر سر'' سنگ میل پشاور ۱۹۴۸ء میں طبع ہو کر کافی مقبول ہوئیں۔ رضا یوں تو کافی عرصے سے لکھ رہے تھے لیکن تقسیم ملک کے بعد انہوں نے سب سے پہلے سرحدی ماحول پر دو افسانے پیش کر کے مقامی ادیبوں کے لیے ایک نئی راہ کھول دی۔ ان کی یہ کہانیاں بہت کامیاب ہیں۔ ان میں افسانویت بھی ہے اور پٹھانوں کی معاشرت، تمدّن اور روایات کی بھرپور عکاسی بھی۔ ان کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ عوامی کہانیاں ہیں اور محنت کش طبقے سے متعلق ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے گرد و پیش فہمیدہ اختر نے بھی خیبر پختون خوا خصوصاً قبائلی ماحول پر بڑے خوب صورت افسانے لکھے ہیں۔ اس سلسلے میں فارغ بخاری یوں رقم طراز ہیں کہ:

فہمیدہ اختر کے تمام افسانے سرحدی ماحول سے متعلق ہیں۔ ان افسانوں میں انہوں نے سرحد کے قبائلی ماحول اور تہذیب و تمدّن کی بڑی بھرپور عکّاسی کی ہے۔ اس طرح طاہر آفریدی نے پسماندہ علاقوں کے غلط رواجوں اور رسموں میں جکڑے ہوئے باسیوں کی ترجمانی کی ہے۔ خود ساختہ سماجی ڈھانچے، جبر و استحصال، طبقاتی کشمکش اور انسانیت سوز نظام کے خلاف قلم اُٹھایا ہے۔ طاہر اُن ناانصافیوں کی جگہ محبت و دوستی، انسان دوستی، ظلم و ستم کا خاتمہ، سماجی اور معاشرتی انصاف اور اعلیٰ انسانی اقدار لانا چاہتے ہیں۔ سلطان جمیل نسیم خیبر پختون خوا کے دوسرے دیہات نگاروں کا موازنہ طاہر آفریدی سے ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> "بہت سے پشتو لکھنے والوں نے اردو میں کہانیاں لکھی ہیں جن میں فہمیدہ اختر اور زیتون بانو کے نام سر فہرست ہیں۔ لیکن طاہر آفریدی کی کہانیوں میں جو ماحول اپنی مکمل جزیات کے ساتھ محاکاتی انداز میں ملتا ہے میرے خیال میں دوسرے لکھنے والوں کی کہانیوں میں پختون ماحول کی اتنی فنکارانہ، بھرپور اور مکمل عکاسی نہیں ملتی ہے اور یہی بات طاہر کو ان ادیبوں سے ممتاز کرتی ہے۔"

خیبر پختون خوا کے افسانے میں فکر و فن کے امتزاج کیساتھ ساتھ افادی پہلو بھی ملتا ہے۔ ہمارے افسانہ نگاروں نے قاری کے افکار کو جلا بخش کر اس کے ہاتھ میں خیالات و جذبات کے وہ حربے دے دیے ہیں جن سے وہ اپنے اقتصادی، معاشی و معاشرتی مسائل پر نہ صرف سوچ سکتا ہے بلکہ ان مشکلات پر قابو پانے کے لیے نیا انداز فکر اپنا کر نئی حکمت عملی بھی اختیار کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ افسانہ جمالیاتی اقدار کی تسکین کے سامان بھی فراہم کر تا ہے۔

خیبر پختون خوا کے افسانے میں ادب برائے زندگی بھی ملتا ہے اور ادب برائے ادب بھی۔ یہاں کا افسانوی ادب موضوعی جامعیّت و وسعت کا حامل ہے۔ زندگی کے ہر پہلو کی تصویر کشی افسانے میں ملتی ہے۔ برِّصغیر میں اُردو افسانے کی بدلتی ہوئی کروٹوں نے خیبر پختون خوا کے ادیبوں کو پورے طور پر متاثر کیا ہے۔ یوں خیبر پختون خوا کا افسانہ برِصغیر کے دوسرے علاقوں کے افسانوں سے پیچھے نہیں۔ اصلاح پسندی اور تعمیر معاشرہ کا رجحان بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر اکثر افسانہ نگاروں کے ہاں ملتا ہے۔ ان کے افسانوں کے گھمبیر موضوعات میں دعوت فکر اور ترغیب عمل کا جو تعمیری پہلو ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ خیبر پختون خوا کے افسانہ نگاروں نے تعمیری افسانوی ادب پیش کرنے کی پوری پوری کوشش کی ہے جو قابل ستائش ہے۔ ہمارے ادیب صرف موجودہ حالات و واقعات ہی میں اُلجھے ہوئے نہیں مستقبل پر بھی نظر جمائے ہوئے ہیں۔ اب معاشرہ سماجی و روایتی بندھنوں سے بھی آزاد ہو تا جا رہا ہے۔ اب مسائل و حالات بھی بدل گئے ہیں۔ زندگی کے بدلتی ہوئی کروٹوں نے انسانی فکر کے نئے دریچے وا کئے ہیں۔ کوئی موضوع کوئی نظریہ افسانوی ادب کی محفل سے مردود بارگاہ نہیں رہا، ہمارے افسانوی ادب نے نہ صرف قارئین میں تعمیری سوچ بیدار کی ہے بلکہ ادب سے دلچسپی کا رجحان بھی پیدا کیا ہے۔ افسانے کا سفر ابھی جاری ہے۔ موجودہ صورت حال سے افسانے کے روشن مستقبل کی امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

(ب) نتائج:

موضوع خیبر پختون خوا کے اُردو افسانے میں دیہی معاشرت کی عکاسی کے حوالے سے تحقیقی کام کے بعد درج ذیل نتائج سامنے آئے ہیں۔

اَ. خیبر پختون خوا کے اُردو افسانے میں دیہات نگاری کے حوالے سے لکھے گئے افسانوں میں تین طرح کے رجحانات ظہور پائے ہیں جن میں طبقاتی تفریق سے پیدا ہونے والے معاشرتی، معاشی و سماجی مسائل کے بیان کا رجحان، دیہاتی ثقافت کی نقش گری کے ذریعے اصلاح معاشرہ کا رجحان اور عناصر فطرت ومنظر کشی کی پیش کش کا رجحان۔

ب. پشتون ولی کا اہم ستون مذہب ہے لیکن یہاں معاشرت کے عکّاس افسانہ نگاروں کے تخلیقات مذہبی اثر سے یکسر خالی ہے جبکہ بعض کے ہاں مذہب کا رجحان غالب صورت میں ملتا ہے۔

ج. خیبر پختون خوا کے دیہی معاشرت کی عکّاسی جن افسانوں میں پیش کی گئی ہے، ان میں دیہات کے معاشی وانتظامی ڈھانچے اور گاؤں کے سطح کے سیاسی و سماجی آویزشوں (حجرہ، جرگہ اور مسجد وغیرہ) کا بیان موجود ہے اور افسانہ نگاروں نے عمدگی سے اس معاشرت کے نقوش اُجاگر کئے ہیں۔

د. افسانہ نگاروں نے اگرچہ دل پذیر انداز میں دیہی معاشرت کے بے معنی نقوش، مسائل، ناآسودگیوں، طبقاتی کشمکش اور نفسیاتی عوامل کا تذکرہ تو کیا ہے لیکن کماحقہ ان کا حل تلاش کر کے نہیں دیا۔

ہ. اکثر افسانہ نگاروں نے مقامی ہونے کے ناطے خیبر پختون خوا کے خاندانی نظام، اعتقادات اور نظریات کو نزدیک سے دیکھا اور دیہاتی زندگی میں موجود توہمات، رسومات، تنازعات کو اپنے مشاہدات کے روشنی میں خوب پیش کیا ہے۔

و. خیبر پختون خوا کے افسانہ نگاروں کے ہاں اب تک متعلقہ موضوع کے حوالے سے کوئی خاص تغیّر رونما نہیں ہوا۔

(ج) سفارشات:

اس تحقیقی مقالے کو مد نظر رکھ کر یہ سفارشات پیش کی جاتی ہیں۔

اَ. اُردو زبان وادب کے قومی اور بین الاقوامی دیہات نگار افسانہ نویسوں کا خیبر پختون خوا کے دیہات نگار افسانہ نویسوں سے تقابلی جائزہ پیش کرنے سے اُردو افسانے کے سرمائے میں اضافہ ہو گا۔

ب. یہ مقالہ خیبر پختون خوا کے اُردو افسانے کی ساری روایت کا احاطہ کرتا ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ اُن مخصوص مجموعوں پر کام کیا جائے جو خاص طور پر دیہات کی زندگی کے بارے میں لکھے گئے ہیں۔

ج. موجودہ مقالے میں شامل مخصوص کرداروں پر مزید تحقیقی و تنقیدی مطالعہ کی سفارش کی جاتی ہے۔

د. زیر نظر مقالے میں حتّی الوسع خیبر پختون خوا کے دیہات نگار افسانہ نویسوں کے تخلیقات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ تاہم نئے محققین اس دائرے کو مزید وسیع کر سکتے ہیں۔

کتابیات

بنیادی ماخذ:

- احمد پراچہ، سوتی جاگتی کلیاں، نیاز آرٹ پریس، پشاور، ۱۹۸۵ء
- اختر نواز خان، ڈاکٹر، ایک ہی کہانی، القلم پبلی کیشنز، ہری پور، ۲۰۰۲ء
- اشر آف حسین احمد، آکاس بیلیں، احمد سلمان پبلی کیشنز، پشاور، ۱۹۹۱ء
- ام عمارہ، آگہی کے ویرانے، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۹ء
- انور خواجہ، بوزنے بندر، مکتبہ ارژنگ، ۱۹۸۲ء
- انور خواجہ، پیکار، الرزاق پبلی کیشنز، لاہور، اکتوبر ۲۰۰۴ء
- انور خواجہ، بریدہ بدن، حسنین پبلی کیشنز، لاہور، مارچ، ۲۰۰۶ء
- پروین عظیم، ڈاکٹر، گور کی کی ماں، ندیم شبلی پبلی کیشنز، فیصل آباد، ۱۹۹۰ء
- ثروت وہاب، خواب جب ٹوٹتے ہیں، بلال پریس، بٹ خیلہ، نومبر، ۲۰۰۸ء
- حیدر قریشی، روشنی کی بشارت، علی پرنٹرز، لاہور، ۱۹۹۲ء
- رحیم گل، زہر کا دریا، رابعہ بک ہاوس، لاہور، س ن
- رضا ہمدانی، پشتو افسانے، نیا مکتبہ، پشاور، ۱۹۶۱ء
- زاہد، یوسف عزیز، روشندان میں اندھیرا، ملاقات پبلی کیشنز، پشاور، ۲۰۱۳ء
- زیتون بانو / تاج سعید، دھڑکنیں، گولڈن پرنٹنگ پریس، پشاور، ۱۹۸۸ء
- زیتون بانو، زندہ دکھ، مقبول اکیڈمی، لاہور، جون ۱۹۹۸ء
- سحر یوسفزئی، آگ اور سائے، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، ۱۹۶۷ء
- سید زبیر شاہ، خوف کے کتبے، مثال پبلیشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۱ء
- سیّدہ حنا، پتھّر کی نسل، مکتبہ ادب نما، لاہور، ۱۹۸۳ء
- سیدہ حنا، جھوٹی کہانیاں، پاک ڈائجسٹ پبلیشرز، لاہور، ۱۹۸۵ء
- شفق ہزاروی، بہاروخزاں، سندھ اردو اکیڈمی، کراچی، ۱۹۵۷ء
- طاہر آفریدی، دیدن،، بختیار اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۲ء

- عبد الرحیم، خون کا داغ، سپین زر پریس، پشاور، س ن
- عبد الکافی ادیب، بکھرے اوراق، پشتو ادبی سوسائٹی، اسلام آباد، ۱۹۸۷ء
- عبد الکافی ادیب، بگڑے چہرے، ملت پبلشنگ کمپنی، چارسدہ، ۱۹۹۲ء
- فارغ بخاری، عورت کا گناہ، گوشہ ادب، لاہور، ۱۹۴۷ء
- فہمیدہ اختر، اپنے دیس میں، استقلال پریس، لاہور، ۱۹۶۱ء
- فہمیدہ اختر، کشمالہ، یونیورسٹی بک ایجنسی، پشاور، ۱۹۶۱ء
- فیروزہ بخاری، سچ کا زہر، ادارہ علم و فن، پشاور، ۱۹۸۰ء
- قیوم مروت، مترجم، صرف شرفاء کے لیے، گلشن ادب پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۷ء
- کاچو خیل، محمد جمیل، نوحہ بے نام، پشتو ادبی ٹولنہ، ملاکنڈ، ۲۰۱۱ء
- کلیم خارجی، گھٹیا آدمی، یوسفزئی پرنٹنگ پریس، مردان، اکتوبر ۲۰۰۰ء
- گنڈاپور، صفیہ بشیر، ڈاکٹر، زرغونہ، پ ن، ۱۹۹۹ء
- مسرت جہاں، طرفہ تماشہ، سپین زر پریس، پشاور، ۱۹۶۷ء
- مشرف مبشر، برکھا کی بدلی، دستاویز مطبوعات، لاہور، ۲۰۰۳ء
- مظہر گیلانی، رنگین مشاہدے، ملک بک ڈپو، لاہور، ۱۹۴۶ء
- مظہر گیلانی بدنصیب سارہ، اُردو اکیڈمی، لاہور، س ن
- ثاقب، معصوم شاہ، بند مٹھی، رائٹر ائکویٹی، پشاور، ۱۹۸۵ء
- منور روف، طرفہ تماشہ، عظیم پبلشنگ ہاوس، پشاور، ۱۹۸۷ء
- منور رؤف، انمول رتن، ایم جے بکس انٹرنیشنل، پشاور، ۱۹۷۴ء
- وحیدہ فرحت، گونگا کلچر، پ ن، ۱۹۹۷ء
- زاہد، یوسف عزیز، لایعنیت کی بھیڑ میں، القمر انٹرپرائزز، لاہور، ۱۹۹۶ء

ثانوی ماخذ:

- احمد پراچہ، زیتون بانو فن اور شخصیت، مکتبہ ارژنگ (اشاعت اول)، ۱۹۸۴ء
- انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، اے ایچ پبلی شرز، لاہور، ۱۹۹۴ء
- انور سدید، ڈاکٹر، اردو افسانے کی کروٹیں، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۱ء

- انور سدید، ڈاکٹر، اردو افسانے میں دیہات کی پیش کش، ابلاغ پبلشر، لاہور (اشاعت دوم) ۲۰۰۵ء
- مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر، افسانے کی روایت، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء
- حنیف خلیل، اردو کی تشکیل میں پشتونوں کا کردار، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۵ء
- خورشید عالم، اردو افسانوں میں گاؤں کی عکاسی، نشنل پبلیشنگ ہاوس، نئی دہلی، ۱۹۹۴ء
- رشید احمد، افسانے کے نئے موضوعات، اُردو مرکز، لاہور، ۱۹۹۴ء
- سعد اللہ جان برق، پشتون اور نسلیات ہندوکش، عوام دوست فاونڈیشن رحیم آباد، بھکر، ۲۰۱۲ء
- سلیم اختر، ڈاکٹر، افسانہ اور افسانہ نگار، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۹ء
- سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر، جدید اردو افسانہ کے رجحانات، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۰۰ء
- سید وقار عظیم، داکٹر، داستان سے افسانے تک، اُردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۴۰ء
- شہزاد منظر، پاکستان میں اردو افسانے کے پچاس سال، پاکستان سٹڈی سنٹر، جامعہ کراچی، ۱۹۹۷ء
- عابد، عبداللہ جان، پشتو زبان وادب کی مختصر تاریخ، یونیورسٹی پبلیشرز، پشاور، ۲۰۰۶ء
- عظمت ہما، اردو پشتو کے نمائندہ افسانے (تقابلی جائزہ)، پشتو اکیڈمی جامعہ پشاور، ۲۰۰۵ء
- علی عباس جلال پوری، روایات تمدن قدیم، تخلیقات لاہور، ۲۰۱۲ء
- علی عباس جلال پوری، رسوم اقوام، تخلیقات لاہور، ۲۰۱۰ء
- فوزیہ اسلم، ڈاکٹر، اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کی تجربات، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء
- قاضی عابد، ڈاکٹر، اردو افسانہ اور اساطیر، (طبع اول)، زکریا یونیورسٹی، ملتان، ۲۰۰۲ء
- گوپی چند نارنگ (مرتب) اردو افسانہ روایت اور مسائل، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس، دہلی، ۱۹۸۱ء

رسائل وجرائد:

- ابلاغ، پہلا شمارہ ۱۹۸۶ء تا اپریل ۱۹۹۲ء
- افکار، کراچی، مارچ، ۱۹۷۱ء
- الحمرا، جنوری ۱۹۵۳ء تا اگست ۱۹۵۳ء
- اوراق، لاہور، مئی، جون ۱۹۹۳ء
- ایلم، گورنمنٹ جہانزیب کالج، سوات، ۱۹۹۸ء
- پاکستانی ادب، (تنقید۔ جلد اوّل) مرتبین، رشید امجد، فاروق علی، فیڈرل گورنمنٹ سر سید کالج،

راولپنڈی، مئی ۱۹۸۱ء
- پاکستانی ادب،(تنقید۔ جلد پنجم)مرتبین،رشید امجد / فاروق علی،فیڈرل گورنمنٹ سرسید کالج،راولپنڈی، مئی ۱۹۸۲ء
- پاکیزہ،جولائی ۱۹۸۰ء تا ۱۹۸۹ء
- تخلیقی ادب،(جلد دوم) کراچی،۱۹۸۰ء
- خیابان،شعبہ اردو،پشاور یونیورسٹی،۱۹۹۶ء
- روپ، کراچی،۱۹۸۷ء
- فنون،لاہور،شمارہ نمبر ۲۰،جنوری،فروری،۱۹۸۴ء
- ماہ نو،لاہور دسمبر،۱۹۸۶ء
- معیار،شعبہ اردو،اسلامی یونیورسٹی،اسلام آباد،شمارہ نمبر ۲۰۱۱،۶ء
- نقوش،افسانہ نمبر، جلد دوئم،۱۹۹۵ء
- نقوش،لاہور، دسمبر ۱۹۵۷ء
- ہمدم، کوہاٹ،۱۹۵۹ء
- انتخاب،حلقہ ارباب ذوق،راولپنڈی،مرتب،عابد سیال،۰۱۔۲۰۰۲ء
- انتخاب،حلقہ ارباب ذوق،راولپنڈی،مرتب،عابد سیال،۳۔۲۰۰۲ء
- تسلسل،پشاور،جولائی،۲۰۰۶ء
- خیابان،شعبہ اردو جامعہ پشاور،بہار ۲۰۰۶ء

اخبارات:

- روزنامہ جنگ،ادبی ایڈیشن،۱۹۹۴ء
- روزنامہ جسارت، کراچی،۱۹۸۸ء
- روزنامہ آزادی،سوات،۲۰۰۲ء
- روزنامہ خبریں،لاہور،۱۹۹۸ء
- روزنامہ مشرق،لاہور،۱۹۹۸ء

غیر مطبوعہ مقالاجات:

- امیر تراب، ڈاکٹر، خیبر پختونخوا کے اردو افسانے میں مولوی اور جاگیر دار کے کرداروں کی عکاسی (تحقیقی و تنقیدی جائزہ)، مقالہ برائے پی ایچ ڈی، پشاور یونیورسٹی، ۲۰۱۷ء
- رختاج امین، ڈاکٹر، سرحد میں اردو افسانہ (قیامِ پاکستان کے بعد)، مقالہ برائے پی ایچ ڈی، پشاور یونیورسٹی، ۱۹۹۵ء
- محمد رفیق، طاہر آفریدی شخصیت اور فن، مقالہ برائے ایم اے، شعبہ اردو، پشاور یونیورسٹی، ۲۰۰۸ء